

# شعروں کی سیج

محی الدین نواب

5 کہانیوں  
کا  
مجموعہ

# شعلوں کی سیج

• محی الدین نواب



نام کتاب: شعلوں کی سیج

مصنف: محی الدین نواب

سن اشاعت: ۱۹۹۲ء

قیمت: 40 روپے

مطبوعہ: فائن آفٹ پریس، شاہد رہ، دہلی ۳۲

ناشر: کتاب والا ۲۷۹۴، پہاڑی بھوجیہ، دہلی ۶

صفحہ نمبر	عنوان	جملہ صفحات	نمبر شمار
3	شعلوں کی سیج	26	1
30	مراجعت	50	2
81	شب گزیدہ	31	3
113	خاندانی	27	4
141	کاروبارِ اجل	41	5

پنجاب کی زمین سے سوراٹھا گیا تھا۔ اس کہانی کے ساتھ آپ کے دوستوں کو بھی لکھنا ہے۔  
 مہیالہ میں لوہے کے پتھر ہیں۔ آپ کو جاننے کی ضرورت ہے کہ لوہے کے پتھر آئیں تو طویل  
 لادیتے ہیں۔ اس کہانی کا اچھا سا شروع اور ساجرا پروری ماحول آن کے قلم  
 کا اعجاز ہے اور ان کے ذہن رسا کا منہ بولتا ٹھہرتا ہے۔ یہ کہانی کیا ہے  
 اجڑی ہوئی اقدار اور منورہ میاں کی سرحد پر کھڑی ہوئی ایک ایسی حسینہ  
 و نواز کی داستان حیات ہے جسے اپنی آنکھوں میں نہیں اور شان میں وہ گرا کر پلکڑی  
 پر نہ مریاں رکھتی تھی بلکہ اپنے گھر پر آکر رکھتی تھی۔ اس کا مقصد حیات بن گیا اپنی  
 عصمت پر ہلکی سی آنچ آجائے کہ خود رو تن تنہا پوری جہان کے ساتھ مریاں  
 ہو گئی آجے تسلیاں دی گئیں، دلا سوری سے پہلا لے کی کوشش کی گئی۔ دو خانہ تہ  
 کے سر جوڑ کر اپنے لہجے کی چادر اُس کے قدموں میں ڈال دی مگر اُس کے اندر  
 دھکے والی آگ کسی سے چھوٹتی کی بجائے وہیں ٹھنڈی جہ پڑی۔ اُس کے ہا ملن  
 میں بہڑ کے والا الاؤ ایک روزا جہا تک آتش سے فشاں سے بھونے گیا۔

### شعور کی سچ



سے کہہ کر ان کی طرف سے ایک اور کہانی ہے جو کہیں نہ کہیں لکھی ہے۔

قیدی بنا کر لیا جاتا ہے اور اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔  
 جیل کے سامنے دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک اُس کے  
 بیکے سے آئی تھی وہ سڑی ہونے والی سڑال سے آئی تھی۔ آنے  
 والے اپنی گاڑیوں سے نکل کر اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھ  
 رہے تھے۔ سب سے پہلے ان کے گے سے لگا یا۔ باپ نے سر  
 ہاتھ رکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے بجلی ہوئی تھیں ان کے بچے

سینٹرل جیل کا آہلی دودانہ اس کے لئے دوسری بار نکل  
 گیا۔ چار برس پہلے وہ اس دودانے سے اندر گئی تھی۔ اب باہر  
 آ رہی تھی۔ وہ بنا کر دی گئی تھی۔ ہائی اس کے جسم کو لی تھی لیکن  
 عمر کے چار برس اس دودانے کے بچے تھے۔ گئے تھے اسے سزا  
 دینے والے میلو تھ کے بعد ہی زمین کی دے رہے تھے لیکن گزری  
 ہوئی جوانی کے چار برس نہیں دے سکتے تھے ایسا ہی ہوتا ہے



بددعوی شرافت ملی اپنی کار سے اتر کر آیا تھا۔ وہ اس کا ہونے والا دلہا تھا۔ کل بددعوی بننے والی تھی۔

بددعوی شرافت ملی نے قریب آکر پوچھا "یہ سلطانہ کیسی ہو گی۔"

"کیا ہائی سے خوش نہیں ہو گی۔"

بددعوی شرافت ملی نے اس کے چہرے پر بیٹھ سمجھدی پالی تھی۔ کسی اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اسے نہیں تھا کہ وہ اپنی ہائی پر خوش ہو گئی۔ مسکراتے کی خولہ سمجھدی ہی سے کیوں نہ مسکراتے لیکن خدا نے اسے جتنا حسن بنا تھا اتنا ہی چہرہ بھی بنا دیا تھا۔ وہ سمجھدی سے ہوئی "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"تم اعتراض کیوں کر رہی ہو گی۔"

"مشرقی رسم و رواج کے مطابق کہہ رہی ہوں۔ شریک حیات بنانے کے بعد تمہیں میرا چہرہ دیکھنا چاہئے۔"

وہ چپتے ہوئے بولا "پھر تو تمہارا اعتراض درست ہے۔ بھئی مجھ جیسا سیاست دان اور ایم این اے تمہارے سامنے لا جواب ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں کہل برات لے کر آئیں گا۔"

وہ ہنستا ہوا اپنی کار کی طرف گیا۔ ایک مسلح باڑی گاڑنے روانہ کھولا۔ اس نے بیٹھے سے پہلے سلطانہ کو قاتحانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا پھر گھٹی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اندازہ بند ہو گیا۔ باڑی گاڑنے کے بیٹھ گیا پھر وہ کامیاب سے چلی گئی۔

اس نے کہا "یہ شرافت مجھے ذہر لگتا ہے۔ میری کچھ میں نہیں آ رہی تھی تو اس کے ساتھ کہے زندگی گزارے گی۔"

"جیل تھا، میں بدترین جرائم پیشہ عورتوں کے ساتھ چار برس گزار لئے۔ ہائی زندگی گزارا اس بددعوی کے ساتھ گزار جائے گی۔"

باپ نے لگے کہا "بچہ! بددعوی شیطان سی مگر تمہارے ساتھ نکلی کی ہے۔ تمہیں سزا دے موت اور عرقید سے بچایا ہے۔"

"ابا! وہ کیا۔ ست دان ہے۔ وہ تو حاصل کرنے سے پہلے عوام سے سیاسی نیکیاں نہرتا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی سیاسی نیکی کی ہے۔"

اس نے کہا "کیا باپ تمہیں کہنے کے لئے گھر نہیں ہے۔ ہم تو ہمیں اپنے مسائل میں الجھنے لگے ہیں۔ تو چلو۔"

سلطانہ نے پوچھا "میرا کیکہ تھی کیوں نہیں آیا؟"

باپ نے کہا "میں نے تمہارا پیغام اسے پہنچا دیا تھا۔ وہ تو تمہارا وقار اور بیادھی فرض شناس ہے۔ پتا نہیں کہاں نہ گیا ہے۔ تو تمہارے ساتھ چلو۔"

اسی وقت ایک کار آکر کچھ قافلے پر رکی۔ ایک نوجوان کار سے باہر آیا اور تیزی سے چلتا ہوا قریب آکر بولا "معافی چاہتا ہوں۔ ڈیڑی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اس لئے بیگم صاحبہ کو لینے میں آیا ہوں۔"

وہ بلبل رہا تھا اور سلطانہ کو بے اختیار دیکھا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے لوہا بن کر ٹھنڈا نہیں ہو گیا۔ اس نے کہا "کل شادی ہے۔ آج انجن اور منڈی کی ریمیں ایک ساتھ ادا ہوں گی۔ تمہیں تمہارے ساتھ چلنا چاہئے۔"

"میں شام سے پہلے تو چلی ہی جاؤں گی۔"

وہ شانہ انداز میں چلتی ہوئی کار کے پاس آئی پھر پھلا دو انہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ نوجوان رعب حسن اور قیامت کی چال دیکھ رہا تھا۔ پھر جگہ کر دوڑا ہوا اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا کار اشارت کرتے ہوئے بولا "میرا نام بلال مرزا ہے۔ میرے ڈیڑی۔"

وہ بات گات کر بولی "جاتی ہوں۔ حال مرزا کے بیٹے ہو۔"

"ڈیڑی نے کہا ہے پہلے آپ پرانی حویلی۔"

"جاتی ہوں تم پرانی حویلی کی چابیاں ملانے ہو گی۔"

"میں نے وہ چابیاں ڈنٹل پورن۔"

"جاتی ہوں اتنی ہماری چابیاں تم جیب میں نہیں رکھو گے۔ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ پہلے مجھے اپنے باپ کے پاس لے چلو۔"

وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا اور کن اکھیوں سے عقب نما آتے تھے اسے دیکھا جا رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کل بددعوی شرافت کی دلہن بن جائے گی۔ وہ پرانی ہے۔ وہیں والہ کے سمت بڑے جا کیو دار اور موجود ایم این اے کی ہونے والی ملکیت ہے۔ ان کے سامنے وہ ایک حیرتوں تھا۔ مگر حسن ایسا تھا کہ ذہن کی بھی آنکھیں ہوتیں تو وہ سلطانہ بیگم کو دیکھتی نہ جانتیں۔

کوئی حینہ سوچنے کے لئے آنکھیں بند کر کے تو سامنے والا خوش قسمی میں جتا ہو جاتا ہے کہ شاید وہ اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے سیٹ کی پشت سے ٹھک لگائے بیٹھی تھی۔ بلال ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں کو درست کرنے لگا۔

دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رہا تھا۔ اچانک ہی اسٹیرنگ ہٹ گیا۔ اس نے سنبھالنے کے لئے گاڑی کو جھکے سے بریک لگایا۔

سلطانہ اگلی سیٹ کی پشت سے کھراتے کھراتے نکل گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ حاضر دماغ رہتی ہے اور بڑے بڑے حادثوں سے بچتی آئی ہے۔

بلال نے بڑا مت سے دیکھا۔ وہ کڑکی کے پار دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ اس نے دوبارہ کار اشارت کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "معافی چاہتا ہوں۔ دراصل۔"

وہ عار تا بات گات کر بولی "جاتی ہوں۔ آئیے گا رخ بدل دو۔ عار نہیں ہو گا۔"

وہ یہی طرح جھینپ گیا۔ چہرہ کی کڑکی تھی۔ اس نے جلدی سے عقب نما آئیے گا رخ بدل دیا۔ بچا وہ ابھی ابھی جوان ہوا تھا۔

تجربات کی بھٹی میں کھنکھنے والی ماکن اس کے حواس پر چھاری چھری۔

کار ایک مکان کے سامنے رکھی۔ سلطان نے بلال کو  
دوانہ کھولنے کا موقع نہیں دیا۔ خودی دوانہ کھول کر باہر آئی پھر  
عیزی سے چلتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ سامنے ہی ایک کمرے  
میں اس کا سیکڑی ایک بستر لیٹا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہی  
انہیں لگا۔ وہ بولی "لیٹے رہو۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"اٹھ کا کرم ہے۔ آپ کی مہمانی ہے۔ طبیعت سنبھل گئی  
ہے۔"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے بولی "میرا ایک آپ بکس ہے؟"  
"وہ تیار ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ شام تک طبیعت سنبھل  
جائے گی تو ایک آپ بکس لے کر آؤں گا۔ یہ بکس اتنا اہم ہے کہ  
میں اپنے بیٹے کے ہاتھ نہیں بھیج سکتا تھا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ بکس میں میری ضرورت کا سامان ہے؟"  
سیکڑی نے کھتے کے نیچے سے ایک چھوٹی چابی نکال کر دیتے  
ہوئے کہا "وہ سامنے میں ہے بکس ہے۔"

وہ اٹھ کر چالی سے بکس کھولنے لگی۔ بلال کمرے میں آکر بولا۔  
"کیا میں باہر انتظار کروں؟"

سلطان بکس کے اندر کی چیزیں دیکھ کر اور سو گھم رہی تھی۔ پھر بند  
کرتے ہوئے بولی "یہ ایک آپ بکس پھیلی سیٹ پر رکھ دو۔"

سیکڑی اپنے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مالکن کو ایسی گلن سے  
دیکھ رہا تھا کہ باپ کا دل ڈرنے لگا۔ بیٹے کی محنت کا یہ عالم تھا کہ  
اس نے سلطان کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ بکس اٹھا کر نہیں لے گیا  
تھا۔ سلطان اسے لاک کر کے سیکڑی سے بولی "مرزا! تمہیں  
آرام کرنا چاہئے۔ میری شادی میں شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔  
ابھی طرح علاج کراؤ۔"

وہ باہر جانے لگی۔ دوا اڑے پر بلال کے پاس سے گزری تو وہ  
چونک گیا۔ باپ نے کہا "یہ بکس لے جاؤ۔"

وہ میز کے پاس آیا۔ بکس اٹھا کر جانے لگا۔ باپ نے کہا "کسی  
کو اتنی شدت سے نہ دیکھو کہ دیدے باہر اٹل پڑیں۔ تم ستاروں کو  
دیکھ سکتے ہو۔ انہیں تو ذکر نہیں لاسکتے۔"

وہ جانے جانے دوا اڑے پر رک گیا۔ پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا  
تھا۔ باپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آسمان بوزھا ہے ستاروں کی روشنی  
بھی صدیوں کی بوزھی ہے۔ روشنی کے حُسن کو نہ دیکھو۔ اس کی عمر  
کا حساب کرو۔ وہ تم سے بڑی ہے محترم ہے۔ اب جاؤ۔"

وہ سر جھکائے باہر آیا۔ دل میں سوچنے لگا "ڈیڈی درست کہتے  
ہیں۔ آخر میں ملازم کا بیٹا ہوں۔ ابھی جا کر پھیلی سیٹ کا دوا اڑہ  
تھکوں گا تو بیگم صاحبہ اندر تشریف لے جائیں گی۔"

وہ سوچتا ہوا کار کے پاس آیا۔ پھر ٹھنک گیا۔ پہلے حیرانی ہوئی  
پھر خوشی سے دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ سلطان اگلی سیٹ پر بیٹھی  
ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ پھیلی سیٹ کا دوا اڑہ کھول کر  
سیٹ۔ اب بکس دہاں رکھا اور اسٹیرنگ سیٹ پر سلطان کے برابر بیٹھ

گیا۔ اس نے گاڑی کی اسٹارٹ کی پھر گیول کر رانچ کرنے لگا۔

دہاں سے وہیں والے پانچ لنگے کا سٹوٹا بوسٹا والے سے پانچ  
میل پہلے ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ سلطان کے نام تھی۔ سلطان  
وہیں اپنی حویلی میں جا رہی تھی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کئی  
ہول کھڑکی سے ہوائے جوگے آ رہے تھے۔ اس کی زلزلوں کو اڑا  
رہے تھے اور دہانے کو وہ نہ کر سکا۔ سچے سچے وہ بار بار اسے  
درست کر رہی تھی بار بار بلال کی نظریں پھل رہی تھیں۔

اچانک سلطان نے ہاتھ اٹھا کر چکی بھائی پھر وہ اسکرین کے  
بار دیکھتے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اسکرین کے پار سامنے  
دیکھنے لگا۔ پھر کھنگار کر گلا صاف کرنے ہوئے بولا "مہ۔ میں  
پریشان ہوں۔"

وہ چپ ہو گیا۔ سلطان نے پریشانی کی وجہ نہیں پوچھی۔ پھر وہ  
خود ہی بولا "میں آپ کی طرف دیکھتا نہیں چاہتا مگر یہ اختیار دیکھتے  
لگتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر۔"

"جانتی ہوں۔ وہ تو نہیں ہے۔ ایک بار مارنے سے بچ گئی۔  
آجہ اپنے بچاؤ کے لئے یہاں آکر بیٹھی ہوں۔ سامنے دیکھتے  
رہو۔"

"میں سچ کہتا ہوں۔ میری نظریں پاکیزہ ہیں۔"  
"دوسرے کے دانت کب لوٹے تھے؟"

"تو! دوسرے میں سچ کہتا ہوں کس۔"  
"جس موٹی نظریں بکتی ہیں اس کی زبان بھی بکتی ہے اور  
بکتے والی زبان کسی سچ نہیں بولتی۔"

اسے چپ سی لگ گئی۔ پھر کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ حوصلہ  
ہوا بھی تو الفاظ نہیں ملے۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ چار گھنٹے  
کی طویل خاموشی کے بعد پرانی حویلی پہنچ گئے۔ جاگیر میں داخل  
ہوتے ہی بہتی کے مو، مور میں بچے اور بڑے کار کے پیچھے آنے  
لگے۔ وہ گارڈ سے باہر آئی تو سب آگے بڑھ کر سلام کرنے لگے۔  
ایک شخص نے کہا "بیگم صاحبہ! میں خبر ہوئی تو آپ کے آنے سے  
پہلے ہم حویلی کی صفائی کر دیتے۔"

وہ بولی "صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سیکڑی مرزا  
سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں اس حویلی کا دوا اڑہ نہیں  
کھلے گا۔ تم لوگ جاؤ۔ میں یہاں بیٹھ رہتی ہوں۔"

بلال نے ڈیش بورڈ سے حویلی کی بھاری بھاری چابیاں نکالیں۔  
سلطان نے کہا "یہ مجھے دو تم چابی کے اندر نہیں جاؤ گے۔ گاڑی  
لے جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد واپس آ جاؤ۔"

اس نے چابیاں لیں پھیلی سیٹ پر رکھے ہوئے ایک آپ بکس  
کو اٹھایا پھر حویلی کے برآمدے میں آکر بلال کو گھور کر دیکھا۔ وہ فوراً  
ی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ بہتی والے  
بھی جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے درجے کے دروازے کے سامنے آگئی۔  
مضبوط کھڑکی کے دروازے پر صحن کے ڈیرائن کے ہوئے

کما " ہانا ہا ہانا ہا ہا۔ دلن و شوت لے ہا ہا گو گھٹ  
الٹا لے نہیں دے گی۔"

اس نے میرے کی ایک انگوٹھی نکل کر اس کی انگلی میں  
پتلا۔ تھیلی کی پگنی پشت کو سلا یا ہمارے چوم لیا۔ وہ حیا سے  
سینے لگی۔ "دور دور کے پڑ کے جا کیوار تمہارے دیوانے  
تھے۔ سب نے اپنی دولت اور طرح طرح کے ذرائع استعمال کرتے  
مگر تم میرے نصیب میں تھیں۔ میری سچو آنگی۔"

اس نے گو گھٹ الٹا لیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ رونانا بھول گیا۔  
کھن چہ ہرے کے نوتوں ایسے تھے اور جلاب نظر تھے کہ دلچسپ  
جھپکا یا داندہ ہا ہا تو پورا کٹی تھیں تھی لیکن دلن کے روپ میں  
اور فضا ہا ہا ہی تھی۔

سلطان کو پتا نہیں تھا کہ اسے دیکھنے والا پتھر کا ہو گیا ہے۔  
آکھیں بند کئے اس کی نگاہوں کی آغوش محسوس کر دی تھی۔ ایسی ہی  
وقت دیوانہ کھلنے کی تواز تھی۔ جبکہ دلنا کے تہلنے کے بعد ہر  
دیوانہ نہیں کھتا لیکن وہاں تیسرے کی بد اہلت ہو چکی تھی۔

کسی نے پوچھا سمجھوئے شرافت از او ہر کیا کہا ہے؟  
سلطان ایک اور سو کی تواز سن کر جھک گئی۔ اس نے فوراً  
ی آکھیں کھل کر دیکھا۔ دلن کے کمرے میں ایک ہی دلنا آتا  
ہے مگر وہاں وہ تھی۔ اللہ کی۔ دونوں کو باری باری سوالیہ نظروں  
سے دیکھنے لگی۔

بعد میں آنے والے دلنا نے قریب آکر کہا "سناگ کما  
سلطان! یہ میرا چھوٹا بھائی جو میری شرافت علی ہے تمہارا دیور سے  
شر ہے۔ اس نے ضرور کوئی شرافت کی ہوگی؟"

سلطان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شرافت ایسی تو نہیں  
ہوتی؟ وہ سچ پر بیٹھے بیٹھے پچھے ہٹ گئی۔

وہ کورے کاغذ کی طرح تھی۔ اس کا حاتی ہاتھ بھی کورا تھا۔  
مندی کی اس خوشبو کو چومنے کا حق صرف شوہر کو تھا جب کہ  
دوسرے نے اس کے اچھوتے پن پر ناجائز رویے کی سرنگاری تھی۔  
وہ ایسی فضا ست پسند تھی کہ اپنے ہی ناخن کا میل دیکھنا گوارا  
نہیں کرتی تھی۔ ناک پر کسی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کجا یہ کہ کوری  
تھیلی کی پشت پر کھٹا کر بیٹھ گیا تھا۔

شرافت علی کا تھانہ انداز میں مسکراتا ہوا چلا گیا۔

وہ سخت جان تھی۔ وہاں نہیں جاتی تھی۔ اس بے ہودگی پر پھر  
گئی۔ جس تھیلی کی پشت پر اس نے ہونٹ رکھے تھے اسے دوسرے  
ہاتھ کے ناخنوں سے کھرچتے گئی۔ سچ سے اٹھ کر دوسری طرف چلی  
گئی اور چیخ مچی۔ "پلے جاؤ۔ یہاں سے پلے جاؤ۔ میرے ابا  
کو بلاؤ۔"

وجاہت علی بو کھلا گیا تھا۔ کسی دلن کو اور بھی دیوانے کو  
دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان کی نچیں کھرے کے باہر دور تک  
جاری ہوں گی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "پلیز سلطان! اچھوتی

ہرے لگے ہوئے تھے۔ کبھی اس کی ہانک میں اپنے ہاتھ کا کس  
دکھائی دیا تھا۔ اب برسن کی گردنے اس کی آنگلی تھلی تھی۔  
وہاں تھیں دنوں نالے تک رہے تھے۔ سلطان نے پتھروں کے کھٹے  
سے ایک چالی لے کر نالے میں ڈالیا۔ اسے کھانا چاہا۔ زور اندر  
نکلا۔ توڑی دیر چند ہی کی۔ وہ ناکہ دہرا تھلی دکھا کر کل  
گیلے۔ چار برس کے بعد ایک سے ہی اہم اور پرانے رشتے کا زلم  
چھلانے آئی تھی۔ وہ رنگ بھو نالے کیا چھ تھے باقی نالے ہی  
ذرا الٹی دکھا کر کل گئے۔

اس نے دیوانے کے دیوانہ پھیلے اور برائی اور نالے  
میں دیوانے کی کراہتی تراز دور تک گونجتی گئی اس نے دلچسپ ہار  
کی۔ پے تے قدم رکھتی ہوئی جیسے ہاں ناکرے کو دیکھنے لگی۔  
ہاں باری تھی وہاں علی میں قدموں کے نشان باری تھی اور ان  
نشانوں کے پچھے تھیں ہاں بھانک رہے تھے۔

حالی وہی تھی۔ وہاں کی ہر جہ وہی تھی اور ہر جہ جی ہاں  
تھی "اگلی ہی ہاں ہاں تانہ کسی تھی۔ وہ ہاں ایسی تھی جو  
صرف آکھیں کوری نہیں بل کہ بھی تھارتی تھی۔"

اس نے دل سے نکلے والی ایک توم کے ساتھ زینے پر قدم رکھا  
اور پھر زینہ بہ زینہ اور جانے لگی۔ اس کی سماعت میں گلی چلنے کی  
تواز تھارتی تھی۔ گلی سچ سچ کر اسے بلا رہا تھا "سلطان!  
سلطان۔"

یہ غار برس پرانی توازی تھیں۔ پھر بھی وہ تیزی سے  
بڑھیاں چڑھ کر دوڑ لگی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں سے وہ سچ کر  
بلا رہا تھا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ خواب گدھ دلن کی طرح تھی  
ہوئی تھی۔ دلن جیل سے آئی تھی۔ مگر دلنا نہیں تھا۔

وہ کھگے ہوئے انداز میں خواب گدھ کی دلہن پر بیٹھ گئی۔ پھر بیٹھے  
ی بیٹھے ماضی میں پہنچ گئی۔



وہ ساگ کی سچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گو گھٹ میں پھپ کر  
اپنے ہاڑی خدا کا انتظار کر رہی تھی۔ جو کھٹے بیٹھے لحات پیش آنے  
والے تھے وہ پیش آنے سے پہلے گدھ گدھ ہے تھے۔ ایک انبا ہا سا  
خوف بھی تھا جو کھٹے میں نہیں آتا تھا۔ پھر پھر نہیں خود کو جلا  
عوی میں نہیں آپریشن میٹریس میں کھتی ہیں۔

کمرے کا دیوانہ کھلتے ہی سلطانہ کارل زور زور سے دھڑکتے  
لگا۔ جیسے جیسے کسی کے قریب آنے کا احساس ہوتا تھا دھڑکنیں  
پاگل ہوئی جاری تھیں۔ ہر عورت کی زندگی میں ایک مرد ایسا ہوتا  
ہے جو دستک دیے بغیر تنہائی میں چلا آتا ہے۔ وہ بھی اس کے قریب  
آکر بیٹھ گیا۔ اس کے حثاتی ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ہلا۔  
"واہ! دلن کے ہاتھ اتنے خوب صورت ہیں۔ پتا نہیں کھڑے کی  
شادابی کیا ہوگی؟"

وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے اور مضبوطی سے پکڑ لیا پھر





کلی سقل لیلہ نہیں ہوگا۔

وہ صرف سے دلہن کو رکھنے لگا۔ اسے حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔ اسے ہونے کا بھی سوچ نہیں سکتا۔ بیچ سٹی کر جانے کی تو عیا نہیں ہو سکے گا۔ دلہن کا بستر سطوں کی بیچ بن جائے گا۔ تو یہ آتے ہوئے ہوا۔ "نہیں سلطان! جانے کی بات نہ کہ۔ مجھے پھوڑ کر جاؤ گی تو میرا سکون بہا ہو جائے گا۔"

اس نے محبت سے کھانے کے لئے اسے پھرنا چاہا اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ "فرما پیچھے ہٹے گی۔ پھر ہی کیا آپ میرا ہاتھ پکڑنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں پکڑنا چاہتا ہوں۔ پھر بھی پھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"آپ پرانے ہوش کی کلاہٹ ماکری یہ ہاتھ پکڑ سکتے ہیں۔"

اس نے گوری جھلی کی پشت کو دکھا دیا اور پھیلا ہوا تھا۔ سرخ لہو گواہ تھا کہ دلہن کے تن بدن میں سرخ انگارے دکھ رہے ہیں۔ یہ بات بے حیاؤں کے لئے پھول تھی اور حیاؤں کے لئے بڑی تھی کہ کوئی نامحرم پرانی دلہن کو انگوٹھی پہنا کر لور سے کی کلاہٹ دے کر ایک کھواری کی پار سائی کو جو تیار کر گیا تھا۔

دروازے پر دستک سائی دی۔ وجاہت علی نے غصے سے گرج کر کہا "کون ہے؟ جاؤ یہاں سے۔"

باہر سے ملازم نے کہا "وڑے چودھری جی ہاں بیگم کا فون ہے۔ ان کے ابا جی بات کریں گے۔"

وجاہت نے دروازہ کھول کر ملازم سے واکی ٹاکی ملی پھر دروازہ بند کر کے وہ واکی ٹاکی سلطانہ کو دی۔ سلطانہ نے اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا "یہ تو میں سلطانہ بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے باپ کی تواز سائی دی "دھی رانی! کیا بات ہے؟ تمہاری ساس کنہ رہی ہیں 'شرافت علی نے دیور کے رشتے سے مذاق کیا تو تم نے پوری حویلی سر اٹھالی ہے۔"

"ابا جی! اس نے مذاق نہیں کیا" آپ کی عزت پر کچھ اچھالی ہے۔ آپ نے کلام پاک کے سائے میں ایک بے داغ بیٹی کو رخصت کیا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نامحرم شرافت علی نے میرے ایک ہاتھ کو داغ دار کر دیا ہے۔ آپ اگر دیکھیں۔ آپ کی غیرت مند بیٹی نے اپنے اس ہاتھ کو لہو نمان کر دیا ہے۔"

"بس کر سلطانہ! آگے بکھو نہ کہنا۔ جتنا لہو میرے ہاتھ سے پکا ہے اس سے زیادہ شرافت علی کے سینے سے بے گام۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

"نہیں ابا جی! میں خون خرابا نہیں چاہتی۔ بیو! بیو ابا جی۔"

اس نے واکی ٹاکی کو دکھا وہ خاموش ہو چکا تھا۔ بندوق سے کوئی نکل چکی تھی۔ اس کے سیکے کے وقادار نشانے باز سنسنائی ہوئی گولیوں کی طرح آنے والے تھے۔ وجاہت نے اس سے واکی ٹاکی

لیتے ہوئے پوچھا "کیا ہوگا؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے نور نور سے دروازہ کھینچے ہوئے کہا "لوئے رجا ہوتا! دروازہ کھولنا ہم دلہن نہیں سمجھتے اٹھا کر لائے ہیں۔"

وجاہت نے دروازہ کھولا۔ اس اندر آئی۔ اس کے پیچھے رشتے داروں کی بھیڑ تھی۔ سب ملازم بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کہا "میں نے دوسرے فون پر باپ بیٹی کی بات سنی ہے۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا میرے شرافت کے سینے میں گولی اتارے گا۔ اپنی بیٹی کے ہاتھ کی طرح میرے سینے کے سینے سے لہو بہائے گا۔"

"ای! آپ پریشان نہ ہوں۔ سلطانہ کے والد میرے بیروگ ہیں۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔"

"تم کیا سمجھاؤ گے۔ اور شرافت ہمارے وقاداروں کو سب کدیا ہے۔ سسرال والوں کو پھوڑا۔ اپنے بھائی کو پھاؤ۔ اسے سمجھا کر یہاں سے دور بھیج دو۔"

وجاہت تیزی سے چلا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اس بھی بیویاٹی ہوئی پیچھے پیچھے گئی۔ "یہ دلہن میرے بیٹوں کے لئے کفن لے کر آئی ہے۔ اللہ کرے یہ کڑے کڑے مر جائے۔ اس کے شیکے والے یہاں آنے سے پہلے دنیا سے اٹھ جائیں۔"

ان میں بیٹے کے پیچھے رشتے داروں کی بھیڑ چل رہی تھی۔ ایک کمرے میں شرافت اپنے وقاداروں کو راتھیں اور تاروں کے ٹکٹ دے رہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ ان میں سے کون کہاں بھسپ کر مورچا بنائے گا۔ وجاہت علی نے کمرے میں آکر گرجتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس کی گرج سن کر تمام وقادار چپ چاپ بیٹھے کڑے ہو گئے 'شرافت نے کہا "بھائی جان! آپ کا سر مجھے گولی مارنے آ رہا ہے۔"

وجاہت نے کہا "گولی تو میں تجھے مار سکتا ہوں۔ مگر ای کے آنسو مجھے روکتے ہیں۔"

پھر اس نے وقاداروں سے کہا "راتھیں پھینک دو اور یہاں سے جاؤ۔ میری حویلی سے ایک گولی بھی نہیں چلے گی۔"

تمام وقادار چلے گئے۔ اس نے پوچھا "اور وہ جو گولیاں چلائے یہاں آ رہے ہیں۔"

"وہ گولیاں میں اپنے سینے پر کھاؤں گا۔ آپ کا لانا ڈلا بیٹا محفوظ رہے گا۔ کیا آپ سمجھتی ہیں 'میرا سرفوج لے کر آئے گا اور ہماری حویلی میں گھس پڑے گا۔"

شرافت نے کہا "وہ حویلی میں نہ گھسے۔ لیکن میں بیٹوں کی طرح اندر نہیں رہوں گا۔ سینہ تان کر چودھری ملک نواز سے کھوں گا کہ اس کی بیٹی سلطانہ کا حق دار میں ہوں۔ اس لئے اپنا حق وصول کیا ہے۔"

وجاہت نے گرج کر پوچھا "کیا جکتے ہو؟"



یہاں میرے ساتھ سے بزرگ ہیں۔ میرے سگے کامل کاٹل کھتے ہیں۔ لیکن کوئی مسئلہ قائم نہیں کیا ہے۔ سب بھری کہہ رہے ہیں۔"

ایک بزرگ نے کہا "بڑا ایک تو ہمیں مسئلہ ہی کچھ میں نہیں آیا۔ دوسرے بچے کہ تم ہمارے پاس آکر اصل قصہ بیان کرتے تو ہم ایک پنہایت قائم کر کے مسئلے کا ضرور کوئی حل پیش کر دیتے۔"

ماں نے آکر کہا "دنیا کے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں کوئی قیامت تو نہیں آئی ہے۔ یہاں جتنے بزرگ ہیں وہ میرے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دلہن کے سگے والے آئیں ہمیں دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دینا چاہیے۔"

ایک بزرگ نے کہا "سوا گھنٹی قبل اسے دونوں بھائی آپس میں لڑیں گے تو دلہن کے سگے والے ہماری چڑ جائیں گے۔"

دوسرے نے کہا "خون پھر خون ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابھی دونوں بھائی گلے ملیں گے۔ آؤ چلو۔"

وہ تمام بزرگ ایک کمرے کی طرف جانے لگے۔ وجاہت بیڑھیاں چڑھا ہوا اوپری حبل کے ایک کمرے میں آیا۔ پھر دو ازانے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گیا۔ رات کے دو بجے تھے کسی رشتے دار کی آنکھوں میں نیچو نہیں تھی۔ حویلی میں سب جاگ رہے تھے۔ سب کو اس ڈرامے کے ڈراپ سینیٹ کا بے چینی سے انتظار تھا۔

دراصل سلطانہ نے پیدا ہو کر یہ بے چینی پھیلائی تھی۔ کسی بھی جاگیدار یا ولید کے علاقے میں کوئی حسین لڑکی جوان ہوتی ہے اور اس کے حسن و شباب کا چرچا غیر معمولی طور پر دور تک پھیلتا ہے۔ بڑی بڑی محفلوں میں اس کے تذکرے سے شراب و آتشین جاتی ہے تو وہ حینہ تمام جاگیرواؤں، ولیدوں اور سیاست دانوں کے لئے ایک ضد بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں جتنی بیویاں اور داشتائیں ہوتی ہیں وہ پھینکی پڑ جاتی ہیں۔ ایک غیر معمولی حینہ کی جوانی کا حصول ایک چیلنج بن جاتا ہے۔

کتنے ہی بڑے لوگوں نے سلطانہ کے لئے رشتہ بھیا۔ اپنی تصویروں کے ساتھ اپنی دولت جائیداد، کوٹھیلوں اور کاموں کا بھی حساب پیش کیا۔ مگر کے طور پر سیکوں ایکڑ زمین گنتے کو تیار رہے۔ اور چودھری وجاہت علی اور چودھری شرافت علی بھی اسے اپناٹا چاہتے تھے۔ وجاہت نے کہا "میں بڑا بھائی ہوں، پہلے میری شادی ہوگی۔"

شرافت نے کہا "تم بڑے ہو تو میں بھی نابالغ نہیں ہوں۔ تم ہر معاملے میں بڑے بن کر میرا حق مارتے ہو۔ میں سلطانہ کے معاملے میں چھوٹا بن کر نہیں رہوں گا۔ وہ میری ضد ہے۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔"

ماں نے بھائیوں میں جھگڑا بڑھتے دیکھا تو فیصلہ کیا کہ دونوں بھائیوں کا رشتہ بھیجا جائے گا۔ رشتہ مانگنے والے اپنی تصویریں بھی

چھانگی تھی۔ تمام مورخے دار حویلی کے اندر سدا آئے تھے۔ چڑ کے لوگ اپنے اپنے کمروں میں دپک گئے تھے۔ ہر طوائف مجرا کرنے لگی تھی وہ واپس جانے کی ضد کہتی تھی۔ کمرے کے شوخن اسے گھما رہے تھے کہ ڈاڈا چودھری بھووار توی ہے۔ خون فرما نہیں ہوئے۔ گگ حویلی کی رونق ابھی لوٹ آئی تھی۔

وجاہت نے چڑ سے سلطانہ کو دلہن بنا کر لایا تھا۔ یعنی اس کا سرسرا ہوا کھٹے کے باطلے پر تھا۔ صلح سرسرا ہواؤں کے نکلنے میں ابھی نکلی رہی تھی۔ اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ گیت پر موجود رہیں۔ دو چار ملازمین کے باہر جانے والے راستے پر ہیں۔ جیسی سر کاٹھ نظر لگے اسے فوراً اطلاع دی جائے۔

وہ احکامات صادر کر کے حویلی میں آیا۔ مو' حور نہیں ہے۔ بوز سے سب اسے دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے گزرتا تھا وہاں سے الموس بھرے بھری کے الفاظ سنائی دیتے تھے۔ الموس اس بات کا کار کیا جا رہا تھا کہ دلہن نے شب عوی گزارنے سے انکار کیا تھا۔ ایسے میں سلطانہ کالم اور چودھری وجاہت علی مظلوم نظر آیا تھا۔ لہذا مظلوم کے لئے بھری کے الفاظ استعمال ہو رہے تھے۔

اسے بھری پر غصہ آیا تھا۔ البتہ خود کو مظلوم سمجھ رہا تھا۔ سلطانہ اس سے انصاف نہیں کہتی تھی۔ قصور کسی کا تھا۔ سزا اسے دینے ہی تھی۔ وجاہت نے پہلے تو زبانی اس کے حسن کے چسپے سنے تھے۔ تصویر دیکھنے کے بعد ایسا پورا نہ ہوا تھا کہ دن رات تصور میں اسے حاصل کرنا رہتا تھا۔ کسی کو تصور میں حاصل کرنے کے لئے نکاح چھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اسے مقرر کا کھیل کتنے ہیں۔ آج وہ نکاح چھوانے کے باوجود حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے دو ازانے پر دھک دی۔ وہ نہیں کھلا۔ اس نے تواز دی "میں ہوں وجاہت لہذا وہ کھول۔"

اندر سے تواز آئی "میں کیسے کھولوں کہ آپ دونوں میں سے کون وجاہت اور کون شرافت ہے؟"

"میں ہوں۔ میں تمہارا بھائی خدا ہوں۔"

وہ بولی "آپ میری بھوری اور محتاط روئے کو سمجھیں۔ اب میں ثبوت کے بغیر آپ کو بھاری خدا تسلیم نہیں کر سکتی۔"

"سلطانہ! یہاں میرے خاندان کے بہت سے بزرگ ہیں۔ یہ میری حمایت میں گواہی دیں گے۔"

"آپ برائے نام ہیں۔ آپ کے خاندان میں آتے ہی میں نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے اس لئے یہاں میرے لئے کوئی مستبر نہیں ہے۔ جب میرے ابائی آئیں گے اور اپنے داماد کو شناخت کریں گے تب میں دو ازانہ کھولوں گی۔"

اتنی دیر میں وجاہت کے آس پاس رشتے داروں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس نے گرج کر پوچھا "آپ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ کیا میں کوئی تماشا ہوں؟ اگر ہوں تو شرافت نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے۔ آپ لوگوں کا فرض ہے اسے جا کر سمجھائیں۔"

وے کر کہہ دیا تھا "جناب عالی! چودھری ملک نواز آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ پولیس وائے بھی ہیں۔"  
وہ نورا ہی دودانہ کھل کر باہر گیا۔ بیڑیاں اترتا ہوا بیٹے پہنچا۔ ذرا راجہ راجے میں گاڑی لے کر تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹے ہوئے ایک ملازم سے پوچھا "کیا چودھری سرحد میں داخل ہو گئے ہیں؟"

ملازم نے کہا "میں صحت پلے پلے کل کے پاس تھے۔"  
گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ لانا دودانہ استعمال کے لئے نہ جا سکا۔ سر کا قاف سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے تڑپ بھج کر گاڑی روکوائی۔ پھر پیل چلا ہوا چودھری ملک نواز کی طرف جانے لگا۔ سر نے داماد کو پیل اور رہتا آتے دیکھ کر گالے کورنے کا حکم دیا۔ پھر دودھی سے سوال کیا "مجھے سلام کرنے سے پہلے یہ بتاؤ۔ یہی شی کس حال میں ہے؟"

وہ آگے بڑھتا ہوا بولا "چودھری چاہا! تمہی بیٹی کو میری ذوات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اگر کوئی تکلیف پہنچی تو میں مجرم ہوتا۔ اور مجرم نہتا بھی نہیں آتا۔"

ملک نواز نے کہا "اوتے دوجاہتا! میرے سوال کا سیاسی جواب نہ دے۔ لکھتا ہے 'میری بیٹی کو میری ذوات سے تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کا مطلب ہے دوسرے کی ذات سے پہنچی ہے اور تو تکلیف پہنچانے والے کو جواب کی ہیرا پھیری میں چھپا رہا ہے۔"

"میری سیاست باہمی سلامتی کے لئے ہے چودھری چاہا! میں عمر میں اور نجات میں تم سے چھوٹا ہوں مگر ایک عمل کی بات کہتا ہوں۔ بہنوں اور بیٹیوں کا ذکر چار دیواری سے باہر نہیں ہونا چاہئے۔ میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں، جو بھی معاملہ ہے اسے جوبلی کے اندر لٹھالیا جائے گا۔"

الپکڑنے آگے بڑھ کر دوجاہت سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔  
"آپ کے سر نے کشن صاحب کو فون پر بلا لیا تھا۔ کشن صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں یہ معاملہ لٹھالوں۔"

پھر الپکڑنے چودھری ملک نواز سے کہا "چودھری صاحب! آپ بزرگ ہیں۔ اوپر تک آپ کی پہنچ ہے۔ آپ کو اطمینان ہونا چاہئے کہ آپ کی صاحب زادی سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ چودھری دوجاہت علی صاحب نے بہت خوب کہا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں کی باتیں چار دیواری میں مناسب ہوتی ہیں۔"

ملک نواز نے کہا "ٹھیک ہے، جوبلی چلو۔"  
دوجاہت نے کہا "چودھری چاہا! اب میں سلام کر سکتا ہوں۔"

اس نے السلام علیکم کہا۔ ملک نواز نے فیصے سے ستر پھیر لیا۔ قاف آگے بڑھنے لگا۔ دوجاہت اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ الپکڑنے جوبلی کے سامنے پہنچ کر ملک نواز سے کہا "آپ کے مسلح آدمی جوبلی کے باہر رہیں گے۔ میں مسلح سپاہیوں کو لے کر آپ کے ساتھ اندر

پہنچے تھے۔ کار پر ہے ان تصویروں کے ذریعے سلطانہ کی ہینڈ معلوم کی جاتی ہوگی۔ خبر کئی کہ چودھری ملک نواز نے چودھری دوجاہت علی کو داماد بنا رکھنا منظور کیا ہے۔ والدین نے اپنی شہسوری دی گئی ہے۔ نہیں بتایا تھا کہ بیٹی نے اسے ہینڈ کیا ہے۔"

یہ بہت ہی خوش قسمتی تھی کہ جس کی خوشبو نکلوں میں تک گھلی ہوئی تھی اور وہ بیٹی ممتاز شخصوں کے لئے انا کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ میں عین نے دوجاہت کے حق میں مدد کرنا تھا۔ اس خوش قسمتی پر شرافت بھر گیا "میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔ اسی نے بڑے بیٹے کا ساتھ دیا ہے۔ میری تصویر سلطانہ کے پاس نہیں بھیجی تھی۔ میں دودھور تک کہو ہوا ان حلیم کیا جاتا ہوں۔ میرے ساتھ رہو گا ہوا ہے۔"

اس نے قسمیں کھا کر زمین ٹھالا "تو ختم دلوں میری وہ آنکھیں ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی ایک آنکھ نہیں پھوڑ سکتی۔ میں اپنی کسی اولاد سے ناانصافی نہیں کرتی۔ میں نے میری تصویر بھی بھیجی تھی۔"

لیکن اس نے پہنچ کر دیا "یہ شادی نہیں ہوگی۔ اور ہوگی تو بھاری ہوگی۔ ہاں ایک شرط پر گھونٹا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگلا الیکشن میں لڑوں گا۔"

دوجاہت نے کہا "ہماری سیاسی پارٹی مجھے الیکشن کے لئے گت دے رہی ہے۔ تم پارٹی کے فیصلوں کے خلاف کیسے امیدوار بنو گے؟"

"بہت آسان ہے۔ مخالف پارٹی مجھے گت دے رہی ہے۔ اس جتنے سے میں تمہارے خلاف گڑا ہو گیا تو یہاں سے تمہارے بچاؤں لیمہ دوت لے جاؤں گا۔ نہ تمہارا ہٹلا ہو گا نہ میرا میرے امیدوار کو تمہارے جھگڑے سے قائم پہنچے گا۔"

دوجاہت نے کہا "اتنی دانائی سے سیاست کو سمجھتے ہو پھر مجھے کیوں پہنچ کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ تمہاری گندی سیاست کچھ میں آگئی ہے۔ ہماری سیاسی پارٹی میں نہیں سر بٹھایا جاتا ہے۔ تم چاہتے تو میں صوبائی اسمبلی کا امیدوار بن سکتا تھا۔ مگر تم لوگوں نے اپنے ایک جتنے کہ امیدوار بٹھالا۔ خود قومی اسمبلی کے لئے کھڑے ہو گئے۔ یہاں وہ لٹھال پر مجھے پیچھے دھکیل کر اب سلطانہ کے عاز سے بھی ٹھال رہے ہو۔"

"تم سیاست میں سلطانہ سے کیوں ٹوٹ کر رہے ہو؟"  
"مجھے امتن نہ سمجھو۔ تم الیکشن سے پہلے سلطانہ سے شادی کر کے تاکہ اس کی جائیداد کے ہزاروں دوت تمہاری جھولی میں آجائیں۔ میں خوب گھنٹا ہوں۔ یہ سیاسی شادی ہے۔"

وہ کوئی جواب سے بغیر غصہ میں لٹھلتا ہوا چلا گیا۔ اس کا پہنچ بدستور تھا کہ یہ شادی نہیں بھاری ہوگی۔  
دوجاہت خیالات سے چونک گیا۔ ملازم دودانے پر دستک

ہاں گ۔

حربی کا بیٹا ہل رشتے داموں سے خالی کرایا گیا۔ ملک نواز نے امر آتے ہی پوچھا "میری بیٹی کہاں ہے؟"

وجاہت انہیں ساتھ لے کر اس کمرے تک آیا جہاں سلطان نے خود کو قید کر رکھا تھا۔ وجاہت کی ماں نے چند برنگوں کے ساتھ آکر کہا "السلام علیکم بھائی صاحب!"

وہ بولا "میں نے ابھی تک داموں کے سلام کا جواب نہیں دیا ہے۔ السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو اور میں جو اب اس وقت تک کسی پر سلامتی نہیں چاہوں گا جب تک اپنی بیٹی کو صحیح سلامت نہ دیکھ لوں۔"

سلطان نے باپ کی آواز سنتے ہی دو واہ کھول دیا۔ پھر تیزی سے آکر بیٹے سے لگ گئی۔ باپ نے کہا "میں تجھے بچپن سے دیکھتا رہا ہوں۔ تو ہزار زخم کھائی ہے مگر آنکھ سے آنسو نہیں نکالتی۔ پھر باپ کی پھر بیٹی ہے۔ چل ذرا الگ ہو جا۔ مجھے دیکھنے دے۔ تیرا ہاتھ زخمی کیسے ہوا؟"

وہ زخمی ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی "ابا جی! میں نے خود اسے زخمی کیا ہے۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ میری انا زخمی ہوئی تھی۔"

"کل کرتاؤ بات کیا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں" شرافت علی نے رشتے داموں کے درمیان سے آگے آتے ہوئے کہا "آپ کی جاگیر میں تین ہزار آٹھ سو دوڑ ہیں۔ آپ اپنے اس پاس کے علاقوں سے مزید ہزاروں دوٹ دلا سکتے ہیں۔ یہ حساب لگانے کے بعد میرے بھائی نے آپ کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ مجھے سلطان سے شادی کرنے دو۔ چودھری ملک نواز کے پاس میری تصویر بھیج دو کہیں کہ میں سیاسی مکاری نہیں جانتا۔ میں ایک شریفانہ ازدواجی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں سے کہتا ہوں کہ آپ کا داماد بننے کا جو جائز حق دار تھا اس کی تصویر آپ تک نہیں پہنچائی گئی۔"

چودھری ملک نواز نے کہا "تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ تم چودھری شرافت علی ہو۔ کوئی دس برس پہلے تمہیں دیکھا تھا۔ پھر آج دیکھ رہا ہوں۔ ویسے تمہاری کوئی تصویر میرے پاس نہیں آئی تھی۔"

شرافت نے طرزِ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ماں نے وجاہت سے کہا "بیٹے! تم گواہ ہو۔ میں نے لٹاف نے میں تمہاری تصویر کے ساتھ شرافت کی بھی تصویر رکھی تھی۔"

شرافت نے کہا "تمہی ہاں اور وہ لٹاف بھائی جان کا خاص ملازم لے گیا تھا۔"

ملک نواز نے کہا "میں اپنی بیٹی کے معاملے میں یہاں آیا ہوں اور تم لوگ تصویر کے معاملے میں الجھا رہے ہو۔"

شرافت نے کہا "میں سمجھا رہا ہوں۔ آپ گلے کی کوشش کریں۔ جب مجھ جیسے گلے بیٹے اور گلے بھائی کے ساتھ ایک تصویر کے سلسلے میں دھوکا ہو سکتا ہے تو آپ کی بیٹی تصویر نہیں ہے زندہ حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ مجھ سے بھی برا سلوک ہو گا۔"

سلطان نے پوچھا "اور تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

وہ بولا "میں تمہارے پاس محبت سے سمجھانے آیا تھا کہ تم یہاں محبت سے نہیں سیاست سے لائی گئی ہو۔ تمہیں مجھ سے بچین لیا گیا ہے۔"

"اس لئے تم مجھے میرے شوہر سے بچین لینا چاہتے ہو؟"

شرافت نے کہا "اگر میرا بھائی تمہارا شوہر ہوتا تو میں اتنا ہی غیرت نہیں ہوں جتنا سمجھا جا رہا ہوں۔ میں نے ایک عالم صاحب کو بلایا ہے۔ وہ تمہیں سمجھائیں گے کہ صرف نکاح پر جانے سے کوئی کسی کا مجازی خدا نہیں بن جاتا۔"

سلطان نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مزید بولا۔

"اور نہ وہ شوہر ہوتا ہے جو دلہن کے کمرے میں پہلے آتا ہے۔ ابھی تمہارا کسی سے کوئی گمراہی اور ہنہالی رشتہ نہیں ہے۔ تم سوچو اور فیصلہ کرو۔ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ میرا یہ بھائی صرف اور صرف سیاستداں ہے۔ اسمبلی تک پہنچنے کے لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگا۔ وجاہت نے کہا "شرافت! تم مجھ سے بھی بڑے سیاستداں نکلے۔ سلطان کو نئے مسئلے میں الجھاؤ۔ کیوں سلطان! تم نے اس کے خلاف چیخ چیخ کر ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ اپنے ابا جی کو بیکے سے بلایا۔ لیکن اس نے تمہیں کوئی الزام لگانے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

وہ بولی "میں یہاں گونگتھٹ میں منہ چھپا کر آئی۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کو بھی گونگتھٹ اٹھنے کے بعد نہیں دیکھا۔ صرف چودھری وجاہت علی زندہ باد کے نعروں سے اب شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں محبت کرنے والوں کے خاندان میں نہیں سیاست کرنے والوں کی دلدل میں دھنس گئی ہوں۔"

"سلطان! میرے خلاف نہ سوچو۔ یہ غلط ہے کہ میں نے تمہارے ابا جی کے ذریعے ہزاروں دوٹ حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنایا ہے۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تمہیں شریکِ حیات بنانے کے لئے میں نے بھائی سے دھوکا کیا۔ جو لٹاف تمہارے گھر جا رہا تھا اس میں سے شرافت کی تصویر عائب کرادی تھی۔ یہ فریب ضرور ہے مگر میری محبت کا ثبوت بھی ہے۔"

بھیز میں سے شرافت کی آواز آئی "ابو بھائی جان اور وڑے چودھری! میں کہیں نہیں گیا اور میری موجود ہوں۔ ابھی تیری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ تو نے دوٹ حاصل کرنے کے لئے شادی نہیں کی ہے تو دلہن تیری سیاست میری۔ مجھے الیکشن لڑنے سے سلطان کے سامنے ثابت کر دے کہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔ سیاست

میں کرنا ہے۔  
 بات بڑی جاری تھی۔ رفتے داروں کی زبان لاکر رکھ رہے تھے تاکہ وہ آرام سے بیٹھ کر بات بڑھاتے رہیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے الجھنے والے جوش اور فیسے میں تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ وجہات نے بڑے جوش اور جذبے سے سلطانہ کو دیکھا۔ پھر کہا "میں اپنی شریک حیات کے لئے سیاست کو لایا دنیا کو بھی پھوڑ سکتا ہوں۔ میں اعلان کرنا ہوں کہ اپنی پارٹی کے کسی بھی لیڈر کے حق میں بیٹھ جاؤں گا۔"

اس لئے ابھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔  
 ایسا بھی نہیں ہوتا کہ دل میں ابھی کئی ہو اور ابھی بیکے چلی جائے۔ لیکن ایسی بات ہو گئی تھی کہ کوئی اسے جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وجہات ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ قلمی شہر کی حیثیت سے اسے روک نہیں سکتا تھا کیوں کہ ایسے وقت بزرگ روکتے ہیں۔ شہر روک کے تو بے حیالی ہوتی ہے۔

وہ بار بار حسرت سے سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ کتنا چاہتا تھا مگر پریشانی تھی کہ کیا کے اور کیسے کے؟ اس کی حرکتوں سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ وہ نہ کراٹھ رہا تھا۔ پھر نیچے جا رہا تھا جیسے اسکول کا بچہ استاد سے کچھ کتنا چاہتا ہو۔ پھر کسی امکانی نظمی کے خیال سے اٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر لیا۔ ایک فلائین نے یہ حرکتیں دیکھ کر پوچھا "کچھ کتنا چاہتے ہو؟"

وہ چونک گیا پھر بولا "نہ۔ نہیں میں تو۔ ہاں وہ بات یہ ہے کہ ذہنی سکون کے لئے بیکے جانا ضروری نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ ضروری کو بھی خالی ہے۔ وہ کو بھی میں نے نکاح کے وقت حق میں لکھ دی تھی۔ سلطانہ وہاں رہ سکتی ہے۔"

مگر نواز نے کہا "خالی کو بھی قبرستان کی طرح ہوتی ہے۔ میری بیٹی بیکے میں رہے گی۔"

مگر نواز کے ساتھ آئے ہوئے ملازم سلطانہ کا ضروری سامان اٹھا کر باہر جانے لگے۔ وجہات بے بسی سے سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی مجبوری سی مجبوری تھی کہ شہر کی حیثیت سے اپنی بات نہیں منوا سکتا تھا۔

سلطانہ نے سامنے آکر کہا "آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ سیاست سے زیادہ میں آپ کے لئے اہم ہوں۔ ابھی میرے علاج پر بوجھ ہے۔ میری جو توہین ہوئی اسے برداشت کر رہی ہوں اس کا اثر زائل کرنے کے لئے جاری ہوں ورنہ آپ کو تھما نہ چھوڑتی۔ میری ایک بات مان لیں۔ سیاست نہ چھوڑیں۔ آپ کی کامیابی میری کامیابی ہوگی۔"

وہ اپنے باپ کا باندھ تمام کراس کے سامنے سے گزر گئی۔ وجہات اسے رخصت کرنے باہر گاڑی تک آیا۔ جب وہ چلی گئی تو وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حویلی کے اندر کیوں جاتا؟ دل میں کے بستر پر پھولوں کی پتیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اب وہ انٹاروں کی طرح اسے کھٹ کھٹا دماغ خالی تھیں۔

چودھری ملک نواز نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا "شہبازش پتوڑنے اپنی سہیلی ثابت کر دی۔"

سلطانہ نے کہا "معاذ کچھ اور تھا اور اسے کچھ اور رنگ دے دیا گیا تھا۔ اب جب کہ سیاست کی باتیں ختم ہو چکی ہیں میں اس خاندان کے بزرگوں سے پوچھتی ہوں۔ چودھری شرافت علی میرے کمرے میں کیوں آیا تھا؟"

میں نے کہا "دل میں جو بات ختم ہو گئی ہے اسے پھر کیوں شروع کرنی ہو؟"

وہ سانس سے بولی "میں عزت دار گھرانے سے آئی ہوں۔ میری عزت پر آنچ آئی ہے اس لئے بات ختم نہیں ہوگی۔"

"میرا بیٹا تمہارے کمرے میں چلا گیا تو کون سی قیامت آئی۔ آخر وہ رشتے میں دیوار ہے۔"

سلطانہ نے اپنی سانس کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر اپنی اتنی پتیلی وجہات کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "کیا میں بتاؤں؟ یا آپ زبان کھولیں گے۔"

وہ بولا "امی! شرافت نے ایسی بے ہودگی کی ہے جسے میں آپ کی خاطر برداشت کر رہا ہوں۔ آپ شرافت کی بے جا حمایت نہ کریں۔ میں اپنے بزرگوں سے التجا کرتا ہوں کہ بات بڑھنے سے پہلے کوئی معتدل سمجھو تا کرادیں۔"

بزرگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے سلطانہ سے کہا "دل میں بنی باتم اس حویلی اور اس خاندان کی عزت میں کر آئی ہو یہاں کی عزت کو برقرار رکھنا تمہارا فرض ہے۔ جو کچھ ہوا اس پر فیسے نہ سوچو۔ ایسی راہ اختیار کرو کہ آنکھ پھر ایمان نہ ہو۔"

دوسرے بزرگ نے اس کے سر ہاتھ رکھ کر کہا "ہر شریف زاری کو اپنی عزت کے لئے ایسے ہی لڑنا چاہئے جسے تم نے لڑائی کی ہے۔ تم جیت گئی ہو۔ گا کے شرافت کو شرم آئے نہ آئے مگر ہم شرمندہ ہیں۔"

باپ نے کہا "بھئی! میں بہت غصے میں تھا تھا۔ لیکن یہ تمام بزرگ تمہارے سامنے شرمندہ ہیں۔ چلو! غصہ تھوڑا۔ میں نے تمہیں بزرگوں کے سامنے جھکتا دکھایا ہے۔"

وہ سر ہٹ کر گھٹکٹ درست کرتے ہوئے ہوا "ابا! آپ نے جس شرافت، شرم و حیا اور پاکیزگی کی تعلیم دی تھی وہ یہی طرح

لوہے میں لگان پورا کھتا ہے، دل کو دھڑکتا ہے، لوگوں کو گراتا ہے۔ وہ سلطان کا گھر گھٹ اٹھا کر سمجھتا رہ گیا تھا۔ آگہوں میں اب تک وہی جلی لٹھری ہوئی تھی۔ حنائی جھیلی تک پہنچ کر وہ پیاس پانی نہ لگی تھی، مگر کونوں کی سڑک تک پہنچ کر پوچھی تو لٹھری کے بعد نہ جاتی ہے۔

کونوں لہا لہا ہوا ہے، پیاس خطرناک ہو جاتی ہے۔ شرافت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بڑے بھائی کو سیاست سے ہٹا کر اس کی جگہ لیتا ہے گا اور سلطان کو صوبے کا لٹھری اس کے حسن و شباب کے آگے ایک صوبہ میں جانے گا۔ گھر گھٹ اٹھانے کے بعد پتا چلا کہ اس نے ناگن کا پتہ کھلوا دیا ہے۔ نکلنے میں کی حدی تک اس کی زہریلی جوانی کا چرچا تھا۔ سب اسے بس میں کرنے کا حیرت زدہ رہے تھے۔ شرافت کی نگاہ میں آبا تھا کہ حیرت زدہ سے کہہ نہیں ہو گا۔ ناگن کے لئے ناگ بنا چاہئے گا۔

دہاوت نام دن ایجنٹ کے معاملات میں مصروف رہتا تھا۔ سیاسی مصروفیات کے لئے پوری نیند سہا لازی ہوتا ہے تاکہ وہ سب دن ذہنی تازگی کے ساتھ مصروفیات جاری نہ کیں۔ لیکن رات کو بستر سلطان کی یاد آجاتی تھی۔ اس نے دو راتیں جاگ کر گزاریں۔ دن کو کام کے وقت بھی اوجھل رہتا، کبھی قاتب داغ ہو جاتا۔ اس نے تیسری رات مجبور ہو کر نیند کی گولیاں کھائیں۔ چوتھے دن اس نے فون پر رابطہ کیا۔ پہلے تو کسی ملازم نے ریسپورڈ اٹھایا۔ دہاوت کا نام سن کر تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر سر کی تواز سنائی دی۔ "بولو، چودھری دہاوت، علی، تم ہو؟"

"جی چودھری چاہا! السلام علیکم؟"

"جی! اس روز میں نے تمہارے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ آج وہیکم السلام کہتا ہوں۔ تم پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی ہو۔"

"وہ لپکھاتے ہوئے بولا "میں۔ میں اپنی شریک حیات سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"منور کو گھر میں یاد رکھو، جب تک تمہاری جوبلی میں شیطان ہے میری بیٹی سے وہاں جانے کی بات نہ کرنا۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر سلطان کی تواز سنائی دی۔ "بولو میں بول رہی ہوں۔"

"کیسی ہو؟"

"جی میں ہوں۔ آپ سنا میں؟"

"میرا ہوں۔ تم اپنے ذہنی سکون کے لئے بیٹھے کہیں اور میرا سکون لے لیں۔ کل رات میں نے نیند کی گولیاں کھائیں۔ سنا ہے اس کی عادت چڑھانے تو پھر وہ چار گولیاں سے بھی نیند نہیں آتی۔ سیاسی معاملات میں مدلل حاضر نہیں رہتا ہے۔ تم کبھی سنی ہو؟" سیاسی لیڈر کیس سے بھی ڈرا کھوڑ چڑھانے تو صرف اسے اسمبلی میں

کھینچے سے پہلے بچاؤ دیتے ہیں۔"

"میں تو کچھ ہی تھی، آپ سب کچھ بھول کر کلبھیالی کی ہندو میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔"

"میں سب کچھ بھول سکتا ہوں۔ ہمیں بھول کر دنیا کو نہیں جیت سکتا۔ میں ہار جاؤں گا سلطان! میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ یہاں صرف میرا جسم ہے۔ ذہانت اور سوچنے لگانے کی صلاحیتیں تو تم نے لے لی ہیں۔"

"وہ چپ رہی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے کہا "میں نے کئی بار سوچا۔ تم سے ملنے کو آؤں۔ پھر سوچا تم میرے گھر سے واپس آ گئی ہو۔ مجھے بھی تمہارے دو دانے سے واپس کر دیا جائے گا۔"

"آپ نے درست نہیں سوچا۔ آپ میرے ساتھ آج رات کا کھانا کھائیں گے؟"

"وہ ایک دم سے خوش ہو کر بولا "جی"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے بولو بولو کھلا۔ سلطان کو تواز سن دیں۔ پھر کچھ میں کیا "دعوت دینے والی نے شہا کو ریسپورڈ رکھ دیا ہے۔"

"وہ خواب گھر میں اٹھ گئی تھی۔ ایک صوفے پر بیٹھی سامنے بیٹھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس بستر پر وہ بچپن سے سوئی آئی تھی۔ صرف ستے ڈیزائن کے بیٹھ پڑتے رہے تھے۔ وہ بچکے کا بستر ہی تھا، جہاں اسے وقت پر نیند آجاتی تھی۔ لیکن سسرال سے پہلی ہی رات واپس آنے کے بعد سے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ سماگ کی بیچ سے واپس آنے والی جوانی کو بچپن کے بستر پر نیند نہیں آتی تھی۔"

"وہ خواب گھر کا دو دانہ اندر سے بڑکے فرش پر سو گئی تھی۔ اب تو بستر کو دیکھتے ہی فسطے سے لپکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دہاوت نے فون پر تھوڑی گنگو میں اپنے جذبات کو بڑی حد تک پیش کر دیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہہ پائی تھی۔ رات کو کھانے پر بلا کر شہا لگی تھی۔ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ دعوت دے کر انجانے میں میں کئی بے حیائی تو نہیں ہو گئی؟"

"وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی چوٹک چڑی۔ ایسا ناگہاوت ایک دم سے سامنے آ گیا۔ جب کہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ خیالات سے چوٹکے ہی وہ گھنٹی خاموش ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں ایک ملازم نے ریسپورڈ اٹھایا تھا۔ پھر اس نے اعتراف کے ذریعے اطلاع دی "جی بی بی، آپ کا فون ہے۔"

سلطان نے دھڑکتے ہوئے دل سے ریسپورڈ اٹھایا "اسے کلن سے لگا لیا پھر کہا "بولو میں بول رہی ہوں۔"

"میری تواز سن کر ریسپورڈ نہ رکھنا۔"

سلطان کو تواز چھری طرح کی۔ شرافت کہہ رہا تھا "میری بانیں سنو گی تو تمہارا کوئی قصبان نہیں ہو گا۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی نللا بات ہو تو تم گھر گھٹ میں بھی سر اٹھا کر بولتی ہو اور لٹھری کے خلاف جنگ جاری رکھتی ہو۔ اور اگر کج بات ہو تو اسے

حکیم کرتی ہیں۔

وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ ہلکا سا تھکا ہوا جسمانی کیفیت میں غباری بات یہ ہے کہ تمہیں سب سے زیادہ اپنی پارسل کی مزہ ہے۔ پارسل نہ رہنے تو تم اپنے ہی ہاتھ کی کھال توجہ دالتی ہو۔ اور پارسل پر حرف آئے تو ساگ کی بیج پر تھوک کر پیل جاتی ہو۔ تم اپنے اس مزاج اور پاکیزگی کو نہیں نظر رکھتے ہوئے میری باتیں توجہ سے سنو اور سمجھو۔

وہ ایک ذرا توقف سے بولا "ایک شرط زلوی کی زندگی میں اور اس کی بیج پر صرف ایک ہی مو آتا ہے۔ اس کے بعد وہ سرا کبھی نہیں آتا۔ تم کو کی "دوسرے سے تمہارا علاج ہو ا ہے۔ میں کہوں گا یہ معاملہ علاج کا نہیں ہے تمہارے یہ علاج وجود کا ہے۔ تمہاری آئینہ آئینہ آہو اور پارسل کی کا ہے۔ تمہیں سمجھکی سے فیصلہ کرنا چاہئے کہ جو علاج چھلایا گیا وہ اہم ہے یا تمہاری پارسل؟"

وہ ذرا حیرت ہوا بھرا بھرا "پارسل اہم ہے۔ اس لئے تم حجاج کوئی ہوئی ہو گی۔ علاج اہم ہو تا تو تم شوہر کھانے والے شخص کو لیل کے ساگ کی بیج پھینک دیتے۔"

وہ بڑی دیر ہوئی "تم مجھے الجھا رہے ہو۔"

"مجھے کوئی قسم بد ساش نہ سمجھو۔ میں تمہاری پارسل کی مدد میں یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ یاد رکھو کہ کھانا کھا کر علاج شروع ہو جاتا ہے۔ تم علاج نہ پھاڑ سکتی ہو لیکن پارسل کے دامن کو تار نہیں کر سکتیں۔ علاج دیکھو وہ سکتا ہے۔ پارسل دیکھو نہیں ل سکتی۔"

وہ جو کہہ کہہ رہا تھا سلاط اسے بکواس اور سہ ہنسا دیا ہاتھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اسے کوئی مشعل جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ بولا "تم میرے نام سے بد نام ہو کر گئی ہو۔ آج میرے ہی نام سے نیک نام ہو سکتی ہو۔ وہاں تک نام اپنا کی تو دنیا والے باتیں بتائیں گے کہ وہی بارہ دھری شرارت نے داغ لگا کر کے بیج ڈالا۔ وہ ساری بارہ دھری وہاں تک داغ پھیلانے کے لئے پھر لے آیا ہے۔ تم نے پہلی رات بیچے وہاں جا کر سوت پڑی تھی۔ اس لفظی کو میں ہی چھپا سکتا ہوں۔ سوچو خوب سوچو۔ میں پھر فون کروں گا۔"

رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ بھی اندر سے کچھ ٹوٹ گئی۔ کوئی بات اس کی آنا کہ اس کے عورت پن کو لگی تھی۔ وہ بھی اور قانونی طور پر وہاں سے منسوب ہونے کے بعد اسی کی محبت اور حمایت میں سوچتی اور فیصلہ کرتی آ رہی تھی۔ ابھی شرارت نے اس کے فیصلے کو ذرا کمزور کر دیا تھا۔ وہ خود غرض اور چالبازی سے لیکن دل کو کھلنے والی اور مدافعی طور پر قائل کرنے والی کچھ باتیں کہہ گیا تھا۔

وہ ان باتوں میں ڈوب گئی۔ ہر پہلو سے غور کرنے لگی۔ ایک بات درست تھی، غصہ برداشت کر کے پہلی رات اپنے شوہر کے

# پراسرار علوم پر بہترین کتابیں

- ۲۵٪ قیمت
- ۲۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۲۰٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۰٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۲۰٪ • • • • •
- ۲۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۵٪ • • • • •
- ۱۰٪ • • • • •
- ۱۰٪ • • • • •
- ۱۰٪ • • • • •
- ۱۰٪ • • • • •

پہنا کر تم کیا ہے؟  
 پہنا کر تم کے عملی طریقے  
 پہنا کر تم سے علاج  
 تھیل یعنی گائید  
 آئینہ بینی و عملی حالات  
 دنیا کے چھ چھ اسرار علوم  
 نام اور اس کے اثرات  
 ویرج کرافٹ (کالا جادو)  
 عملیات تسخیر قلوب  
 تعبیر نامہ و قائل نامہ  
 فن جودو  
 آسان کرانے  
 عملیات تسخیر محبوب  
 عملیات تسخیر قلوب  
 آئینہ عملیات (اندھیاں)  
 اہم اعظم  
 عملیات محبت  
 عملیات تسخیر جنات  
 حل مشکلات

**کتابوں والا**  
 ۲۰۹۳، پورانی بھوج پور، دہلی ۶-۱۱

ایک ماہ تک کی کتابیں

۲۰۹۳، پورانی بھوج پور، دہلی ۶-۱۱

کتابوں والا



اس کی آنکھوں کو سرخ کر دیا ہے۔ سرخ آنکھیں تو رت مجھے اور جذبات کی پتیلیں کھاتی ہیں۔ ایک پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں دوسری گلے پڑ گئی تھی۔

اس نے بستر پر لیٹ کر دونوں آنکھوں میں گلاب کا عرق پٹکایا اور ایک منٹ تک گیلی رہی۔ پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں کابل لگانے لگی۔ وہ میک اپ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صرف آنکھیں چھپانا چاہتی تھی۔ تاکہ آنے والا کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وہ کمرے سے نکل کر کورڈور میں آئی پھر اپنی خوبصورتی کے دو دروازے پر پہنچ کر دیکھا۔ وجاہت صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کی تعظیم کے لئے نہیں اٹھتا۔ یہ تعظیم اٹھاتا رہا تھا کہ ابھی وہ بیوی نہیں ہے۔ ایک ایسی نئی عورت ہے جسے حاصل کرنا باقی رہ گیا ہے۔ حاصل ہونے کے بعد وہ بیوی ہوگی اور تعظیم رخصت ہو جائے گی۔

شرافت نے غلط فہمی کما تھا کہ ابھی وہ وجاہت کی بیوی نہیں ہے اور وجاہت بے اختیار اپنے عمل سے ثابت کر رہا تھا کہ صرف نکاح پر جانے سے عورت بیوی نہیں بن جاتی۔ بیوی بنانے کے لئے اسے تعظیم کے مقام سے نیچے گرا کر پڑنا ہے۔

سلطانہ نے کمرے میں آکر اسے سلام کیا پھر کہا "سحانی چاہتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

"میں تمام عمر ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔"

وہ سامنے آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وجاہت نے کہا "کابل لگانے سے آنکھیں خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ لیکن تمہاری خوبصورتی آنکھوں نے کابل کا حسن بوجھا دیا ہے۔ یہ کابل یہاں نہ ہوتا تو کہیں نہ ہوتا۔"

وہ سر پر آٹھل درست کرتے ہوئے بولی "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوئی ہے لیکن میں خوش ہونا چاہتی ہوں تو میرے حالات مجھ پر بستے ہیں۔"

"حالات؟ کیسے حالات؟"

"سوچتی ہوں مسرال سے واپس آنا کہاں تک مناسب تھا؟"

"ہاں حالات نے مجبور کیا تمہیں غصہ آگیا۔ بات ایسی ہو گئی کہ میں تمہیں روکنے کے حق سے محروم ہو گیا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔"

"میرے اور آپ کے بھولنے سے کیا ہوتا ہے دنیا تو نہیں بھولے گی۔"

"دنیا والے بہت کچھ بولتے ہیں پھر بولتے بولتے ایک دن تک کہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو صرف میرے لئے رکھا ہے۔ کوئی دوسرا ہاتھ لگائے تو چیخ پڑتی ہو۔"

ساتھ گزار لی تھی تو اس کی پارسائی مٹھو ک نہ ہوئی۔ شرافت کے خلاف ہنگامہ بھاگ کر کے اور پہلی رات شوہر کو چھوڑنے کے وہ ثابت کر چکی تھی کہ شرافت کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ بلکہ بہت کچھ ہو گیا ہے۔

وہ خود اپنی بدنامی کے لئے راستہ ہموار کر کے آئی تھی۔ عورتوں کے ساتھ یہ ایک الیہ ہے کہ عزت و آہود پر حرف آئے تو اسے چھپانا پڑتا ہے۔ اپنے ہونٹ سی لینے پڑتے ہیں۔ انا اور خودداری سے بے عزت کرنے والی لڑکیاں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے نام و نامور ثابت ہو جاتی ہیں اور تمام مرد و عورت لگانے والے کے نام سے پھپھائی جاتی ہیں۔

کوئی لڑکی جان بوجھ کر بدنامی مول نہیں لیتی۔ سلطانہ نے بھی جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ بچپن سے حسین نکلائی تھی۔ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ کسی سے مرعوب نہیں تھی۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا ٹائٹن تک کسی کو چھونے نہیں دیا تھا۔ ایسے میں جب ایک نامحرم اس کے ٹائٹن سے بھی آگے بڑھ گیا تو وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکی۔ بڑے باپ کی بیٹی بارود کی طرح پھٹ پڑی۔ غصے میں یہ عمل نہ آئی کہ وہ خود اپنی بدنامی کا سامان کر رہی ہے۔

سوچتے سوچتے وقت گزرنے کا کچھ پتا نہ چلا۔ ملازمہ نے آکر بتایا کہ چودھری وجاہت علی تشریف لائے ہیں، بیٹھک میں چودھری صاحب کے ساتھ شربت پل رہے ہیں۔ ابھی یہاں تشریف لانے والے ہیں۔

آنے والے کا انتظار تھا لیکن اب اس کی آمد سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔ ہلدی ہلدی سوچتے لگی کہ وجاہت سے اس مسئلے پر کس طرح گفتگو کی جائے۔ وہ ابھر کا مارا بڑی سرتوں کے ہجوم میں پھر ایک بار دلن کے پاس آ رہا تھا اور دلن اسے پھر سنجیدہ مسئلے میں الجھانے والی تھی۔

اس نے اٹھ کر آئینہ دیکھا۔ الجھے ہوئے بال اور شکر چوہ آنے والے کو یہی سمجھاتا کہ وہ بھی بھری ماری ہے۔ اگرچہ یہ درست تھا لیکن اب وہ اپنی پیار بھری کزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کمرے سے نکل اور ملازمہ کو بلا کر کہا۔

"صاحب آئیں تو انہیں کمرے میں بٹھانا۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ وہاں سے چلتی ہوئی اور سوچتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی۔ ایک سنگار میز کے آئینے میں دیکھا اپنا جائزہ لیا پھر واش روم میں آئی۔ واش بین کانا کھول کر جبک گئی۔ دونوں ہتھیلیوں میں پانی بھر بھر کر چہرے پر یوں چھینٹے مارنے لگی جیسے چہرے سے مسائل کو دھو رہی ہو۔ اچھی طرح صابن سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ تولیے سے منہ پونچھتی ہوئی کمرے میں آئی سنگار میز کی ٹائٹس آن کر کے دیکھا تو تیز روشنی میں پتا چلا کہ پانی کے مسلسل چھینٹوں نے

گزارش کیا تھا۔ دلن کوئی فریڈی جانے والی تھی نہیں تھی۔ اسے ڈانٹ لیت کر بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ابھی جا نہیں سکی بار اس کے دو دنوں سے تاخیر ہوا تھا۔

وہ تاخیر اپنی ماں کے پاس گیا ۳۱! آپ کا پٹا مجھے کاغذوں میں گھسٹ دیا ہے۔

”کیا دلن نے آنے سے انکار کر دیا ہے؟“

”کیا وہ بدنام ہونے آئے گی۔ آپ چاہیں تو یہ مشکل آسان کر سکتی ہیں۔“

”میں تو دن رات دعا کرتی ہوں کہ دونوں بھائی آپس میں محبت سے رہا کریں۔ بولو میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”آپ شرافت سے یہ کہنے کو کہہ دیں کہ اس نے دہرے کے رشتے سے سلطانہ کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ جس سے ملا فہمی۔“

ماں نے بات کاٹ کر کہا ”یہ تو میں نے دلن سے اسی رات کہا تھا کہ دہرے میں آیا تو کون سی قیامت آئی؟ مگر تو پٹ پڑی تھی۔“

”۳۱! اس رات کی بات جانے دیں۔ ابھی جو کہہ رہا ہوں وہ لکھو اور۔“

شرافت نے کمرے میں آکر کہا ”میں سب سن رہا ہوں اور سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ بھائی جان! اپنے گرجان میں جھانک کر دیکھو۔ تم نے سلطانہ سے کہا تھا اس کی خاطر سیاست چھوڑ دو گے۔ الیکشن نہیں لڑو گے لیکن تمہاری سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔“

”یہ سلطانہ کی خواہش ہے کہ میں الیکشن میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں جاؤں۔“

ماں نے کہا ”اللہ کرے تمہیں کامیابی ہو مگر چھوٹے بھائی کے لئے تم نے کیا کیا؟ سیاسی پارٹی نے اسے صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹ نہیں دیا اور تم خانوش رہے۔ میں نے سلطانہ کا رشتہ مانگنے کے لئے دونوں کی تصویریں بھیجیں تم نے لگانے سے بھائی کی تصویر قائب کر دی۔ تمام بزرگوں اور رشتے داروں کے سامنے سلطانہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سیاست چھوڑ دو گے شرافت کو پھر امید ہوئی کہ اسے تمہاری جگہ الیکشن لڑنے کا موقع ملے گا لیکن تم بھائی نہیں ہو دھمن ہو۔ اسے بیٹ پیچھے دھکیلتے رہتے ہو ہمیشہ نیچے گراتے رہتے ہو۔“

شرافت نے کہا ”صاف بات یہ ہے کہ میں نے تمہیں بھائی سمجھا چھوڑ دیا ہے۔ میں سلطانہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ ہاں یہ لکھ دوں گا کہ ہائے درمیان سیاست اور سلطانہ نے بھائی کا رشتہ بیٹھ کے لئے ختم کر دیا ہے۔“

وجاہت نے کہا ”۳۱! تم سے سلطانہ اور بدنام ہوگی۔ بھائی کا رشتہ مجھ سے نہیں ہے تو کس رشتے سے اس کے کمرے میں گئے تھے؟“

”میری بھئی دار سالی میرے لئے طراب من مٹی ہے۔ اب باتیں نہیں کی۔ کہ میں داغ دار ہوں۔“

”کس کی بھال ہے کہ تم پر انگلی بھی اٹھاے۔“

”جاگیر دارانہ پوک لگانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ اگر میں پہلی رات بیٹے نہ آئی جو ہوا تھا اسے برداشت کر کے سسرال میں نہ جاتی تو معاملہ اسی چار دیواری میں ختم ہو جاتا۔“

”سلطانہ! مجھے تو خوشی ہے کہ تم نے ایک بچی عورت کی طرح احتجاج کیا اور ثابت کیا کہ میرے سوا تمہیں کوئی چھو نہیں سکتا۔“

”مگر اس نے چھو لیا تھا۔ اور یہ بات آگے بڑھے گی۔ میں آپ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں گی لیکن اس کے نام سے بدنام رہوں گی۔“

”یہ نہیں ہوگا۔ یہ معاملہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔“

”شرافت اسے کبھی ختم نہیں ہونے دے گا۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا ”ساتھ میری آستین میں پیلا رہا ہے اگر میں اسے آستین سے نکل کر دور پیچک دوں۔ اگر تمہیں اس سے دور رکھوں۔ اگر تم اس حویلی میں کبھی نہ جاؤ اور ہم شرم میں نہ کرنی زندگی شروع کریں تو بات بن سکتی ہے۔“

”بات صرف اسی طرح بنے گی کہ شرافت یہ لکھ کر دے کہ اس نے دہرے کی حیثیت سے میرے ساتھ مذاق کیا تھا۔ ملا فہمی کے باعث بات بڑھ گئی تھی۔ شرافت یہ ملا فہمی دہرے کے اپنی بھائی کو خود بھائی کے گھر لے آیا ہے۔“

”ہاں یہ بات مستعمل ہے۔ آنکھ بڑھانی کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ میں کل ہی اپنے بزرگوں کی موجودگی میں شرافت سے یہ لکھو اور گا۔“

ملازم نے آکر کہا ”آپ کے ابا جی یاد کر رہے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔“

سلطانہ نے کہا ”ہم آ رہے ہیں۔“

ملازمہ چلی گئی۔ وجاہت نے کہا ”مخون پر تمہارے ابا جی نے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنی حویلی میں لے جانے کی بات نہ کروں۔ میں خود نہیں چاہتا کہ تم وہاں جاؤ۔ مگر میں نے جو کوئی تمہارے نام لکھی ہے وہ تمہاری ہے۔ تمہارے سسرال والوں کی نہیں ہے۔ ہم کھانے کے بعد وہاں جا سکتے ہیں۔“

وہ ذرا ٹکٹش میں رہی پھر بولی ”آپ کچھ خیال نہ کریں۔ پہلے شرافت سے لکھو کر لے آئیں۔ پھر میں آپ کی ہوں۔ میں اندیشوں میں نہ کرنی زندگی شروع نہیں کروں گی۔“

وہ ایس ہو کر اٹھ گیا۔ سر کے ساتھ ہینڈ کر مجبوراً دونوں کھائیں۔ کھانے کے دوران سوچا رہا کیا شرافت سلطانہ کی مرضی کی تحریر لکھ دے گا۔ اس سے لکھو انا آسان تو نہیں تھا لیکن کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ بڑی خوشی سے دلن کے ساتھ رات

جب تک ہماری بھربائی آپ کی زندگی میں نہیں آئے گی آپ  
یکسوئی سے ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے ہم نے قہر کیا ہے کہ  
ہم سب مل کر چودھری ملک نواز کے پڑ جائیں گے اور ان سے  
درخواست کریں گے کہ چودھری شرافت کی چالوں میں آکر اپنی بیٹی  
اور داماد کا مستقبل برباد نہ کریں۔

وجاہت نے تائید میں سر ہلا کر کہا کہ آپ ہی ایک راستہ دیکھا  
ہے۔ اگر آپ لوگوں کی کوششوں سے میرا گھر تباہ ہو جائے گا تو  
شرافت کی کچھ میں تے گا کہ ہمارے خلاف اس کی کوئی سیاسی  
بھرا بھری کام نہیں آئے گی۔

”بے شک سیاسی مفادات کے لئے آپ کی خانہ تباہی بہت  
ضروری ہے۔“

وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ کل صبح  
تک اسے کوئی خوشخبری سنائیں گے صبح ہونے میں بیٹی دیر تھی۔  
عہد کی خوشی میں چاند رات کو نیند نہیں آئی۔ وہ بستر آکر بیٹی دیر  
تک کو نہیں بدلا۔ بہ۔ خوشی میں یہ بھول گیا تھا کہ سلطان نے نئی  
زندگی شروع کرنے سے پہلے شرافت کی ایک تحریر طلب کی تھی۔

جب یاد آیا تو نیند اچاٹ ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کو  
سونا اور دن کو ناندوم رہنا ضروری تھا۔ وہ نیند کی دو گولیاں کھا کر  
سو گیا۔ دو سڑی صبح آٹھ بج گئی تو اچانک ہی ایک خبر سوچی اس نے  
فورا ہی بستر سے اٹھ کر کھم اور اسٹامپ پیپر لے کر تحریر لکھی۔  
اسے میز پر چھوڑ کر غسل کرنے گیا۔ اب اسے بیٹی کو تک نہیں تھا  
کہ سلطانہ انکار نہیں کرے گی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر  
راضی ہو جائے گی۔

وہ پھر سسرال پہنچ گیا۔ سلطانہ نے پہلے دن کی طرح اپنی خواہگاہ  
میں اس کا استقبال کیا۔ وجاہت نے کہا ”شیطان اپنے ہتھکنڈوں  
سے باز نہیں آتا۔ البتہ انسان چاہے تو شیطان کی چالوں کا جواب دے  
سکتا ہے۔“

یعنی چودھری شرافت میری بدنامی کا باعث بننا ہے گا؟  
”ہاں“ لیکن میں نے اس کا توڑ کیا ہے۔ تم بھی چاہتی ہو تاکہ  
ساک رات والے واقعے پر کوئی قسمیں بدنام نہ کرے۔ میری بات  
کچھ سلطانہ! کسی بھی عورت کی پارسائی کا گواہ اس کا خاوند ہوتا  
ہے۔ اگر میں قسمیں تحریر کی طور پر نیک نام اور پارسا تسلیم کر لوں تو  
شیطان کا مشر بند ہو جائے گا۔“

اس نے ایک اسٹامپ پیپر سے دیتے ہوئے کہا ”بزرگوں نے  
شرافت کی حمایت میں کچھو آکر اپنا تھا۔ کسی نے تمہارے بے دماغ  
ہونے کی قسم نہیں کھائی تھی۔ میں نے اس کاغذ پر قسم کھائی ہے۔  
اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ تم اپنی ذات میں آئینے کی طرح صاف  
ہو اور میں مرتے دم تک تمہارے اعلیٰ کردار کا گواہ بن کر رہوں  
گا۔“

وہ وجاہت کی تحریر پڑھ رہی تھی اور قائل ہو رہی تھی۔ محبت

”تم نے کس رشتے سے میری تصویر تمہاری قسمی؟ جب تم ایسا  
کر سکتے ہو تو کیا میں ہارنی ہوئی ہارنی بیٹھے کے لئے کرے میں نہ  
جاتا؟“

”یعنی تم انتقام لے رہے ہو؟“  
”لے رہا ہوں نہیں“ انتقام لیتا رہوں گا۔ اسے تمہاری زندگی  
میں آنے نہیں دوں گا۔“

وجاہت اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا ”مجھے خسر نہیں آتا“  
اور سیاست میں کسی کامیابی کی دلیل ہے اب تم دیکھو گے کہ سلطانہ  
کس طرح میری زندگی میں آئی ہے۔“

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ شرافت اس کے پیچھے دووازے تک  
آگیا بولا ”تم بھی میری سیاست دیکھو گے۔ میں الیکشن لڑوں گا۔  
تمہاری مخالف پارٹی نے مجھے گت دیا ہے۔ پھر وہ عورت بھی میری  
ہوگی جو اب تک تمہاری کچھ نہ بن سکی۔“

وجاہت نے اپنے کمرے میں آکر دووازے کو اندر سے بند  
کر لیا اور بے چینی سے ٹپٹے لگا۔ اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ  
شرافت دو سڑی پارٹی کے پلیٹ فارم سے آیا ہے۔ ابھی اس نے  
خود ہی تصدیق کر لی۔ اب سیاست اور سلطانہ دونوں کانٹوں پر  
بھائی سے مقابلہ تھا۔

وجاہت کو یقین تھا ”سیاست میں چھوٹے بھائی کو بری طرح  
گتت ہوں لیکن سلطانہ کے گت پر بے چینی تھی۔ کامیابی اسی  
صورت میں ممکن تھی کہ وہ جلد از جلد حاصل ہو جائے۔ شرافت کا  
یہ دعوئی اہم تھا کہ سلطانہ ابھی تک اس کی کچھ نہیں سن پائی ہے۔“

ملازم نے دووازے پر دستک دے کر اطلاع دی کہ پارٹی کے  
اہم لیڈر ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ وہ کرنے سے نکل کر ڈرائنگ  
روم میں آیا۔ کسی سے مصافحہ کیا کسی کو گلے لگایا۔ ایک نے  
کہا ”چودھری صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔ چھوٹے چودھری کو آپ  
کے ستا بلے پر نہیں آنا چاہئے تھا۔“

وجاہت نے کہا ”تو نے وہی آئے وہ۔ کیا میری پوزیشن کمزور  
ہے؟“

ایک لیڈر نے کہا ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو چودھری  
شرافت کی بھلائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اسے بری طرح گتت  
ہوگی۔“

دوسرے نے کہا ”حریف کو کمزور اور ٹھان نہ سمجھو۔  
چودھری شرافت گھر کے اندر سیاست کھیل رہا ہے۔ بھی چودھری  
وجاہت صاحب ایمان سے کہتا۔ کیا اس نے آپ کی شادی کو  
مسئلہ نہیں بنایا ہے؟“

تیسرے نے کہا ”جی مجھ سے پوچھو۔ چودھری صاحب پوری  
توجہ سے الیکشن کے معاملات میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں اور کسی  
چودھری شرافت کی کامیابی ہے۔“

ایک اور لیڈر نے کہا ”ہم آپ کا مسئلہ حل کرنے آئے ہیں۔“

کرنے والا شرافت کو ذمہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بیوی رانائل سے راستہ بدل کر گیا تھا۔

اس نے پوچھا "میری پارٹی کے اہم افراد یہاں آئے ہوں گے؟"

"جی ہاں! مجھے اپنی نظریوں کا احساس ہے۔ آپ جو سیاہی جگ لڑ رہے ہیں میں نے اس میں آپ سے تعاون نہیں کیا۔ اب کھول گئی۔ اس گھر سے بھی اطمینان ہو گیا ہے۔ جگ آپ ہی میرے بھلے بھلے کے گواہ ہیں اور گواہ رہیں گے۔ اب میں کسی بات پر اعتراض نہیں کھول سکتی لیکن آپ ایک بات مان لیں۔"

"ایک نہیں ہزار باتیں سناؤ۔"

"میں عدل والہ نہیں جاؤں گی۔"

"میں نہ تو اس حویلی میں تمہیں لے جاؤں گا نہ ای اور شرافت کے سامنے لے جانا پسند کروں گا۔ تم اپنی کوٹھی میں جاؤ گے۔ میں آج رات تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔"

"وہ شواہکی۔ فوراً ہی منہ پھیر کر کمرے سے چلی گئی۔ جانے کا انداز تھا گیا کہ وہ ذرا شرموہ جیا کو تھپک کر واپس آئے گی۔ دوسریں ہاں پوٹے کے بعد پھر کس نہیں جاتی۔"

"وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ بیوی دیر بعد ملازمہ نے آکر کہا "آپ کو بددھری صاحب کھانے پر بلا رہے ہیں۔"

دل سے ایک ہائے نکل گئی۔ جھوک بکھ اور گئی پلیٹ بکھ اور پیش کی جا رہی تھی۔

دستر خوان پر ساس سر موجود تھی۔ سلطانہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اپنے ہاتھوں سے ڈشیں اٹھا اٹھا کر دینے لگی۔ ایسے وقت گوری کلائیوں کی چونچیاں کھٹک رہی تھیں اور کھٹکائی ہوئی سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں "ابھی جلوت جلوت ہوں پھر جلوت جلوت رہوں گی۔"

چودھری سرنے کھانے کے دوران کہا "ہندو جاہت مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں جی زندگی شروع کرنے جا رہے ہو۔ خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آبلور رکھے۔"

"وہ کھاتا رہا۔ ہوں ہاں کہہ کر ان کی دعائیں لیتا رہا اور آکھ کسی رکھوت کے بغیر سلطانہ سے وصال کی دعائیں مانگتا رہا۔ پھر وہ ہر تک جی کوٹھی میں آگیا۔ ملازموں کو گھمسا کہ وہاں کی اچھی طرح ستائی کریں اور کوٹھی کو دلہن کی طرح پہلوں۔ اس کے بعد عدل والہ آگیا۔"

شام ہونے ہی پہلے امٹہ کرنے لگے۔ ہارش ہونے لگی پھر ہوتی ہی چلی گئی۔ گویا ایک جی سمیت دھمکی دینے لگی۔ ہارش کا ندرت رہا تھا کہ وہ شرافت کی سازش کے مطابق آئی ہے اور سلطانہ سے اسے لینے نہیں دے گی۔

ایسے ہی وقت میں نون کی گنتی بنتے گئی۔ اس نے راجیو رانائل کو پوچھا "میرا۔"

دوسری طرف سے بہت جلد ہی کواڑ نکالی دی۔ پھر اس نے سلطانہ کو پھان کر پوچھا "سلطانہ! تم یہاں رہی ہو؟ تمہیں وہ جاہت ملی ہوں۔"

اس نے کہا "تپ کی کواڑ اچھی طرح نکالی نہیں دے دی ہے۔"

"وہ پولا "میں کہہ رہا ہوں کوئی ٹھکانہ کوئی سیلاب مجھے تمہارے پاس آئے سے نہیں روکے گا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ ہم آج ہی اپنی کوٹھی میں جائیں گے۔"

"پولا پولا "تپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہ پولا "ذرا ایک منٹ۔" پھر اس نے پوچھا "میری! کیا آپ نے ہنگامہ لانا نہیں ہے۔"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے کہا "پولا پولا۔"

سلطانہ نے کہا "آپ کواڑ صاف نکالی دے رہی ہے۔" "میں کہہ رہا تھا۔ تمہیں لینے کے لئے حویلی سے نکل رہا ہوں۔ تیار رہو۔"

اس نے راجیو رکھ کر سوچتی ہوئی نظروں سے دو آنے کی سمت دیکھا۔ پھر جلدی سے چلا ہوا ڈھنگ میں گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ راجیو رکھٹل پر رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی تھا تو انہیں سن کر جا چکا تھا۔

اس نے سوچا "موت نہ لیا فرق جتنا ہے۔ میں بھی ایک دو سرے سے لٹے جا رہے ہیں کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

"وہ حویلی سے نکلا۔ ہارش میں ذرا بھینکا ہوا گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اسے اشارت کیا تو انہیں فوراً چا کر چپ ہو گیا۔ پتا نہیں کہیں رکھو نہیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے "جتنی رکھو نہیں اور حکمت پیش آتی ہیں انسان انکا ہی خدی اور مور میدان بننا جاتا ہے۔ ملازموں نے گاڑی کو دھکا لگایا۔ وہ اشارت ہو کر سلطانہ کی طرف چل پڑی۔"

ارادہ تھا "امیر ہونے سے پہلے جانے گا اور دلہن کو لے کر جی کوٹھی میں پہنچ جائے گا لیکن خاص دیر ہو گئی۔ جبکہ سلطانہ کے ساتھ وہاں پہنچا تو آدھی رات گزرنے کو تھی۔ کوٹھی رنگ برنگے تختوں سے تھی ہوئی تھی مگر وہاں ان تھی۔ وہاں کوئی ملازم تک نہیں تھا۔"

سلطانہ نے کوٹھی کے امیر آکر پوچھا "یہاں اور کوئی نہیں ہے؟"

"وہ پولا "صبح تک کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے تو کوٹھی کو چھٹی دے دی۔ ویسے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا تمام سامان موجود ہے۔"

"وہ کوٹھی کے خلف حیلے سے گزرتے ہوئے ایک کمرے میں آئے۔ وہاں پہنچتے ہی سلطانہ ایک دم شواہکی ہو کر اساک رات کے لئے پہلوں سے سجایا گیا تھا۔ سچ پر آنہ گاہوں کی ہیں۔"

پنگ کے سرے پر سے ہوتے ہوئے قالین پر پہنچ کر چاروں شانے چت ہو گیا۔

سلطانہ کے طلق سے چیخ کھل گئی۔ پنگ کے سرے سے لے کر فرش تک سرخ لوتیا ہاتھ لگا کر ساگ کی بیج کو پھر آگ لگ گئی ہے۔ وہ فرش پر آکر چلتی ہوئی اسے جھمکوتے ہوئے ہولی "نہیں نہ نہیں ہو سکتا۔ آپ۔ آپ آنکھیں کھولیں۔ مجھ سے بولیں۔ کیا میں سمجھوں کہ یہ خواب ہے؟"

اسی وقت دور کسی کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی، وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا اور کسی کو ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ وجاہت نے کھڑکیوں اور دروازوں کو اندر سے بند کیا تھا لیکن کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کھڑکی کے پت کھلے ہوئے تھے۔

وہ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی وہاں فرش پر قالین نہیں تھا۔ اس لئے فرش پر ایک ریو الور کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ ریو الور وہاں پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا۔ باہر سے ایک گھوڑے کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ پگ کر کھڑکی کے پاس آتے ہوئے ہولی "کون ہے؟ سامنے آؤ کون ہے؟"

ایک گھوڑا دوڑتا ہوا احاطے کے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر جا رہا تھا۔ وہ لٹکارتے ہوئے ہولی "ٹرک جاؤ نہیں تو کوئی مار دوں گی۔"

اس نے دھمکی دیتے ہوئے گولی چلا دی۔ دور تک قازنگ کی آواز گونجتی ہوئی گئی۔ لیکن گھڑسوار کا کچھ نہ بگڑا۔ وہ کوشی کے باہر اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔

وہ واپس کمرے کی طرف دوڑی۔ دروغ میں آمد ہی چل رہی تھی۔ آنکھوں سے اپنے شوہر کی لاش دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کنواری بیوہ ہو چکی ہے۔ ساگ کے بسترے پہلے اب جھلایا پھر شوہر کو جلا ڈالا۔

وہ دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ اندر لاش پڑی ہوئی تھی۔ بسترے گلاب کی پتیاں اڑتی ہوئی مہوہ دلہا پر بکھر رہی تھیں۔ سلطانہ کی آنکھوں سے گہرے صدے کا اظہار ہو رہا تھا لیکن ان آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی معیبت یا صدے کے وقت روئی نہیں تھی۔ اس کے والدین نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ ایسی پتھر لڑکی شاید ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹیلی فون کے پاس آئی۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہونے پر ملازم کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "ہاجی کو بلاؤ۔"

چند سیکنڈ میں ہی باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری سنجیدگی سے ہولی "ہاجی! کسی نے چودھری وجاہت علی کو قتل کر دیا ہے۔ میں بیوہ ہو گئی ہوں۔"

"ہی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرے داماد کو کس نے قتل کیا

خوشبو نکالی تھی۔ سہانے گنتے پر دلہن کا سرخ جوڑا رکھا ہوا تھا۔

وجاہت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم میری ہو، میں تمہارا ہوں۔ آج ہمارے رشتے کو ایک نام ایک پہچان دے۔"

وہ بستر کے پاس آیا۔ پھر سرخ جوڑا اٹھا کر اسے دپتے ہوئے بولا "میری دلہن بن جاؤ۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ کوسے گنتے بند آکر دستک دلاؤ گا۔"

وہ کمرے سے باہر گیا۔ سلطانہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوشی کے مختلف حصوں میں آکر کھڑکیوں اور دروازوں کو چھک کرنے لگا۔ وہ سب اندر سے بند تھے۔ باہر سے کوئی معیبت نہیں آسکتی تھی۔ چھت مضبوط تھی۔ اوپر سے کوئی عذاب نازل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ اطمینان پہلے سے تھا۔ پھر بھی اس نے وقت گزارنے کے لئے اور اطمینان حاصل کر لیا۔ پھر اس کے بعد دلہن کے دروازے پر آکر دستک دی۔ انتظار کیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ یہ عمل آگئی کہ نئی دلہن بیج سے اٹھ کر دروازہ کھولنے نہیں آئے گی۔ اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔

وہ بھولوں کی بیج پر گھونٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ نظر نہیں آ رہی تھی مگر ہنڈیاں کو دھڑکا رہی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے قریب آکر بولا "میرا نام وجاہت علی ہے۔ تم نے نکاح قبول کرنے وقت میرا نام سنا ہوگا۔ ثبوت کے طور پر یہ شناختی کارڈ حاضر ہے۔"

وہ سلطانہ کے ہاتھ میں اپنا شناختی کارڈ تھما کر سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا "مجھ پر یہ ایک مذاق لگتا ہے لیکن میں ابھی باہر سے آیا ہوں۔ اور تم گھونٹ میں بیٹھے نہیں دیکھ رہی ہو۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں ہاتھ لگا کر انگوٹھی پستانے سے پہلے گھونٹ اٹھاتا ہوں۔ تم مجھے دیکھ کر اپنے شوہر کی موجودگی کا یقین کر لو۔"

اس نے بڑے پار سے گھونٹ کو اٹھایا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ غلبت میں پوری طرف دلہن کا... سنگار نہیں کہائی تھی پھر بھی تدریج حسین جھلک، جھلک کر اسے دیوانہ بنا رہا تھا۔ وہ بولا "مجھے دیکھو۔ مجھے پہچانو۔"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، شہا کر اور گردن جھکا لی۔ وجاہت نے کہا "سمجھ گیا۔ شہا رہی ہو۔ اچھا لو۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ جلدی سے مجھے دیکھ لو۔ مجھ میں ساری رات دیکھنا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے اچانک ٹھانسی سے گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔ وجاہت کے طلق سے ایک کراہ نکل، قازنگ کی آواز سنتے ہی سلطانہ نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی وجاہت اس پر اوجھڑا ہو گیا۔ وہ بستر پر گرتے گرتے سنبھل گئی۔ وجاہت اس پر سے ایک طرف ڈھلکتے ہوئے

ہے۔  
 میں نہیں جانتی، قاتل فرار ہو گیا ہے۔ آپ پولیس کو لے کر  
 آجائیں۔  
 میں ابھی آ رہی ہوں۔ حوصلہ رکھو، فوراً آ رہی ہوں۔  
 سلطانہ نے ریسیور رکھ دیا پھر کچھ سوچ کر اٹھا لیا۔ دوسرے نمبر  
 ڈائل کرنے لگی۔ اس نمبر پر بھی ایک ملازمہ نے ریسیور اٹھا لیا۔  
 یہی میں سلطانہ ہوں۔ چودھرائن کو بلاؤ۔  
 تھوڑی دیر بعد چودھرائن کی آواز آئی، میں میری نیند  
 خراب کر رہی ہو۔ میرے بچے کو جیتے جی تمہیں کر لے لگیں۔  
 اب کیا چاہتی ہو۔  
 تمہارے بچے کی ملاش واپس کرنا چاہتی ہوں۔  
 دوسری طرف سے وہ جیسے اچھل پڑی ہو۔ چی کر رہی، گیا کتنی  
 ہو۔  
 یہ بکواس ہے یا حقیقت، اپنے چھوٹے ذلیل بچے سے  
 پوچھو۔  
 ۳۰ خبردار! میرے بچے کو ذلیل نہ کرنا۔  
 وہ کہاں ہے؟  
 یہاں نہیں ہے۔  
 ۳۰ انتظار کرو۔ وہ بارش میں بھیگ کر گھوڑے پر سوار آ رہا  
 ہوگا۔  
 سلطانہ نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف چودھرائن نے کہا۔  
 مہیلو بیلو۔  
 ماں کا دل دوڑنے لگا۔ آنکھیں بھی دوڑنے لگیں۔ دشمن ہو  
 سے اطلاع لے کر بچے کی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ یہ  
 بھی مانتی تھی کہ سوچی اور کھری ہے۔ اپنے شوہر کی موت کی غلط  
 اطلاع نہیں دے گی۔  
 وہ سوتے کے دوران فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر بارش  
 کے شور میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ تیزی  
 سے چلتی ہوئی پہننی دوڑانے پر آئی۔ پھر اسے کھل کر دیکھا۔  
 شرافت گھوڑے سے اتر رہا اور سامنے سے کہہ رہا تھا ۳۰ سے  
 اسٹبل میں لے جاؤ اور خبردار! یہ کسی سے نہ کہنا کہ ہمارے  
 اسٹبل کا کوئی گھوڑا رات کو باہر نکالا گیا تھا یا پھر کہہ دیا۔ آج  
 رات تم چھٹی پر گئے تھے۔ اسے اسٹبل میں باندھ کر چھٹی پر چلے  
 جاؤ۔  
 سامنے گھوڑے کی نگاہ پکڑ کر لے گیا۔ شرافت بارش میں  
 دوڑتا ہوا حویلی کے برآمدے میں آیا مگر کھلے ہوئے دوڑانے کو دیکھ  
 کر ٹھنک گیا۔ پھر تیزی سے ماں کے پاس سے گزرتا ہوا حویلی کے  
 اندر آیا۔ ماں نے پلٹ کر دوتے ہوئے پوچھا، اتنے میرے بچے کو  
 قتل کیا ہے؟  
 وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ ماں کو دیکھ کر ہلاکت میں نے کسی کو قتل

نہیں کیا ہے۔ یہ بھوت ہے۔  
 سلطانہ نے ابھی فون پر تالا ہے کہ قاتل گھوڑے پر سوار  
 یہاں آ رہا ہے اور لڑا لڑا۔  
 ۳۰ یہ کیا بکواس ہے۔ کیا آج رات جو بھی گھوڑے پر سوار  
 یہاں آئے گا وہ قاتل ہوگا۔  
 وہ دوتے ہوئے پہلی تو پھر میرے بچے کو کس نے قتل کیا ہے۔  
 مجھے وہاں لے جاؤ۔ میری جان قتل ہو رہی ہے۔  
 مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ بھائی جان کو کسی نے قتل کیا  
 ہے۔ میں ابھی وہاں لے جاؤں گا۔  
 کہاں لے جاؤ گے؟ کتنی دور جانا ہے؟  
 کتنا دور نہیں ہے۔ بھائی جان نے سلطانہ کے نام کو ٹھی  
 کس ٹھی اسی کو ٹھی میں جانا ہے۔  
 تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اسی کو ٹھی میں میرے بچے کو۔  
 وہ گڑبگڑا گیا۔ پھر جلدی سے کھل کر ہلاکت کی! بڑے شرم کی  
 بات ہے۔ تم ایک بچے کو دوسرے بچے کا قاتل کہہ رہی ہو۔ یہ  
 بات سوتی سی گل میں آ سکتی ہے کہ بھائی جان سلطانہ سے لٹنے کے  
 لئے سلطانہ کی کوٹھی میں جایا کرتے تھے۔  
 ہاں بچے! میری گل میں کام نہیں کر رہی ہے۔ میں تم پر شہ  
 نہیں کر سکتی، مجھے جلدی وہاں لے جاؤ۔  
 میں بھیگ گیا ہوں۔ لباس بدل کر آنا ہوں۔  
 میں بچے کے لئے ڈب رہی ہوں اور تم لباس بدلنے جا رہے

آپ کا ریڈیو اور ٹی وی خراب بھی ہو سکتا ہے۔  
 ریڈیو اور ٹی وی رکھنے والے کیوں کہ ان کی تکنیک سے  
 واقف نہیں ہوتے اس لئے پریشان رہتے ہیں۔ اور  
 معمولی معمولی خرابیوں کے لئے بہت زیادہ پیسہ بھی خرچ  
 کر دیتے ہیں۔

ٹی وی کی تصاویر جھوٹا انٹرنیٹ کے ٹیڑھا ہونے  
 سے خراب ہوتی ہیں جو ہر شخص خود درست کر سکتا ہے۔  
 ریڈیو اور ٹی وی پر جدید ٹیکنالوجی کی بہترین کتابیں۔

ریڈیو گائیڈ      پچیس روپے  
 ٹی وی ریسیٹر گائیڈ      بارہ روپے  
 کلر ٹی وی گائیڈ      پینتیس روپے

میں نے لباس تبدیل نہ کیا تو تمہاری طرح پولیس والے بھی سلطان کے جان کو درست سمجھیں گے۔ مجھے ہی وہ قاتل گنہگار سمجھیں گے۔

وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسری طرف سلطان کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اس کے ہاں باپ آگے تھے۔ اسے رونے کی کوششیں کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر نے وہ رپورٹ اپنے لپٹے میں لے لیا تھا جس سے وجہیت پر گولی چلائی گئی تھی۔ پھر اس نے وجہیت کی ماں کو فون کے ذریعے مل کی اطلاع دی۔ وہ تو ہونے چنے کے ساتھ آنے والی تھی۔ فون پر اطلاع لیتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صبح ہونے سے پہلے چنے کی تلاش دیکھنے تک تھی۔

سلطان نے گورنر کراچی کو لکھا کہ وہ صوبے کا اعجاز کرتے ہوئے بولا "سلطان! بھائی جان کے قتل نے مجھے اندر سے مار ڈالا ہے۔ یہ دوست ہے کہ ہم آپ میں بھی کئی لوگ بھی تھے۔ لڑائی پر گھر میں ہوتی ہے۔ ایسی لڑائیوں سے نفرت نہیں محبت بڑھتی ہے۔ بھائی جان میرے دل میں محبت بڑھا کر چلے گئے۔ تو میں اس محبت کا بوجھ اٹھا کر کسے ذمہ دار ہوں گا۔"

وہ بدستور خاموشی سے گورنر ہی تھی۔ اس نے پوچھا "تم نے قاتل کو دیکھا ہوگا؟ تم بھائی جان کے قریب تھے۔"

انسپکٹر نے کہا "ہم نے چودھری کو یہ سوال کر چکا ہوں۔ یہ کہتی ہیں قاتل پتھر اور پھینک کر ایک گھوڑے پر فرار ہو گیا۔ اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

شرافت کی ماں نے رونے ہوئے پوچھا "اس نے نہیں دیکھا کسی ملازم نے تو دیکھا ہوگا۔"

سلطان نے جواب دیا "آپ کے بیٹے نے ملازموں کو ہمیشہ دے دی تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔"

"وہ لوگو بھی تمہاری ہے۔ میرا بیٹا حویلی سے چل کر آیا تھا۔ ملازموں کو ہمیشہ دینے کا اسے حق نہیں تھا۔ تم نے انہیں ہمیشہ ہی ہوگی۔"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ چودھرائن ماں نے کہا "میں نے یہاں سے سب کو بھاگ کر بھاگنے کی جان لی ہے۔"

شرافت نے کہا "ہی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

چودھری ملک نواز نے کہا "چودھرائن! ہوش میں نہ کہا میں کہہ رہی تھی ابھی تک دلہن کے جوڑے میں ہے۔ یہ جوڑا اپنے والیاں اپنے ہاتھوں سے بھڑکے نہیں۔"

اس سے تو میں دلہن بنا کر اپنے گھر لائی تھی لیکن یہ پہلی ہی رات سے میرے بیٹے کی دشمن بن گئی تھی۔ دشمنی وہاں پوری نہیں

کر سکتی تھی اس لئے وہ ان کو بھی میں نے کراہنا لکھا تھا۔

ملک نواز نے گرج کر کہا "لیکن اس بڑے کو دہشت میں تمہارے دوسرے بیٹے کو یہاں سے زخم نہیں چلے گا۔ پوچھا! انہیں سے وہ ان بیٹوں کی کاٹیں لے جائے گی۔"

چودھرائن ڈھال بن کر شرافت سے لپٹتی گئی۔ پھر وہی "نہیں" میں کچھ نہیں بول سکی۔ میرے بیٹے کی تلاش کئے دے۔ میں اپنے شرافت کو لے کر چلی جاؤں گی۔"

شرافت نے ملک نواز سے کہا "چودھریوں کو بات بات پر خسر آتا ہے۔ میں بھی چودھری ہوں لیکن سلطان کے صوبے کو کچھ ہونے بات نہیں بھٹانا چاہتا۔ آپ بھی میری امی کے صدمات کو سمجھیں۔"

انسپکٹر نے کہا "کاش پوسٹ مارٹم کے لئے جائے گی اور مجھے انیسویں کے ساتھ کتنا پڑتا ہے کہ سلطان حکم حراست میں رہیں گی۔"

ملک نواز نے کہا "انسپکٹر! تم میری بیٹی کو گرفتار کر کے؟ آخر کس جرم میں؟"

چودھری صاحب! محتفل کے پاس صرف تمہاری ساہزادی تھی۔ اور کوئی نہ تھا۔ جس رپورٹ سے قتل ہوا وہ بھی تمہاری ساہزادی سے ہی ہمیں ملا ہے۔"

چودھری ملک نواز فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کرنے لگا۔ افسران سے شناسائی تھی۔ ان میں سے ایک چھٹی پر تھا "وہ سب کو عارضی طور پر محتفل کر دیا گیا تھا۔"

شرافت فون کے ذریعے اپنی سیاسی پارٹی کے اہم لیڈروں سے کہنے لگا کہ وہ کسی طرح اپنے ذرائع استعمال کر کے سلطان کو حوالات میں جانے سے روک دیں لیکن صبح کے پانچ بجتے والے تھے۔ حوالات کے لئے حوالات کھلی ہوئی نہیں تھی اور کوئی لیڈر ایجنٹ سے پہلے قتل کے کیس میں سفارش کر کے اپنا نام اخبارات میں نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

کوئی کچھ نہ کر سکا۔ سلطان پہلے حوالات میں گئی پھر جیل کی آہلی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دی گئی۔ چودھرائن نے اپنے محتفل بیٹے کے لئے سلطان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ شرافت نے ماں کو ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ لیکن جیل میں آکر سلطان سے ملاقات کی۔ اسے "چین دلا" "میری امی بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی ہیں۔ میں انہیں مقدمے بازی سے روکنا چاہتا ہوں۔ وہ ٹھننے دیتی ہیں کہ میں تمہارے عشق میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

وہ سختی سے "اے شرافت! عشق اور محبت کی باتیں نہ کرو، ملاقات کا مقصد؟"

"تم مجھے ملا سمجھتی رہو گی لیکن میں تمہیں الزامات سے ہی کرا کے اپنی محبت ثابت کر دوں گا۔ میں یہی کہنے آیا ہوں کہ میں اس مقدمے میں اپنی والدہ کے ساتھ نہیں، تمہارے والد کے

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ملاقات کا مقصد؟

ساتھ ہیں۔

دستی پورا ہوا تھا۔ جس پر والد سے وہاں سے کو قتل کیا گیا تھا اس پر  
سلطانہ کی انگلیوں کے نشان پائے گئے تھے اور وارادات کے وقت  
صرف سلطانہ ہی حائل کے پاس تھی۔ اس کے خلاف مقدمہ سخت  
ہو گیا تھا۔ صرف ایک ہی بات سلطانہ کے حق میں تھی کہ قتل کا  
کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ لیکن کسی موقع پر بھی ایسے ایک دو گواہ  
پیش کیے جاسکتے تھے۔

حاکمات کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ چلا گیا۔ سلطانہ آہلی  
سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر سوچنے لگی "ساتھ ایک بار ساتا ہے اور مار  
ڈالا ہے۔ موارتا نہیں ہے بیٹے زہر سے ڈستارتا ہے۔"  
چودھری شرافت حویلی میں آیا تو انہوں نے پرچھا "اپنی جیسی سے  
قل کر آئے ہیں؟"

"ہاں اے جین راک۔ لڑکی کو خوش کر رہا ہوں کہ میں مقدمے  
میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔"

"یہ تو تم دیکھ رہی ہو۔ تم اپنی ماں کے خلاف ہو۔"  
"ہی! میں طاقت کھوں تو آپ اس مقدمے میں ایک قدم  
نہیں چل سکتی گی۔"

"تم میرے خلاف نہیں ہو، سلطانہ کے خلاف نہیں ہو تو آخر  
ہو کس کے؟"

"سلطانہ میری محبت کو نہیں سمجھتی اور آپ میری سیاست کو  
نہیں سمجھ پاتیں گی۔ سنی المال، آپ مجھے ایک تمنا سنا لیجئے۔"

وہ ماں سے کترا کر چلا گیا۔ ملک میں جو عام انتخابات ہونے  
والے تھے وہ چند ناگزیر وہاں کی بنا پر ملتوی کر دیے گئے تھے۔  
سیاسی سرگرمیاں سوچ گئی تھیں۔ ہند پر ایسا ہوا تھا لیکن سیاستدان  
کچھ رہے تھے کہ ابھی نہ کسی پھر کبھی عام انتخابات ضرور ہوں  
گے۔ اور سیاسی سوچ بگ باری رہی تو جلد ہی ہوں گے۔ اس نے  
تمام سیاستدان اندر ہی اندر اپنے طور پر مصروف تھے۔

پارٹی لیڈر نے شرافت سے پرچھا "چودھری صاحب! آپ  
ہماری کارنرنگ میں شریک کیوں نہیں ہوتے ہیں؟"

شرافت نے کہا "شریک ہونا کیا ضروری ہے۔ میں بیننگ کے  
تمام ایجنٹوں کو تسلیم کر لیتا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

ایک اور لیڈر نے کہا "چودھری صاحب! آج کل۔ سلطانہ کے  
مقدمے میں الجھے ہوئے ہیں۔"

"وہ سب نے پوچھا "ایسا سلطانہ آپ کے لئے اقتدار حاصل  
کرنے سے زیادہ اہم ہے۔"

"وہ بلا "اقتدار اہم ہے۔ آج اقتدار سے باہمیوں میں ہوتا  
میں سلطانہ کو جیل سے چھڑا کر اپنی بیچ پر لے آتا۔"

"کیا وہ آپ سے راضی ہے؟"

"میں تو ایک شکل ہے۔ اور یہ ہے کہ میں اور اندر سے فولاد  
ہے۔ اس فولاد کو آہستہ آہستہ بھلا رہا ہوں۔ جب تک وہ راضی  
نہیں ہوگی میری اسی کا دلیل مقدمے کی تاریخیں بڑھواتا جائے  
گا۔"

اس کے خیال کے مطابق محبت اور سیاست میں مکاری لازمی  
تھی۔ وہ ایک طرف ماں کو مقدمے بازی سے نہیں روکتا تھا۔

دوسری طرف اس نے وکیل کو ہماری سلووضہ دے کر پیشی کی  
تاریخیں بڑھواتا یا تھا۔ ساتھ ہی سلطانہ کے باپ ملک نواز سے

اس کے خیال کے مطابق محبت اور سیاست میں مکاری لازمی  
تھی۔ وہ ایک طرف ماں کو مقدمے بازی سے نہیں روکتا تھا۔

دوسری طرف اس نے وکیل کو ہماری سلووضہ دے کر پیشی کی  
تاریخیں بڑھواتا یا تھا۔ ساتھ ہی سلطانہ کے باپ ملک نواز سے

ملک نواز: بیٹی کے مقدمے میں کسی سوچ کر گھور پوچھا تھا کہ  
اسے شرافت کی حمایت حاصل ہے۔ اگر وہ چاہتا تھا تو جوئے چشم  
دید گواہ پیش کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کر رہا تھا۔ ہاتھ ہی ہاتھ میں  
ملک نواز کو سمجھاتا تھا کہ سلطانہ اسے اپنا بھگے تو ماں کی دشمنی  
پاکدار نہیں رہے گی۔

باپ حاکمات کے لئے جیل میں آتا تو بیٹی کو سمجھاتا تھا کہ  
شرافت کے لئے اپنا رویہ نرم رکھو۔ کھلی ہاتھوں کو بھول جاؤ۔

انسان سے ظلمی ہوئی ہے۔ شرافت ظلمی کی طوائف کہتا ہے۔ وہ  
مقدمے میں ماں کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ اسے اپنے ہی ساتھ  
رہنے کا حوصلہ۔

والدین اسے سمجھاتے تھے۔ پھر حاکمات کا وقت ختم ہونے ہی  
چلے جاتے تھے۔ کوئی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ کس طرح اندر کی آگ

میں جل رہی ہے۔ اس کی زندگی میں دو بار پھولوں کی بیج آؤ، اور ہر  
بار ہندوں کا گرم ہتر چھین لیا گیا۔ جیل کے لفٹ سے فرش پر سونے

کے لئے پھینکا گیا۔ ایسے میں وہ اوپر سے شانت رہتی تھی مگر ابر  
سے بھری رہتی۔ والدین کی نصیحتوں کا اثر ہوتا تھا۔ یہ بات کچھ

میں آئی تھی کہ خسر دکھائے۔ سے قصان اٹھائے گی۔ سزا سے موت  
! مرتد کی صورت میں زندگی بے مقصد رہ جائے گی۔

لوہر کی آگ بانی سے بچتی ہے۔ اندر کی آگ صبر سے اور صبر  
شکل سے آتا ہے۔ اس نے خود کو نارمل رکھنے اور اچھا وقت

گزارانے کے لئے جیل سے کتابیں سکھوائیں۔ اس کے اہلی بیٹی کو  
ابھی خاصی رقم دینے رہے تھے۔ لیڈر کاٹھینس وغیرہ کی بھی آہلی

بیہوش تھی۔ وہاں کے تمام سرکاری ملازمین سلطانہ کی ایسی خدمت  
کرنے تھے جیسے وہ حویلی کے ملازم ہوں۔

اتنی سوتھیں حاصل ہونے کی وجہ سے جیل کی چار دیواری  
میں کسی حد تک دل لگ گیا۔ وہ صبح سویرے سلاخوں سے باہر آکر

جیل کے باغیچے میں چلتی تھی۔ ہلکی پھلکی ورزش کرتی تھی۔ اس  
صبح رکھ رکھاؤ سے اپنے جسم کو اور کتابوں سے ذہانت کو چمکانے

گلی تھی۔

شرافت پہلے دو تین مہینوں میں آتا تھا۔ پھر ہر ماہ آتے لٹائل  
کی چار دیواری میں رہ کر اس کے حسن و شباب میں روز بروز گھٹا

آ رہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر وہ باڈلا ہو رہا تھا۔ انکور کے خوشے میں  
دالے دالے رہ کر بھر رہا تھا اور لومڑی کے ہاتھ سلاخوں کے اندر  
نہیں پہنچ رہے تھے۔ انکور کو کہنے نہیں کر سکتا تھا۔ انکور لومڑی



سلطان نے پہلے سر جھکایا پھر دوسری طرف متنبہ پھیر لیا۔ سر جھکا کر یہ سمجھایا کہ شرمناک ہے اور منہ پھیر کر چہرے سے ظاہر ہونے والی نفرت کو چھپا لیا۔

ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ شرافت چلا گیا۔ وہ نکلتے نکلتے ہی بچھلے کئی ماہ سے ماں باپ سمجھا رہے تھے۔ ماں نے سمجھایا تھا۔ ”بیٹی! یہ نہ سوچ کہ شرافت میں شرافت نہیں ہے۔ وہ ایک اچھا انسان بھی ہے۔ تمہاری طرف سے کوئی اپنائیت نہیں ہے۔ پھر بھی وہ تمہارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔“

باپ نے سمجھایا ”جیل میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے شرافت کے ساتھ زندگی گزارنا۔ تم شادی کے لئے پاں کر دو گی تو وہ تمہاری رہائی کے لئے اپنا سب کچھ دانہ لگا دے گا۔“

یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس کے پاں کہہ دینے سے شرافت اسے ہر حال میں حاصل کرے گا۔ دانشمندی بھی یکنی تھی کہ جیل میں زندگی بھاری نہ کرے۔ باہر آکر آزادی کی قیمت شرافت کو ادا کرے۔

تین ماہ اور گزر گئے۔ عام انتخابات ہوئے۔ شرافت اپنے طبقے سے بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ اب اسمبلی میں جو اپنی بھاری اکثریت ثابت کرنا وہی اقتدار میں آکر اپنی حکومت بنا سکا تھا۔ دو پارٹیوں میں زبردست مقابلہ تھا۔ دونوں پارٹیاں آزاد امیدواروں کو خریدنے میں مصروف ہو گئیں جو الیکشن کے کامیاب ہو گئے تھے۔ ایسے وقت شرافت جیل میں ملاقات کے لئے آیا۔ اس کے ساتھ سلطان کے والدین بھی تھے۔ اس نے کہا سلطان! میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہو گیا ہوں۔ سیاسی پارٹیاں اپنی اپنی حکومت بنانے میں میرے ایک ووٹ کی ایک حمایت کی بھوک ہیں۔ میں کسی بھی پارٹی کا ساتھ دے کر اپنے بیٹے بیٹے مطالبات منوا سکتا ہوں۔ تم مان جاؤ تو میں تمہاری رہائی کا مطالبہ منوا لوں گا۔“

سلطان نے پوچھا ”کیا تم عدالت کا فیصلہ بدل سکو گے؟“  
 میں تمہارے کیس کو عدالت میں اپ بچھنے ہی نہیں دوں گا۔ تم سیاست کو نہیں سمجھو گی، صرف میری محبت کو سمجھو۔“  
 ماں نے کہا ”بیٹی! ہاں کہہ دو۔ میں اور تمہارے ابا جی اسی لئے شرافت کے ساتھ آئے ہیں کہ ابھی نکاح اور رہنمائی کی باتیں مقرر ہو جائیں۔“

شرافت نے کہا ”میں بھی میں نہیں جانتا کس سیاسی پارٹی سے بھرتے میں کتنے دن لگیں گے اور کس دن تمہیں رہائی ملے گی۔ لیکن جس دن بھی تم رہا ہو کر باہر آؤ گی اس کے دوسرے دن میری دلہن بن جاؤ گی۔ بولو منظور ہے؟“

سلطان نے سر کو جھکایا۔ باپ نے کہا ”بیٹی! ہاں کہہ دو۔ شرافت کی محبت اور محبت کو دیکھو۔ یہ ایم این اے ہو گیا ہے۔ اپنے آس پاس کی اندھیری آبادیوں میں بجلی لا سکتا ہے۔ کسانوں

کے لئے کھیتے یا پھلے ہو سکتے ہیں لیکن کوئی کے لئے شراب پھرتے ہیں۔ اور کیا قیامت تھی کہ آنکھوں کے سامنے شراب پر پاندھی لگی ہوئی تھی۔

اسے بھرے کے اندر دیکھتے دیکھتے تین برس گزر گئے۔ وہ آہستہ آہستہ سووم ہو رہی تھی۔ شرافت نے جسم کھالی تھی کہ شیخ کاوس کے اندر نہ کر پھیل جائے، اپنی عمر تمام کر لے کوئی بات نہیں۔ وہ اس کی روشنی اس وقت تک کاوس کے باہر سے دیکھتا رہے گا جب تک شیخ اس کی خواہش میں روشن ہونے کے لئے راضی نہ ہوگی۔ اور اب آثار قارہ ہے تھے کہ وہ رفتہ رفتہ اس کی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تین برس آٹھ ماہ گزر گئے۔ ایک دن شرافت نے آکر کہا ہم جب سے مسکرا کر رہنے لگی ہو تب سے میرے نصیب سنو نے لگے ہیں۔ تین ماہ بعد الیکشن ہونے والے ہیں۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے میری پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ میرے طبقے میں کوئی میرا مقابلہ کری نہیں سکتا۔ اب تک کسی نے مقابلے پر کسے کی جرات نہیں کی ہے۔“

سلطان نے کہا ”تمہارے بھائی کا انجام دیکھنے کے بعد بھلا کون جرات کرے گا؟“

”تم نے بہت عرصے بعد پھر مجھے ملتا ہوا ہے۔“  
 ”میں قائل کو کہہ رہی ہوں جس نے تمہارے لئے میدان صاف کر دیا۔ کیا تم قائل ہو؟“

”ہرگز نہیں، پتا نہیں تم کیوں مجھ پر شبہ کرتی ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جس نے بھی میرے لئے میدان صاف کیا وہ میرا ہی آدمی ہے اور میں نے ہی سیاسی مفاد کے لئے ایسا کر لیا ہے؟“  
 ”میں تمہارا کہتی ہوں تم خود کہہ جاتے ہو۔ اور جو کہہ جاتے ہو گئے اسے سمجھ پاتے ہو؟“

وہ گڑبڑا گیا۔ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ پتا نہیں کون سی بات کس انداز میں کہہ گیا ہے جس سے وجاہت کا قائل جھٹکنے لگا ہے۔ وہ یوں ”پلیز سلطان! مجھے الجھنا نہ کہو۔ بس اتنا یقین کر لو بہری محبت اور میری سیاست سب تمہارے لئے ہے۔“

”تم نے اب تک میرے لئے کیا کیا ہے؟“  
 ”تمہاری خاطر عدالتی فیصلے کو چیل رہا ہوں۔ پٹی کی تاریخیں بدھواتا جا رہا ہوں۔ جب تک فیصلہ ہو گا تمہارے خلاف ہو گا۔ سزائے موت ہو گی یا عمر قید۔“

”چار برس ہونے کو ہیں اور کب تک فیصلے کو مالتے رہو گے؟“

”ہم جاگیر دار ہیں۔ دن اور رات کے مقدمات کو آئندہ سطوں تک الجھاتے رہتے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے۔ مجھے الیکشن میں کامیاب ہونے دو پھر میں تمہیں کھن کے پال کی طرح یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ وعدہ کرو میری دلہن بنو گی!“

کے لئے پانی کا مستقل انتظام کرا سکا ہے۔ وہیں والد بھی ہائی اسکول اور کالج بنوا سکا ہے۔ لیکن یہ حکومت بنانے والی پارٹی سے صرف تمہاری رہائی کا مطالبہ کرے گا۔ تم خوش نصیب ہو چکی ہو کہ وہ۔"

سلطانہ نے ہاں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ وہ آہنی سلاخوں کے ادھر تھی۔ ادھر ماں باپ نے شرافت سے بات کی کر دی کہ رہائی کے دوسرے دن وہ برات لائے گا اور ان کی بیٹی کو دلہن بنا کر لے جائے گا۔

رشتے طے ہوتے ہی شرافت نے سیاسی توڑ جوڑ شروع کر دیے۔ وہیں والد میں دونوں پارٹیوں کے لیڈر آئے۔ لگے اس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی وٹکنس کرنے لگے۔ وہ ہر پڈر سے کہتا تھا۔ "خدا نے مجھے بہت دولت دی ہے۔ آپ حضرات کے طفیل عزت بھی بہت ہے۔ میرا مطالبہ کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ میں ایک قتل کا مقدمہ ختم کرانا چاہتا ہوں۔"

"ختم ہو جائے گا چودھری صاحب! یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

"مجھے معلوم تو ہو کیسے ختم ہو گا؟"

"بہتر بڑے بڑے لیڈروں کو قتل کیا جاتا ہے۔ ان کے قاتلوں کو سزا نہیں ہوتی۔ ان مقدموں کی قاتلیں ہادی جاتی ہیں یا جلا دی جاتی ہیں۔ آپ کے بھائی کا کیس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

چودھری شرافت غلی نے کہا "میں مانا ہوں ایسا ہوتا ہے لیکن آپ حکومت بنائیں گے تو پولیس آپ کی ہوگی اور مقدمے کی قاتل آپ کے پاس آئے گی۔"

"چودھری صاحب! آپ ہماری حمایت میں تھر دیں ہم ضرور اپنی حکومت بنائیں گے۔ قتل کا مقدمہ اپنے سلی میں طے گا جیسے کبھی تمہاری نہیں۔"

شرافت نے پوچھا "مگر آپ نے اکثریت حاصل نہ کی تو میرا یہ چھوٹا نام... ہرانہ دھرانہ بنائے گا۔ میں ہوا کا سرخ رنگے بنا ہوں۔ اس لئے دشمن زبان حمایت کوں گا۔"

اگر نے دوسری پارٹی کے لیڈر کو بھی اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس کے حلقے میں اٹھائیس ہزار ووٹ تھے۔ انہیں ووٹ دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ شرافت کا کوئی مخالف امیدوار نہیں تھا۔ وہ بلا مقابلہ کامیاب ہوا تھا۔ وہ صرف آزاد امیدوار ہی نہیں تھا بلکہ... مطالبات پورے کرنے کی پابندیوں سے بھی آزاد۔"

اس حلقے میں اگر الیکشن ہوتا اور مقابلہ میں بھی وہ جیت جاتا تب بھی ووٹ دینے والوں کا کوئی مطالبہ پورا نہ کرتا۔ کیونکہ اپنے ہی ایک مطالبے میں الجھا ہوا تھا۔ ویسے بھی سیاست داں وہی ہے جو اپنی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے ہزاروں لاکھوں ووٹوں کی قربانیاں لے کر اسمبلی تک پہنچتا ہے۔ آخر اس نے ایک پارٹی کی حمایت کی

اور اسمبلی میں نگرانِ جماعت کے ساتھ ہو گیا۔ اسے یقین ملا کہ کیا تھا کہ طلبہ و تلامذہ کی اٹھانے کے بعد اس کی ٹرڈ اپری ہو جائے گی۔

اس نے حویلی آگیاں سے کہا "اسی آپ نے بہت مقدمے بازی کر لی۔ اب اسے وکیل کو چھٹی نہ دیں۔"

ماں نے قہقہے سے پوچھا "کیا بات ہے بیٹا اہلے تم نے مقدمے کی حالت نہیں کی تھی۔ اب وکیل کی فیس تمہیں نہیں ہماری پڑ رہی ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "وکیل ہم دونوں سے الگ الگ فیس وصول کرتا تھا۔ آپ سے مقدمے بازی کی فیس اور مجھ سے پیشی کی فیس۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں نے اور مقدمہ جاری رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ سلطانہ آپ کی بہو بننے کے لئے راضی ہو گئی ہے۔"

"جو میرے بیٹے کو کھائی اسے میری ہوسٹ کو۔"

"جو بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا اس رشتے والی ہو کو بھول جائیں۔ اب وہ میری دلہن بن کر آئے والی ہے۔"

ماں کو ایسا لگا جیسے بجلی کا بجھکا ہوا ہو۔ وہ چیخ پڑی "میں بیٹا ایسی بات زبان پر نہ لاؤں۔ اس کے لئے لڑنے لڑنے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹا نہ گیا ہے۔ میرا کلیانہ دہلاؤ۔ اسے اپنے داغ سے نکال دو۔ وہ خواہصورت بٹا ہے۔ میرے بچوں کو کھا جانے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔"

"اسی! آپ خواہ خواہ گھبرا رہی ہیں۔ میں بھائی جان کی طرح شریف اور نادران نہیں ہوں۔ اسے چار برس تک جیل میں رکھ کر ایسا سبق سکھایا ہے کہ وہ تمام عمر میری دکھداری کا ہی سبق پڑھتی رہے گی۔"

"کچھ بھی ہو میں اسے حویلی میں بدداشت نہیں کروں گی۔"

"میں اسی حویلی میں اُسے لاؤں گا۔ اسی کمرے میں اسی بیچ پھنچاؤں گا جہاں اس نے حج حج کر میری زیادتی اور اپنی پارسیاں کا شور مچایا تھا۔ مجھے عیاش اور گناہگار ظاہر کیا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو تریج تریج کر اسے لولہمان کر کے بھی داغ دار رہی۔ میں اسے دلہن بنا کر یہ داغ دھوڑالوں گا کہ میں عیاش تھا میں نے اس پر ظلم کیا تھا۔ نہیں کوئی ظلم ہوا ہوتا تو وہ ظالم سے نکاح قبول نہ کرتی۔ وہ مجھے قبول کر کے پھر اسی حویلی میں آئے گی۔"

چودھراجن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر تائبہ میں سر ہلا کر بولی "ہاں تمہاری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اگر وہ تم سے راضی ہو گئی ہے تو اسے دلہن بنا کر ضرور لاؤ۔ میں خواہ خواہ مقدمے میں وقت اور رقم ضائع کرتی رہی۔ اُسے تو میں ہونا کر خاک میں ملا سکتی ہوں۔"

وہ ہنستا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر جوتوں سمیت ستر گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ پھت کو تھکے ہوئے سوچنے لگا۔

”کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ آپ چودھری کو شیطان  
 کہتے ہوئے بھی شادی کر رہی ہیں۔“  
 ”شیطان سے رشتہ نہ کہو تب بھی وہ ہمارے امور جگہ نہ لیتا  
 ہے۔ کیا تمہارے امور شیطان نہیں ہے؟“  
 ”جی جی نہیں۔“

”کیا میرے لئے نہیں سوچ رہے ہو؟“  
 ”تم؟ وہ۔۔۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ میں سوچتا نہیں چاہتا  
 مگر سوچتا ہوں۔ دیکھنا نہیں چاہتا مگر دیکھتا ہوں۔ پتا نہیں مجھے کیا  
 ہو گیا ہے؟“

”شیطان ہو گیا ہے۔“

بات جی جی جی نہ کہہ نہ بول سکا۔ وہ بولی ”کسی کے امور میں  
 شیطان ہوتا ہے وہ سوچ کر اور دیکھ کر نہ جاتا ہے۔ کسی کے امور  
 مندہ نور شیطان ہوتا ہے وہ جین جینٹ کر حاصل کر لیتا ہے۔“  
 ”آپ درست کہتی ہیں۔ میں آپ کے نیک بڑی کا بیٹا ہوں۔  
 ہمارے خاندان میں موصوفہ بگڑتے ہیں۔ آپ کے چودھریوں والے  
 خاندانوں میں گولیاں چلتی ہیں۔ میں گولوں سے نہیں ڈرتا لیکن  
 حرام موت نہیں مرنا چاہتا اور حرام موت سے کھرانے والے بہل  
 نہیں ہوتے باشعور ہوتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی زندگی کو سنبھال کر  
 رکھتے ہیں۔“

”تم بہت اچھے ہو۔ میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اس  
 لئے ساتھ بیٹھ گئی ہوں۔ تم آسمان سے تارے توڑ کر نہیں لاسکتے  
 لیکن ہاتھوں میں آئینہ لے کر ستاروں کو اپنی گود میں دیکھ سکتے ہو۔  
 بس اسی حد تک دیکھو۔ اور صبر کرو۔“

وہ ہنڈ والی حویلی میں پہنچی تو وہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی  
 تھیں۔ حویلی کو رنگ برنگے گھنٹوں سے سجایا گیا تھا۔ ڈھولک کی  
 گھاپ پر عورتوں کے گیت گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تمام  
 رشتے دار اس کے استقبال کے لئے حویلی سے باہر آگئے تھے۔ ایک  
 تو یہ خوشی تھی کہ وہ جیل سے رہا ہو کر آ رہی ہے، دوسری خوشی اسے  
 دلہن بنا کر رخصت کرنے کی تھی۔ لیکن دلہن بننے والی کے چہرے پر  
 نہ خوشی تھی نہ صدمہ تھا اور نہ ہی وہ شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔  
 اس کے حسین چہرے پر سب مرمر کے موہ تاج گل جیسا سا چھایا  
 ہوا تھا۔

دوسرے دن رات آجی۔ دن کو نکاح ہوا، شام کو رخصتی  
 ہو گئی۔ شرافت کے برائی پچاس راتھیں لے کر آئے تھے۔ سلطانہ  
 کے بچے سے سسرال تک ہوائی قاز کرتے جا رہے تھے۔ وہ  
 گھوٹھ میں چھپی ہوئی شرافت کے ساتھ پھیلی سیٹ پر بیٹھی  
 ہوئی تھی۔ اس نے گھوٹھ کے قریب جگہ جگہ کر اس کے کان میں  
 کہا ”میرے ملتے میں اٹھائیس ہزار روٹ دینے والے ہیں۔ حویلی  
 پہنچے تک یہ میرے وقادار اٹھائیس ہزار گولیاں آسمان کی طرف  
 داغتے رہیں گے اور بھگڑہ ڈالتے رہیں گے۔ میں نے اسٹیبل میں

میرے دماغ میں کیا ہے؟ میرے دماغ میں کچھ ہے جو سلطانہ کو  
 ڈکھانا چاہتا ہے۔ شاید میں اپنی توہین کا بدلہ لے رہا ہوں۔  
 شاید میں اس خوبصورت بلا کا قاتل بن کر بدنامی کا داغ دھو رہا  
 ہوں۔ مگر میں اس کا پورا نہ ہوں۔ اس دیوانگی نے خوب کھیل کھیلا  
 ہے۔ اس کی پار سائی ڈھونگ بن جائے گی۔ میری عیاشی کو اندھا بنی  
 رشتے کا نام لے گا۔ انتقام بھی پورا ہو گا اور وہ مجھے حاصل بھی ہوگی  
 رہے گی۔

وہ ہنڈ والی اور سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور نہ سوتا۔

○●○

سلطانہ نے سوچتے ہوئے سر جھکا کر فرش کی طرف دیکھا اس  
 فرش پر چار برس پہلے وجاہت کی لاش پڑی تھی۔ اس رات کا ایک  
 ایک لمحہ اسے یاد تھا۔ وہ اسی بیچ پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں وجاہت کو  
 گولی لگی۔ وہ گھوٹھ اٹھانے کے بعد اس پر جگہ گیا تھا پھر اس پر  
 سے ہوتا ہوا چنگ کے سرے پر سے لڑھکتا ہوا فرش پر گر پڑا تھا۔  
 اس کے دل سے ایک تو ٹہلی۔ پہلی بار وہ غصے میں ساگ کی  
 بیج چھوڑ کر پھلی گئی تھی۔ وہ سری بار وجاہت بیج کو بیٹھ کے لئے  
 چھوڑ گیا تھا۔ اور وہ لوہاں بار دلہن کے بستر کو شرافت نے آگ لگائی  
 تھی۔

اور کیسی مجبوری اور بد بختی تھی کہ وہ اس آگ لگانے والے  
 کی بیج پر جانے والی تھی۔ وہ بہت شہ نور تھی۔ اقتدار کی کرسی بھی  
 شہ نور ہوتی ہے۔ لیکن اپنے اوپر آکر بیٹھنے والے ظالم کو نہیں  
 روک سکتی۔ وہ بھی شرافت کو نہیں روک سکتی تھی۔  
 وہ بستر پر جگہ کر اسے ایک پھیلی سے سلاتے لگی۔ وہ  
 وجاہت کا بستر تھا۔ آخری بار اسے دیکھنے اور چھونے آئی تھی۔ چار  
 برس میں وہ بستر بدل گیا تھا۔ پھولوں کی پتیاں مرجھا کر ہوا میں اڑ گئی  
 تھی اور وہاں اچھی خاصی گرد جم گئی تھی۔ وہ اپنا میک اپ کس لے  
 کر وہاں سے اٹھ گئی۔ موہ ساگ کے کمرے سے نکل کر بیڑھیوں  
 اترنے کے بعد کوٹھی کے خلف حصوں سے گزرتی ہوئی باہر آئی۔  
 باہر اس کے نیک بڑی کا جہان بیٹا اس کا بھکر تھا۔

بلال نے اس کے لئے کار کا پھٹلا دودھانہ کھول دیا۔ وہ کوٹھی  
 کے برآمدے سے اتر کر گاڑی کے پاس آئی پھر اگلا دودھانہ کھول کر  
 بیٹھ گئی۔ بلال نے خوش ہو کر پچھلے دودھانے کو بند کیا۔ پھر تیزی  
 سے چلا ہوا آکر اس کے برابر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار  
 اشارت کرتے ہوئے یوں اٹھیں ملازم کا بیٹا ہوں۔ آپ کو ماگن کی  
 طرح پھیلی سیٹ پر بیٹھنا چاہئے تھا۔“

وہ عادت کے مطابق خاموش رہی۔ اس نے کہا ”آپ نے  
 یہاں آتے وقت اور اب جاتے وقت میرے ساتھ بیٹھ کر مجھے  
 آسمان پر پہنچا دیا ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی ”کل میں دلہن بن کر جاؤں گی  
 تو میرے ساتھ ایک شیطان بیٹھا ہو گا۔ تم تو خیر انسان ہو۔“



سے یہ جھکی ہوئی تھی۔

مگر یہ کیا حماقت ہے؟ مجھے جھکی پہنا کر تمہیں کیا ملے گا؟  
اس نے سنا کر میرے میک اپ بکس اٹھا کر ایک میسر رکھا۔  
پھر اس کا لاک کھولتے ہوئے بولی "دلہن کے ساتھ اس کے بیٹے  
سے بھٹی بکس آتا ہے۔ میں نے رہائی سے پہلے ہی اپنے سیکرٹری  
کے ذریعے بھٹی بکس کا انتظام کرایا تھا۔"

اس نے بکس کے اندر سے لوشن کریم، شیمپو اور بیری آئل کی  
شیشیاں نکالیں۔ پھر ایک بیری آئل کی بوتل کھول کر بولی "ان تمام  
شیشیوں میں ہنڈل ہے۔ ذرا سو گھم لو۔"

اس نے تھوڑا سا ہنڈل اس کی طرف چھڑک دیا۔ وہ گھبرا کر  
بولی "نہیں! اتنی تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ تو اسے کہتے ہیں جو ابھی پرانہ ہوا ہو اور دل ہی میں  
رہ گیا ہو۔ جیسے مجھے حاصل کرنے کا ارادہ تمہارے دل میں رہ گیا۔  
دلہن ہے، پھولوں کی بیج ہے، بند کرنا ہے، تمہیں ارادے سے کوئی باز  
نہیں رکھ سکتا تھا لیکن میرے بیٹے سے یہاں تک اٹھا نہیں  
بزار گولیاں برسانے والے! تمہارا ارادہ صرف ارادہ ہی رہ گیا اور  
میں جو کہنے والی ہوں اس سے مجھے کوئی باز نہیں رکھ سکے گا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین  
نہیں آ رہا تھا کہ ہریازی جینے والا، ہر میدان مارنے والا، اسمبلی میں  
کھینچنے والا، عدالت میں پہنچنے والے مقدمے کو مٹا دینے والا ایک  
عورت کے بستر پر مات کھا جائے گا۔

اور یہ بھی ایک خواب سا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ہی حویلی کے  
ایک کمرے میں یوں بے بس ہو جائے گا۔ ابھی آٹھ کھلے گی تو خواب  
ٹوٹ جائے گا اور سلطانہ کی جوانی اپنے بازوؤں میں کٹی ہوئی ملے  
گی۔

سلطانہ کھلی ہوئی شیشی ہاتھ میں لئے دروازے کے پاس آئی۔  
وہ اندر سے اچھی طرح بند تھا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ مارتے  
ہوئے آواز دی "اے چودھرائن! میری آواز سن رہی ہے؟"

دروازے کے دوسری طرف سے چودھرائن نے کہا "اری  
بے شرم! پہلی رات اپنے کمرے سے بول رہی ہے۔"

سلطانہ نے کہا "یہ دلہن کی پہلی رات نہیں ہے۔ تو اپنے مردہ  
بیٹے کی بسوکی آواز سن رہی ہے اور اب زندہ بیٹے کی دم توڑتی ہوئی  
آواز سنے گی۔"

شرافت نے جھکی والے ہاتھ کو جھٹکے دیتے ہوئے چیخ کر کہا۔  
"اے! میں مصیبت میں ہوں۔ ہمارے بندوں کو بلاؤ اور یہ دروازہ  
توڑ ڈالو۔"

سلطانہ نے ساگ کی بیج پر ہنڈل چھڑکتے ہوئے کہا "پہلی ماں  
سے کہو، دروازے کو کوئی نہ توڑے۔ ورنہ یہ ٹوٹنے سے پہلے تم  
زندگی سے ٹوٹ جاؤ گے۔ یہ بچہ بھی سمجھتا ہے کہ آگ لگتی تیزی  
سے جلاتی ہے۔"

وہ دوسری شیشی کھول کر اس پر ہنڈل چھڑکتے گی۔ وہ لپک  
لپک کر سلطانہ کی طرف بڑھنا اور اسے پکڑنا چاہتا تھا مگر جھکی  
رک رک رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا "اے! کسی کو نہ بلاؤ۔ کوئی  
دروازہ نہ توڑے۔ یہ پاگل ہو گئی ہے۔ آگ لگا رہی ہے۔ میں جل  
جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ کسی کو دروازے کے پاس نہ آنے دو۔  
سلطانہ! میری سلطانہ! مجھے غلا نہ سمجھو۔ میں تم سے محبت کرتا  
ہوں۔ تمہارا دروازہ نہ ہول۔"

باہر سے ماں نے کہا "اے! عورت کے نظام تو اس کے  
سامنے کھینچ کر رکھا گیا ہے۔ اسے جوئے مار کر ہار کھیں نہیں بلاتے؟"  
شرافت جواب دینا چاہتا تھا اس وقت سلطانہ نے ماچس کی  
ایک تلی جلائی۔ وہ طلق پھاڑ کر چیخے ہوئے بولا "نہیں سلطانہ!  
اسے بچھاؤ۔ دیکھو اسے بستر کے پاس نہ لاؤ۔"

"لاؤں گی تو کیا ہوگا؟ بستر میں آگ لگ جائے گی؟ یہ آگ تو  
میرے ساگ کی پہلی رات کو تمہارے لگائی تھی۔ میں بستر سو رہا ہوں  
گئی، فرش پر سوتے گی۔ دوسری بار وہ جاہت نے پھر مجھے پھولوں کی  
بیج پر پھینچا، تم نے پھر بیج میں آگ لگا دی۔"

"نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"  
وہ دوسری تلی جلاتے ہوئے بولی "اس آگ کے سامنے  
جھوٹ بولو گے؟"

"نہیں۔ تلی پھینک دو۔ میں نے قتل کیا تھا۔ مگر  
تمہارے لئے کیا تھا۔ میری دیوانگی کو سمجھو۔ میں نے جو بھی کیا،  
تمہیں حاصل کرنے کے لئے کیا۔"

وہ تیسری تلی جلا کر بستر آئی پھر اس کے پہلو میں لپٹے ہوئے  
بولی "آؤ مجھے حاصل کر لو۔"

اس نے تلی والے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ ہٹا کر  
بولی "یہ بچنے سے پہلے بستر گر پڑے گی۔ تلی کو نہ دیکھو۔ ہوس کو  
دیکھو، اقتدار کو دیکھو۔ میں تمہاری کرسی جلا رہی ہوں۔ تم اسمبلی  
تک نہیں پہنچ سکو گے۔ شعلوں کی بیج جاری ہوں، کسی بیوہ کی جوانی  
کو پانسیں سکو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے جلتی ہوئی تلی بستر پر چھوڑ دی۔ یکبارگی  
شعلے بھڑک گئے۔ وہ چپخٹے لگا۔ جھکی کو جھٹکے دے دے کر دوسرے  
ہاتھ سے سلطانہ کو مارنے لگا۔ اس کی چیخوں کے دوران باہر سے  
دروازہ پھٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہی ہوتا ہے، باہر سے مت  
شور اٹھا کرتا ہے، باہر سے مت آگ لگا کر لے لیکن اندر کی آگ  
دکھائی نہیں دیتی۔ اندر کا شور سنائی نہیں دیتا۔ کبھی کبھی ہاں۔  
کبھی کبھی اندر کی آواز اور اندر کی آگ بھڑکتے بھڑکتے بند  
دروازے کو توڑ کر باہر آجاتی ہے۔

جب دروازہ جل کر گر بڑا تب چودھرائن نے دیکھا، ہونے  
بیٹے کا بستر گرم رکھا تھا باقی سب کچھ لٹکا ہوا تھا۔



# ایجوکیشن



طرف دیکھتے ہوئے کہا: کیا اتنے بڑے صدمے کو آسانی سے قبول کیا جا سکتا ہے؟

”یوشو... یوشو... کی کار ڈارنگ یو آر پرا اینف: شیراز بولے۔“

”نہیں... نہیں رازی... میں اتنی بہادر نہیں ہوں... میں نے صدمے سے لڑ کھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔“

شیراز نے ایک بس سانس کی پنی اور بچے یوں لگا جیسے ان کی یہ سانس رخ کی مانند میرے دل میں اترتی چلی گئی ہوا انہوں نے دھیرے سے پھر پھاٹا نہ تھمتھا یا اور یوں جیسے کسی معصوم بچے کو اس کا کلونا ٹوٹ جانے پر ہلایا کرتے ہیں بولے: ”اگر تم چاہو گی تو ہم کوئی بچہ ڈو پٹ کر لیں گے۔“

”کیا اڈو پٹنے کے کو اپنے سینے سے لگا کر میں وہ گرمی پاسکوں گی رازی... نہیں... نہیں رازی... ہرگز نہیں... مجھے اپنا بچہ چاہیے... تم جانتے ہو... تم تو جانتے ہونا کہ مجھے بچوں سے کتنا پیار ہے لا میں صدمے سے بے حال ہو رہی تھی۔“

”آئی تو... آئی تو... مگر خدا اپنے بندوں کو آزماتا بھی تو ہے۔“

”ایسی آرائش آ میری آواز طلق میں چھنس کر رہی اور میں اپنا چہرہ انہوں سے چھپا کر سکتے تھی۔“

”فارگا ڈیک یعنی؟ شیراز لہجہ سے بولے۔“

”پنیر اپنیر لڈکی ایسے جی بھر کر دو لینے دیں وہ نہ میں پاگل ہو جاؤں گی... میں نے اپنے بال پوری شدت سے دونوں انہوں میں دلہرا لیے۔ اس وقت میں خود کو شدید ذہنی زہبان سے دوچار پارہی تھی۔“

”لو کے... لو کے... اگر تم یہ کہتی ہو کہ رو لینے سے تمہیں کہ سکون مل سکتا ہے تو رو لو۔ میں کہے کا اندازہ بند کیے دیتا ہوں تاکہ ملازموں میں سے کوئی تمہیں روٹے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ تم جانتی ہونا گھر کے ملازم تو رائی کا پہلا اور فلاسی بات کھانا بنا لیتے ہیں... وی شدہا کیئر فل: یہ کہتے ہوئے شیراز اٹھے اور انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد کھڑکیوں کے پردے کھینچ لیے۔“

”کمرے میں نیم تاری سی پھیل گئی۔ بچے یوں لگا جیسے میں گھٹا ٹوٹ اندھیلوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔ سفید لفافہ میری اسٹوش میں پڑا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرنے والے آنسو اس لفافے کو جگوتے چلے جا رہے تھے۔“

نے پرا امید نگاہوں سے شیراز

ہیاز سے کی طرف دیکھا انہوں نے اپنے برلیک کس سے بڑے سائز کا ایک سفید لفافہ نکال کر

ہیوس سے میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اندازتے پکھاتے ہاتھوں سے لفافہ تمام پر شیراز کے چہرے پر کھینچا جیسے

ان سے کچھ پوچھنے کی اہلیت نہ دے رہی تھی۔ ان کے چہرے کے اجازت سے بچے سب کچھ بتا دیا تھا وہ سب کچھ

جسے انفاذ کی صورت میں صفحہ کا پھٹا نہ حوصلہ تھا نہ یارا۔ بے اختیار میری آنکھیں بھر گئیں اور ایک دہلی دہلی سی آہ مریا

بسل کی مانند میرے سینے میں پھٹ پھٹ کر رہ گئی یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ میں... میں جسے پھولوں،

خوشبوؤں اور پھولوں سے عشق تھا، شادی کے سات بری گور جلسے کے بعد بھی خبر زمین کی طرح بے آب و گیاہ تھی۔

”کیا... کیا ہوا... رازی...؟ میں نے گھٹس گھٹس آواز میں پوچھا۔“

شیراز جو سر جھکائے افسردہ اور ملاوس بیٹھے تھے، گھیر لہجے میں بولے: ”تم خود دیکھو لو۔“

میں انہیں کیسے بتاتی کہ مجھ میں اتنی بہت نہ تھی کہ میں اس سفید لفافے سے اپنی تقدیر کا فیصلہ نکال کر پڑھ سکتی۔

اس لفافے میں میڈیکل رپورٹ تھی جسے میں لفافے سے نکالے پتا شیراز کے فاسٹ اور ملاوس چہرے پر پڑھ سکتی تھی۔

میرے دل کی حالت ان کی تھی پھر کب بیک جانے کہاں سے دھیروں دکھواں سائیرے طلق میں بھر گیا۔ میں نے

دندیدہ نگاہوں سے اپنے دو برو بیٹھے شیراز کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اند میرے طہین آنسوؤں کی ایک ٹپک حائل ہو گئی ہو۔

ہاں وہ آنسو ہی تھے۔ میری تیرہ بختی پر میری آنکھوں سے بننے والے آنسو۔

میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ شیراز اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب بہت قریب آ بیٹھے اور میرے شانوں

پر اپنا بھاری بھر کم بازو دھاڑ کر دیا پھر اپنے ہاتھ سے میرا شانہ دھیرے دھیرے تھمتھاتے ہوئے بولے: ”کیک پٹ

ایزی... میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے بچے کی نہیں تمہاری ضرورت ہے تم ماں نہیں بن سکتیں نہ ہی۔ آئی

ڈونٹ مائند۔“

”رازی... میں نے زخم خوردہ نگاہوں سے ان کی

اس نفاذ میں میری تقدیر کا فیصلہ تھا۔

میری بد قسمتی وراثت بکوسے بھر پھنس رہی تھی۔

اور میں سوچ رہی تھی اس ایک محرومی کے جس نے مجھ سے زندگی سے اس کا تمام تر حسن چھین لیا تھا۔ میں جہلپنہ آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھا کرتی تھی، اس وقت لپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ تیرہ بخت عورت محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں شیراز کو جنھوں نے مجھے ہر ملکن آسان فریج کی تھی مجھے محبت اور چاہت نہیں مانول دولت سے نوازا تھا کہ نہ وہ سکون کی بجائے کچھ کے لئے رہا تھا۔ میں ان سے نکاح میں ملانے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی اور کسی مجرم کی طرح سر جھکانے بیٹھی تھی۔

کاشش!

کاش! کوئی معجزہ مجھے سرخرو کر سکتا۔



شیراز سے میری پہلی ملاقات یونیورسٹی کے پریس ماحول میں ہوئی تھی۔ میں ہفتہ واری چھٹی بجیا کے سنگ گزرنے کے لیے ہاشل سے شہر جانے کو نکل تھی اور بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک چمکیلی گاڑی زوردار دھچکے کے ساتھ میرے قریب آئی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ایک نوجوان نے گردن کھڑکی سے نکلتے ہوئے بڑی تندی سے کہا کہ ساتھ پوچھا۔

”مخترمہ! آپ کہاں جائیں گی؟“

میں جو اتنی کی موت، اب تو کی دوسری شادی، سوئی ماں کی زیادتیوں اور اب تو کی بے اعتنائی کے سبب ان دنوں بڑی مضحکہ خیز اور تلخ گو ہو چکی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کی وجہ سے رن بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے جلتے جھننے لہجے میں بولے: ”جہنم میں!“

وہ مسکرایا اور خوشگوار لہجے میں بولا: ”مگر آپ اجازت دیں تو میں چھوڑ دوں آپ کو جہنم تک!“

”جی نہیں شکریہ... میں خود چلی جاؤں گی“

”جہنم تک!“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے ان سنی کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے مگر اس کی کار ریگتے ہوئے پھر میرے نزدیک اس طور آئی کہ اب کی بار میرا راستہ رک گیا۔

”ویسے بظاہر تو آپ کا تعلق فردوس بریں سے لگتا ہے، وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

میں نے اسے بری طرح گھورا۔

”فردوس کے بارے میں تو ہم نے ہی سنا اور پڑھا ہے

کہ وہ جنت میں رہا کرتی ہیں، اس نے کہا۔

”ایڈیٹ! میں نے وراثت پیچھے۔“

”خانا آپ گزرتے ہوئے کبھی نہیں ہیں، اس کا لہجہ اتنا شیرازہ تھا۔“

”مطلب سب سے بھی تو پوچھ رہا ہوں؟“

”اشیو پڑا؟ میں نے بیٹنگ کر کہا۔“

”تھینک یو، وہ مسکراتے ہوئے بولا۔“

”آئی دل بلی یو، میں نے پھر وراثت پیچھے۔“

”آپ کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں، ہم تو پہلے ہی مارے گئے ہیں۔“

چارنگ چکے تھے اور یونیورسٹی کی دونوں ماڈرننگ

تھیں، اور میں ہی ہی میں خود کو بڑا جھلا کہتے ہوئے سوچ رہی

تھی کہ اگر میں کچھ دیر قبل حالیہ کے ساتھ ہاشل سے نکال نہ جاتی

تو اس وقت یہ کارٹین آواز گدگداتے سنسنان دیکھ کر بے

یوں تو نہ آگھرتا۔

”آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”ایڈیٹ!“

”اچھا نام ہے۔“

میں نے کہا جانے والی نظروں سے لے دیکھا اور کرایا

پھر اس نے اسٹریٹنگ لگیل پر اپنی گرفت جھائی اور میرے

باندھن کی جانب جو ایک جلتے کی صورت میرے سینے سے

اٹکی کتابوں اور جرنل کو دبوچے ہوئے تھے دیکھتے ہوئے اس

کا نگہ ہوں میں ایک مخصوص نمکنا بھری اور وہ میری جانب

الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا: ”اوکے مس قرۃ العین،

... بان! ...“

میں جو ہچکچا کر گئی۔

اسے میرا نام کیوں معلوم ہو گیا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ مجھے اپنی اس الجھن کا جواب ملتا وہ

اپنی گاڑی گزار لے گیا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ میرے

باندھن کے جلتے کی جانب اس قدر اٹھا کہ سے کیوں دیکھ رہا

تھا گردن کو دائیں جانب ایک مخصوص زاویے پر جھکا کر دیکھا

اور مجھے اپنی الجھن کا حل مل گیا۔ میرے جرنل پر چڑھے خاک

کا غبار سبز و سفید سے جل جلاوت میں میرا نام لکھا ہوا تھا اور

یوں اسے میرا نام معلوم ہو گیا تھا۔

اس واقعے کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک روز میری

ایک استاد مسز حمیرہ قاسمی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا:

”قرۃ العین! کیا آپ مجھے اپنے والدین سے طوائف پانڈ کوں گی؟“



میں ایک دن ہی سی سرد اور ہرگز گئی پھر ہی سنے  
مردم سڑوں میں سزفاطمی سے کہا: میڈم امیری والدہ تو انتقال  
کر چکی ہیں اور اب تو... وہ... اس شہر میں نہیں رہتے۔

پھر... کہاں رہتے ہیں وہ؟

میں سزفاطمی کو کیسے بتائی کہ وہ جہاں بھی رہتے تھے  
میرے نہیں تھے۔ اتنی کے انتقال کے چھ ماہ بعد ہی انھوں  
نے دوسری شادی کر لی تھی۔ تقریباً تین برس تک میں اور بھیا  
سوتیلی ماں کی زیادتیوں کا شکار بنے رہے پھر جب بھیا کو  
کراچی کے ایک کالج میں ٹیچر شپ مل گئی تو وہ مجھے لے کر آئی  
اور ان کی اظہار کی زندگی سے نکل آئی تھیں۔ یہاں تک میرے  
ہم دونوں بہنیں دو کمروں کے ایک کرائے کے لیٹ میں  
ساتھ رہیں پھر جب مجھے آنرز میں داخلہ مل گیا تو بھیا نے  
لو نیورس ہاسٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا اور خود اپنی  
ایک عمارت میں پکڑ کے ان پر ایک ٹیچر کے طور پر رہنے  
گئیں زندگی کے اس نئے شعبے سے بچانے تو بھوتنا  
کر یا یا شاید وہ ایسا ظاہر کرتی تھیں مگر میں سمجھتا نہ کر پائی۔  
پہلے کے چھ دن ساتویں دن کے انتظار میں گزارنا بڑا ہی  
مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ چھ دن ہاسٹل میں گزارنے کے بعد  
جب میں ساتواں دن بھیا کے سنگ گنارے جاتی تو لمبہ لمبہ  
دکھ کی کہنج میں پھلنے والے دل پر صبر و ضبط کی ٹھنڈی سیل  
دھر کر جاتی۔ میں بھیا کو اپنے دکھ کی جھانک دیکھنے بغیر چوٹی  
کا دن ان کے ساتھ گزارتی اور پھر ہاسٹل واپس آجاتی جہاں  
میری کلاس ٹیچر مجھے مفروضہ بدعلاج اور بد مزاج جیسے خطبات  
سے نوازنے کے لیے میری منتظر ہوتیں۔

ان خطبات سے نوازے جانے کے سلسلے میں  
نہ قصور سہا تھا نہ میری ان ساتھیوں کا جو مجھے مفروضہ بدعلاج  
سمجھا کرتی تھیں بلکہ قصور ان حالات کا تھا جنہوں نے ان  
دونوں مجھے دل دکھتا اور طول کر رکھا تھا۔ میں اتنی کے پیار  
ہتو کی شفقت اور بھیا کی چاہت کے حصار میں رہتی رہی تھی۔  
اتنی کے انتقال کے باعث ان کے پیار اور باتوں کو دوسری  
شادی کے بعد ان کی شفقت سے عروسی کے نتیجے میں میرے  
پاس بچا ہی کیا تھا سولے بچیاں کی چاہت کے۔

چنانچہ جب سزفاطمی نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو  
میں نے آہستہ سے کہا: میڈم! وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔  
کیوں؟

اتنی کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی  
کر لی تھی۔ وہ بہاری سوتیلی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔

اور تم؟

میں یہاں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔

تمہاں سے سڑوست تو بہر حال وہی ہیں نا؟

نہ میڈم... میری سڑوست میری بچیاں ہیں۔

وہ کہاں ہوتی ہیں؟

یہیں کراچی میں رہتی ہیں۔ کالج میں پڑھاتی ہیں۔

کس کالج میں؟

اب میں نہیں نے سزفاطمی کو بھیا کے کالج کا نام بتا

دیا لیکن میں حیران تھی کہ سزفاطمی مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ  
رہی تھیں۔

زیادہ نہیں صرف چند دن بعد ہی مجھ پر سزفاطمی کے

اس تجسس کا سبب اس وقت کھل گیا جب بھیا نے مجھ

سے کہا: "یعنی! تمہاری ایک پروفیسر مجھ سے ملنے میرے

کالج آئی تھیں۔"

میری پروفیسر! میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں... کوئی سزفاطمی ہیں تمہارے پڑھارٹمنٹ میں؟"

جی ہاں۔

وہی آئی تھیں میرے پاس۔

کیوں؟

میرے اس سوال پر بھیا کچھ دیر تو چپ رہیں پھر

حسب عادت اپنے مخصوص لہجے میں بولیں: "وہ اپنے کسی کزن

کے لیے تم میں انٹرنشڈ میں اور مجھے ان کی یہ بات اچھی لگی کہ

گول مول بات کرنے یا ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد اپنے خدا

پر آنے کے بجائے انھوں نے بلا تمہید اپنی آمد کا مقصد

بیان کر دیا۔"

"اومائی گاڈ! تو اس لیے وہ مجھ سے آپ کا محل وقوع

پوچھ رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا تپتا انھوں

نے تم ہی سے معلوم کیا تھا۔ جا رہی وہ دوبارہ آنے کو

کہہ گئی ہیں۔"

کیوں؟

"یہ جاننے کے لیے کہ ہم ان کے دیے ہوئے

پیغام پر غور کر رہے ہیں یا نہیں۔"

"آپ صاف انکار کر دیجیے گا۔ میں نے کڑے

تیوروں سے کہا۔"

کیوں؟

میں نے چونک کر بھیا کی طرف دیکھا پھر کہا: "کیوں کہ

یہ کیوں کر ممکن ہے ؟

لیکن ناممکن ہونے کی کیا بات ؟

اب میں نے متوشش ہو کر بچیا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائیں میری جانب بڑھیں پھر بڑھے چار سے اپنا پایاں بازو میرے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بولیں۔  
 "اڑکے کی تصویر بھی لائی تھیں۔ بڑا اینڈر سٹم اور اسٹارٹ ہے۔ بزنس ریڈ مسٹریٹیشن میں ماسٹر ڈگری لے رکھی ہے، یہاں سے نہیں انگلستان سے اپنا بزنس ہے۔ اڑکے کے والدین حیات نہیں۔ ایک بڑی سبن ہیں جلاسنے میاں اور بچوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہیں۔ مسز فاطمی اڑکے کی بات ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہیں و  
 "بجیا...! میں نے کان کھاتے ہوئے بے بسی سے بچیا کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے آپ کے ارادے نیک نظر نہیں آتے"

بجیا مسکرا دیں پھر بولیں "میرے ارادے بالکل نیک ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے عینی کہ میں تمہیں اپنی سب سے بڑی ذمے داری سمجھتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمہیں جلد از جلد اس منزل پر پہنچا دوں جو ہر اڑکے کی آخری اور سچی منزل ہوتی ہے"

"بجیا! اگر آپ اس منزل کو ہر اڑکے کی آخری اور سچی منزل سمجھتی ہیں تو پہلے خود کیوں نہیں چکھتے ہوں اس منزل سے؟ میں نے کہا۔

"تم میری بات چھوڑ دو" بجیا نے نظریں چرائے کی کوشش کی۔

"ہرگز نہیں" میں جو بجیا سے بے حد تکلف تھا بچل کر بولی۔

"پتینرا! بجیا لجاجت سے بولیں و بہتر ہو گا کہ ہم اصل موضوع سے نہ ہٹیں"

"فی الحال اس موضوع پر گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں" میں نے صاف صاف کہا۔

"کیوں؟"  
 "کیونکہ ابھی میں پریشان ہی ہوں، مجھے ماسٹر ڈگری لینا ہے"

"تعلیم شادی کے بعد ہی جاری رکھی جاسکتی ہے مسز فاطمی تم از خود یہ بات کہہ دی ہے کہ ان کے کزن کا کہنا ہے کہ اگر تم شادی کے بعد بھی سلسلہ تعلیم جاری رکھنا چاہو گی تو

اسے کوئی ترقی نہ ہو گا"

"نہیں... نہیں... ہرگز نہیں بجیا۔ میں فی الحال شادی فادی کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہتی"

"فارمائی ایک عینی؟ بجیا نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے گہری نگاہوں سے بجیا کو دیکھا اور بولی "کیا

میں آپ پر بہت بوجھ بن گئی ہوں؟"

"اوہ نو! بجیا نے مجھے لگے سے لگایا اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولیں "عینی! تمہارے سوا میرے لیے اس دنیا میں ہے ہی کیا"

"تو پھر آپ مجھے اپنے سے دور کوں کر دینا چاہتی ہیں؟ میں نے شاک لہجے میں کہا۔

"دور کہاں... تم تو میرے دل میں رہتی ہو اور سدا بسی رہو گی... کوئی... کوئی بھی تمہیں وہاں سے کبھی بھی بے دخل نہیں کر سکے گا"

"بس تو آپ فوراً سے مسز فاطمی سے لگا کر دیں۔ میں نے بجیا سے کہا۔

وہ کچھ دیر چپ رہیں پھر دھیمے سڑوں میں بولیں۔ "عینی! میں تمہارے لیے اسی انداز میں سوچتی ہوں جس طور

مائیں رہتی پلیوں کے لیے سوچا کرتی ہیں۔ کیا تم مجھے بالوس کرنا پسند کرتی ہو جو تمہاری سبن ہوں مگر ایک ماں کی طرح تم سے پیار کرتی ہوں"

بجیا کی اس جذباتی بات پر میرا ہی سہرا آیا۔ کیسے بتاتی ہیں انہیں کہ میرے لیے بھی دنیا میں اگر کوئی سچی خوشی تھی تو وہ انہی کی ذات تھی۔ ان کی خاطر تو میں ہر ایک اینڈ پر اپنے سارے دکھ اسٹل میں چھوڑ آئی تھی۔

میں کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر میں نے کہا "کیا آپ ایک ایسے شخص سے جسے نہ آپ جانتی ہیں اور نہ میں، میری شادی کر دینا پسند کریں گی؟"

"میں ہر ممکن ذریعے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گی اور مطمئن ہو جانے پر ہی ہاں کروں گی۔ فی الحال تو اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے تمہاری رضاد کار ہے"

"اور اب تو کی رضاد؟"

میرے اس سوال پر بجیا کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا پھر وہ بوجھل آواز میں بولیں "ہم اب تو کی زندگی سے نکل آئے ہیں عینی اور شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے ورنہ

گزشتہ دو ڈھائی برسوں میں وہ کبھی تو ہماری غیر غم لینے آتے"

میرے اس سوال پر بجیا کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا پھر وہ بوجھل آواز میں بولیں "ہم اب تو کی زندگی سے نکل آئے ہیں عینی اور شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے ورنہ

گزشتہ دو ڈھائی برسوں میں وہ کبھی تو ہماری غیر غم لینے آتے"

میرے اس سوال پر بجیا کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا پھر وہ بوجھل آواز میں بولیں "ہم اب تو کی زندگی سے نکل آئے ہیں عینی اور شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے ورنہ

بھی چپ ہمدی ۔

بھیانے غلط تو نہ کہتا تھا ۔

بالآخر میں نے بھیا کے اصرار اور منت کے کنگے گھنٹے

ٹھیک دیے ۔

پھر بھیا اور منرفا ملی کی دوسرے تیسرے دن ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بھیا نے مختلف حکمتوں ذریعے سے منرفا ملی کے کزن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ میرا خیال تھا سب دستور بگھے موصوف کی جانب سے بڑی قیوت حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے ہائے سہ جا پڑے گا۔ گویا شاید کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ ایسے کسی مرحلے کی نوبت نہ آنے پائی البتہ ان کی تصویر بھیا نے ایک سبب سے منرفا ملی میں میرے حوالے فرود رکھی تھی۔ نے اس وقت بھیا کو واپس لوٹانے ہونے کہا۔

”بگھے تصویر دھو کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے“

”کیوں؟“ بھیا نے تظاہر سے میری جانب دیکھا غالباً وہ بے اندازہ کرنا چاہتی تھیں کہ میں نے یہ بات خفا ہو کر تو نہ کہی تھی۔

بھیا کے اطمینان کے لیے مجھے مسکنا پڑا۔

”تصویر دیکھنے کی ضرورت کیوں نہیں؟ بھیا نے پیار سے پوچھا۔

”کیونکہ... مجھے آپ کی پسند پر پورا اعتماد ہے“

”تھینک یو ڈیئر۔ بھیا نے کہا۔

اور بھیا پر میرا اعتماد سونی صدیوں تک ثابت ہوا۔

شب عروسی رونمائی کے موقع پر صبح شیر نے میرا گلوگٹ سرکار میری ٹھوڑی تھامتے ہوئے میرا چہرہ اونچا کیا تو میری پلکوں پر لرزش تھی اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے بے پائل گزر گئے پھر میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔

”میں نے غلط تو نہ کہا تھا اس دن کہ آپ کا تعلق تو فردوس بیوی سے لگتا ہے“

گھبرا کر میں نے پلکوں کی چلنیں اٹھا دیں۔

اوہ!

یہ تو وہی تھا۔

وہی جو ایک روز چھپائی دھوپ میں اپنی کار سے نزدیک روک کر لولا تھا ”عزیز! آپ کہاں ہائیں گے؟“ اور میں نے جلتے جلتے لہجے میں جواب دیا تھا ”جہنم میں“ مگر اس وقت میں خود کو جنت میں موجود پارہی تھی۔

بشم سے ہی شانہ انداز میں سجاوٹ کے پیشتر سے رخ ہوتا ہوا کمرہ بلا شہر چھوٹی سی جنت گاہ رہا تھا اور پوچھنے لگا ”میں کون سے بس اسٹاپ کو جانے والا رہتا ہوں؟“ پھر ایک ہی سے اگلے دن والا وہ نوجوان اس وقت شہزادوں کی دیوانہ پرت پرے پہلے زندگی کے ایک نئے راستے پر پہلا قدم اٹھانے کے لیے میری جانب اٹھ کر بیٹھے کھڑا تھا۔

پھر زندگی کس نظر دو شہزادہ کی مانند اپنی پادشاہی چھٹکانی نئے راستوں پر چل دی۔ میں خوش تھی بے پناہ خوش! میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ زندگی ایک ایک اس قدر تیز اور آسانی سے مرہاں ہو جائے گی کہ میں اپنے سارے دکھ و غم پر پیر کی صورت بھول جاؤں گی۔ عروسیوں کا رگہ بانا ہے گاندھ شب بدل جائیں گے... اور... اور... شیراز کی محبت کے سامنے بھیا کی جاہت ثمنوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔

شیراز مجھے اس قدر چاہتے تھے کہ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتی تھی۔ دو پہر پیر، لوگر چاکر، آسٹیش، ایک چاہنے والا مرد جو میرا اپنا تھا بلا شرکت غیرے میرا اپنا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں جب ہم دونوں کو دیکھیں تو رنگ سے لہو نہ ہو جاتیں۔ اپنے حلقہ آداب میں ہمارا جوڑا مثال جڑا کہلاتا۔ ہم دونوں اکٹھے جس محفل میں جاتے مرکز نگاہ بن جاتے۔ بقول بھیا کے ہماری جوڑی پانڈ سوری کی جوڑی تھی۔ شیراز واقعی جیسے وکیل مرد تھے جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں کبیر نفس سے کام لے لے بغیر یہ کہوں گی کہ میں بگائیں اور پکڑشش تھی۔

تین چار برس تو سرد و کیف کے عالم میں گزرتے پھر مجھے ایک فلائیک کی احساس گاہے گاہے ستانے لگا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا۔ یہ از یاد تروتقت یہ سوچتے ہوئے گزرنے لگا کہ اگر ہمارے گھر میں ایک دو اور بھرتوں بچے قلعہ میں مارے پھرنے لگیں تو زندگی اور حین ہو جائے۔ میں بچے میں بہت کافی بگھتی تھی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ان ایک بن کے تاز اٹھانے کے لیے دو بھائی تو ہونے چاہئیں۔

پانچواں برس بھی بے طر گزر گیا تو مجھے فکر کے ساتھ بگھ دھشت سی بھی ہونے لگی اور میں گاہے گاہے اس دھشت اور فکر کا اظہار شیراز پر بھی کرنے لگی۔ شیراز میری پریشانی پر مسکراتے اور اکثر کہتے ”بھئی! ایسی جلدی بھی کیا ہے بھیا ہے... اچھا ہے جتنی دیر ہو کیونکہ پھر تم ہم پر توجہ کہاں دو گی“

• دیکھو بازی ایسا بھی بات نہیں ہے کہ تم ہاں سے چھوڑ  
کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ان سے جاملے جو  
میں منبرنا کر گیتی۔

• سو ری میم : وہ مسکانے لگتے۔

اور میں یہ سوچ کر کہ شیراز کتنے اچھے ہیں کس قدر محبت  
کرتے ہیں مجھ سے کہ میری شکل خواہ بناوٹی سی، خدا بڑا نہیں  
مناتے میں بڑے جذباتی لہجے میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی کہ  
میری زندگی میں ان کا مقام اور ان کی اہمیت سدا یکساں رہے  
گی۔ وہ ہمیشہ میرے من مندر کے دلوی تار میں گئے ان کی محبت  
کا پرچم سدا میری قلم رٹے دل پر لہراتا رہے گا۔

جب کبھی شیراز مجھ اس سلسلے میں زیادہ مشکلا اور  
مفہوم پاتے تو مجھے دلا سے دینے بیٹھ جاتے : یعنی باتم  
نکر مند کیوں ہوتی ہو۔ پانچ چھ برس کوئی غیر معمولی دیر تو نہیں۔  
بعض بچے تو اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ ہندہ ہندہ میں میں  
سال انتظار کرواتے ہیں اپنے والدین کو :۔

”خدا نہ کہے... خدا نہ کرے رازی... میں ہول  
کے رہ جاتی : میں اتنا لمبا انتظار نہ کر سکوں گی۔ میں ٹھکنے  
سے پہلے اپنے بچوں کو جو ان کی کھنا چاہتی ہوں وہ میں نہیں  
چاہتی کہ لوگ مجھے میرے بچوں کی نانی یا دادی سمجھیں۔ میں  
چاہتی ہوں وہ فخر سے اپنے دستوں کو بتائیں کہ یہ گریس فل  
جوڑا ان کے جی اور سپا پاپا ہیں“

”ڈومٹ دری یعنی... میں تو خیر ساٹھ برس کی عمر  
تک جوان رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم... تم ان صورتوں  
میں سے جو جو سلا پر بہا رہتی ہیں :۔

شیراز کی اس بات پر مجھے بے اختیار اپنے کالج کی  
ایک ٹیکو رجو بھی سیکنڈ ایئر میں اردو پڑھا یا کرتی تھیں، یاد  
آنے لگتیں۔ انہوں نے ایک راز کلاس لینے کے بعد حیرت  
سی باتیں کرتے ہوئے نہ بلکہ کس بات پر کہا تھا۔

”محبت پر خزاں آتے دیر ہی کتنی گنتی ہے۔ حالات کھینک  
تھپیر اس سے رنگ روپ، جوانی سب کچھ چھین لے جاتا ہے  
ہماری شادی کی چھٹی سالگرہ کے چند دن بعد ہی بچیا بھی  
اس منزل سے ہٹنا ہو گئیں جسے وہ ہر لڑکی کی آخری اور سچی  
منزل سمجھا کرتی تھیں۔ کسی سیمینار میں ان کی ملاقات کینیڈا سے  
آئے ہوئے ایک پاکستانی خزاں پر ویسے سے ہوئی جو کینیڈا کی  
ایک یونیورسٹی سے ہمیشیت ایک ریاضی دان والی تھی شادی  
غلطے طیر ریٹائی انداز میں ہوئی۔ قطعاً ساڈل سے نکاح ہوا  
اور دولہا بھائی بچیا کو ان کی اس مانیکی سے جہاں وہ پرائیگ

گیٹ کے طہر پر مار کر تین زحمت کر کے ایک نایاب  
اشاد ہوش کے ایک کورہ میں نہ لگے چہرہ ہاں سے وہ  
انہیں اپنے بھائی کے گھر لے گئے۔ چند دن بچیا کو لپٹے چڑھ  
کے ہاں رہنا پڑا۔ دولہا بھائی نے کینیڈا جاتے ہی بچیا کو  
کینیڈا بولنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس ضمن میں بچیا کو دو  
تین مرتبہ اسلام آباد بھی جانا پڑا اور بالآخر وہ کینیڈا سہارا گئیں۔  
میں ان کے اتنی دودھ چلے ہلنے سے وقتی طور پر نذر و طول ہوئی  
لیکن پھر اس طمانیت نے طال کی جگہ لی کہ بچیا اس منزل  
سے ہٹنا ہو گئی تھیں جسے وہ ہر لڑکی کی آخری اور سچی منزل سمجھا  
کرتی تھیں۔

دعا اور دولہ کے باوجود شادی کے ساتویں برس بھی  
لپٹے آگن میں کوئی پھول کھلنے کی امید نہ پا کر میں نے شہر کے  
ایک معروف مردگانا کو جو جسٹ ڈاکٹر تھیں سے رجوع کرنے  
کی خواہش کا اظہار کرنے کے سامنے کیا۔ حسب سابق انہوں  
نے پھر مجھے بھالنے اور دلا سے دینے کی کوشش کی مگر اب  
میرے صبر و انتظار کا پیمانہ لہو نہ ہو چکا تھا۔ میں کسی قدر  
چپچپ کی طرح چھٹی گئی۔ ڈاکٹر ہدیہ کا میں نے بہت توفیق سن  
رکھی تھی وہاں اس امر پر انہوں نے اور ہاں سے لپٹے اہماب میں  
دو بے اولاد چڑھنے ان کے زیر علاج رہنے کے بعد بالآخر  
شہر پا چکے تھے جب میں نے شیراز سے لپٹا اس خواہش کا  
اظہار کیا کہ میں بھی ڈاکٹر ہدیہ سے رجوع کرنا چاہتی ہوں تو پہلے  
تو انہوں نے ہلنے کی کوشش کی لیکن میرے انتہائی اصرار پر  
مجبور ہو کر وہ مجھے ڈاکٹر ہدیہ کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر ہدیہ  
نے جلد روئیدار سنی پھر خوشگوار سکھت کے ساتھ بولے۔

”آپ دونوں ہی کے ٹیسٹ لینے ہوں گے :۔

”دونوں کے ؟ شیراز چمکے ان کے لہجے میں حیرت اور  
استفہام کی ملی جلی کیفیت تھی۔

”جی ہاں... ڈاکٹر ہدیہ اسکاٹے پھر لپٹے تو یہی عمل  
میں صورت اگر ایک فریق ہے تو مرد و سزا۔ نفس کیوں ہیں  
ہو سکتا ہے و

شیراز چپ رہے۔

پھر ڈاکٹر ہدیہ نے ہم دونوں کے لیے متعدد لیبارٹری  
ٹیسٹ اور ایکسوز تھری کے اور ہمیں ایک مقامی لیبارٹری سے  
رجوع کرنے کا مشورہ دیا جہاں ایکسے کا بھی معمولی انتظام تھا۔  
ہم دونوں ہی ڈاکٹر ہدیہ کی تجویز کردہ آزمائشوں سے گزے۔  
جس بعد لیبارٹری سے رپورٹ ملنے پر بچیا ایک  
منظوری کیفیت تھی شیراز کہہ گئے تھے کہ لپٹے کے لیے

دفتر سے گھر آتے ہوئے وہ بارش سے روک کر چلتے ہیں  
گے اور شام کو ہم ٹیکسٹر ہیکل کو یہ بارش دکھاتے ان کے ایک  
بائیں گے۔ اس بچے کی طرف سے اس کا باپ اس سے کہتا ہے کہ  
لاہور کا دورہ کر کے گھر سے نکلا ہو۔ میں بارش میں پھلکانی  
اور میری نظروں میں اپنے گھر کے سامنے سے گزرتی ہیں کہ اتنی  
پر شیز کے گاڑی کی تلاش میں وہ تک نکل جاتی ہیں لیکن وہ پر کو  
جب شیز گھر لوٹے تو ان کے ہاتھ خالی تھے میرے انتظار  
پر انھوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ یہاں پہنچے تو پینچ کا  
وقفہ ہو چکا تھا اس وقت بارش دیکھنے والا مگر وہ نہ تھا۔

”پھر اب کیا ہوگا؟ میں نے ٹھوس سے پوچھا۔  
”ہوگا کیا... شیز مسکرائیے پھر بولے: ”میں شام کو  
بارش لیتا ہوں اگر آؤں گا پھر ہم ڈاکٹر کو بلانے کے پاس چلیں گے۔  
کھانا کھاؤ۔ نہ کہ بعد جب شیز واپس جاتے گئے تو  
میں نے کہا: ”میری ایک بارش دکھانے کے لیے میرا دل چاہتا  
ہے اس جانا ضروری ہے؟“  
”نہیں ایش آل... شیز نے کہا پھر وہ لہجہ دونوں  
انھوں کو میرے شانہ پر صحتے ہوئے بولے: ”تم ان پریشان  
کیوں ہو؟“  
”بچہ، ڈرنگ رہا ہے وہی؟ میں نے دھیر سے کہا۔  
”کس بات سے؟“  
”خدا خواہ شیشٹ رہا ہے گڑبڑ ہوئی تو میں مر جاؤں گی۔  
میں نے ان کے سینے سے اپنا سر لگا کر ان آنسوؤں کو ہٹانے  
کی کوشش کی جو یہ اختیار میری آنکھوں میں اتر گئے تھے۔  
”اے! ڈرنگ ہی تو ہے! شیز میری بیٹی تھی چنانچہ گئے  
پھر انھوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھے  
فارغ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”مجھے بچے کو اپنی تھائی  
ضرورت ہے۔“  
”آپ خود ہو کہ بچہ کا ڈرنگ ہو گیا ہے؟ میں نے کہا۔  
”اے... اے... اے... ڈرنگ... شیز نے سکرانے  
ہوئے بلکہ دیکھا۔“

”میرے دل پر جو لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ میں کیسے  
بتاتی شیز کو کہ ایشیں کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں انھیں بہہ جاتے  
کسیے سینٹ اور بھری کی ایک تہ ان کے درمیان فرق پہچانا  
پڑتی ہے تب ہی... تب ہی جنہاں اس تک عورتیں دھرتی  
کے سینے پر ڈر سے زخم سے کھڑی ہو کر آسمان سے نظروں لگتی  
ہیں... میں کیسے کہتی شیز سے کہ اولاد عورت اور مرد کے  
بندھن کو تقویت اور استقامت بخشتی ہے... میں کیسے بتاتی  
انھیں کہ محبت کو بھی پائیداری کے لیے سہارا کی ضرورت  
ہوتی ہے۔“

”کیا کوئی امید نہیں دلائی ڈاکٹر میرا بچہ؟ میں نے  
آنسوؤں سے بھیگی آواز میں پوچھا۔  
شیز نے کوئی جواب نہیں دیا۔  
”پہلے بولو نا۔“

”ہاں، مجھے حوصلہ دینا۔ ہونے تو سن رہی ہیں تو شاید  
میں شیز سے آنکھوں میں نہ ڈال پاتی۔“

شیز نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا کہ اپنا  
دایاں بازو سامان کی صورت مجھ پر تانتے ہوئے لہلہا رہیں۔  
نظر جبر کو میں سن رہی تھی کہ ایک بھوش بھوش کر  
رہی۔ شیز مجھے دلا سندھینے لگا اور اپنی محبت کا یقین دلانے  
لگا۔ مجھے قدر نہ آ رہا تھا اس دلکش ہکشاف نے کہ میں ماں  
بننے کی اہلیت سے محروم تھی میرے سینے میں آگ سی بھری تھی۔  
اگلے صبح شیز کے جانے کے بعد میں نے اس بڑے  
سندھ لگانے کو کھولا اور درمیانہ سائٹ کے دو دروازے  
تھے جن میں سے ایک میں میری ایکسوز تھیں اور عام سائٹ  
کے ایک لہجے لگانے میں یہاں تک پہنچتی تھی اور دوسرے

”پھر اب کیا ہوگا؟ میں نے ٹھوس سے پوچھا۔  
”ہوگا کیا... شیز مسکرائیے پھر بولے: ”میں شام کو  
بارش لیتا ہوں اگر آؤں گا پھر ہم ڈاکٹر کو بلانے کے پاس چلیں گے۔  
کھانا کھاؤ۔ نہ کہ بعد جب شیز واپس جاتے گئے تو  
میں نے کہا: ”میری ایک بارش دکھانے کے لیے میرا دل چاہتا  
ہے اس جانا ضروری ہے؟“  
”نہیں ایش آل... شیز نے کہا پھر وہ لہجہ دونوں  
انھوں کو میرے شانہ پر صحتے ہوئے بولے: ”تم ان پریشان  
کیوں ہو؟“  
”بچہ، ڈرنگ رہا ہے وہی؟ میں نے دھیر سے کہا۔  
”کس بات سے؟“  
”خدا خواہ شیشٹ رہا ہے گڑبڑ ہوئی تو میں مر جاؤں گی۔  
میں نے ان کے سینے سے اپنا سر لگا کر ان آنسوؤں کو ہٹانے  
کی کوشش کی جو یہ اختیار میری آنکھوں میں اتر گئے تھے۔  
”اے! ڈرنگ ہی تو ہے! شیز میری بیٹی تھی چنانچہ گئے  
پھر انھوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھے  
فارغ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”مجھے بچے کو اپنی تھائی  
ضرورت ہے۔“  
”آپ خود ہو کہ بچہ کا ڈرنگ ہو گیا ہے؟ میں نے کہا۔  
”اے... اے... اے... ڈرنگ... شیز نے سکرانے  
ہوئے بلکہ دیکھا۔“

شام کو جب شیز واپس لوٹے تو رشتے سائٹ ایک  
خفا انھوں نے تلاش سے اپنے برقی کپس سے نکال کر  
دایوس سے میری چاہی بڑھا دیا۔ میں نے شیز کے خاموش  
اصناف میں چہرے کی طرف دیکھا اور ان سے کہہ کر پوچھنے کی  
ہمت نہ کر سکی۔ ان کے چہرے کی گھبرائے بلکہ سب کچھ  
بتا دیا تھا۔ پھر جب انھوں نے یہ کہا کہ مجھے بچے کی نہیں  
تھائی ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم میں

شام کو جب شیز واپس لوٹے تو رشتے سائٹ ایک  
خفا انھوں نے تلاش سے اپنے برقی کپس سے نکال کر  
دایوس سے میری چاہی بڑھا دیا۔ میں نے شیز کے خاموش  
اصناف میں چہرے کی طرف دیکھا اور ان سے کہہ کر پوچھنے کی  
ہمت نہ کر سکی۔ ان کے چہرے کی گھبرائے بلکہ سب کچھ  
بتا دیا تھا۔ پھر جب انھوں نے یہ کہا کہ مجھے بچے کی نہیں  
تھائی ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم میں

شام کو جب شیز واپس لوٹے تو رشتے سائٹ ایک  
خفا انھوں نے تلاش سے اپنے برقی کپس سے نکال کر  
دایوس سے میری چاہی بڑھا دیا۔ میں نے شیز کے خاموش  
اصناف میں چہرے کی طرف دیکھا اور ان سے کہہ کر پوچھنے کی  
ہمت نہ کر سکی۔ ان کے چہرے کی گھبرائے بلکہ سب کچھ  
بتا دیا تھا۔ پھر جب انھوں نے یہ کہا کہ مجھے بچے کی نہیں  
تھائی ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم میں

ندو لگانے میں شیراز کی ایکسپوز اور بارش کی لہٹ تھی۔  
 شیراز کی لہٹ سے حوصلہ افزائی جیکہ میری ہمت دی جانے  
 والی لہٹ زبان حال سے بتا رہی تھی کہ  
 تو یہی صلاحیت کے حضور بہادری ٹیوٹ کی  
 کسوٹی پر میں کھوٹی ثابت ہوئی تھی۔

گیانہ بچے کے گنگمگ میں نے ڈاکٹر پر زلے  
 فون پر بات کی اور امید کی کوئی ایسی قدر تلاش کرتا چاہی جو  
 میری دایوسی میں کھانا کر سکتی۔

ڈاکٹر پر زلے کا مسز شیراز! میں نے آپ کا اداس  
 کے شوہر کی رپورٹ دیکھی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے اتنا لاشخوس  
 محسوس ہوا ہے کہ آپ کا کس اتنا دل چاہی ہے وہ  
 کوئی علاج کوئی ٹریٹمنٹ ڈاکٹر...؟ مجھے اپنی جان کی کوئی  
 پروا نہیں ہے۔

آئی ایم سوری مسز شیراز میرے آجیس سالہ بیٹے ویلنڈ میں  
 ایسے چند ہی کس میرے سامنے کئے ہیں اور ہم کس کو نہ امید دلا  
 سکے نہ اس کے لیے کچھ کر سکے  
 میں فون پر روئی۔

مجھے محسوس ہے مسز شیراز کہ آپ کو دکھ پہنچا اپنے بیٹے کو  
 میں اسی لیے بدم کتا ہوں کہ ہم جہاں امید نہیں دلا سکتے جہاں  
 میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہیں ہاں میں آپ کے لیے اتنا  
 دکھ محسوس کر رہی ہوں۔

اور  
 میں اپنے سینے میں رنگ و دم کی آگ دیکھتی تھی کہ رہی تھی۔



پھر اس میں غروی جیسے دیر سے میری لاشیں کو چاٹنے  
 لگی۔ میں ہر لگے دن پچھلے دن سے نیلیا طول اور دل شکستہ  
 ہوتی چلی گئی۔ یہ احساس کہ میں شیراز کو کچھ نہ دے سکوں گی۔ مجھے  
 لمحہ لمحہ کچھ کے دیتا رہتا۔ شیراز کی دل لاشگی اور پابست مجھے راز  
 گئے تھی۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ایک دن جب دوڑتے دوڑتے  
 میں آخری حد پر جا پہنچوں گی تو یہ حقیقت ہر جاں ہو کر میرے  
 سامنے آجائے گی کہ اس انکشاف کے بعد کہ میں ماں بننے  
 کی صلاحیت سے محروم ہوں شیراز نے مجھ سے اپنی محبت  
 کو مصنوعی سہاروں پر زندہ رکھا ہوا تھا کچھ ایسے ایسے بعض  
 سب کو رپورٹوں کو جتنی طور پر مرہ قلم دے جیسے جلف کے باوجود  
 تاگزیر وجودات کی بنا پر مصنوعی طریقوں سے زندہ رکھا جاتا ہے۔

دیر سے میرے شیراز کے مابین نیکسٹ  
 حاصل ہونے لگی۔ اتنا ہی جذباتی لمحوں میں بھی میں خود کو اس

مرد خلیج کے دوسرے کونے پر شیراز سے دور ہمت دور  
 کھڑا ہوا۔ ہاری اندر وہاں زندگی کی خوشیاں مانہ پڑے لگیں۔  
 چاند صبح کی وہ جھڑی جو دیکھنے والی آنکھوں میں رنگ و  
 سائش کی لہروں برسا کر دیا کرتی، گستاخانے لگی شیراز میری بدلتی  
 ہوئی جون اور گڑبگڑ کی جگہ لینے والی سوہری پہلے حیران  
 ہونے پر شکر اور بعد میں جھنجھلائے لگے۔

”میں اے کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟ وہ جھنجھلا کر کہتے۔  
 کبھی میں چہپ رہتی کبھی اور الہ جاتی اور کبھی مردی  
 آواز میں کہتی و کچھ بھی تو نہیں رازی۔“

”تم بیل گئی ہو؟ وہ مشکوہ کرتے۔  
 ”نہیں... نہیں تو رازی۔“  
 ”کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی ہو تم؟“  
 ”آں... نہیں... نہیں تو۔“

”میں تمہاری اس کیفیت کا سبب بھی جانتا ہوں و  
 میں متوش ہو کر ان کی جانب دیکھنے لگتی۔ وہ بائیں  
 وایکے میری طرف بڑھ آتے۔

”ڈرنگ! آئی لو لو... آئی لو لو... میں صرف تمہیں  
 چاہتا ہوں۔ نہ مجھے بچے کی پہلا ہے نہ کسی اور چیز کی۔“  
 ”اب تو لوگ بھی پوچھنے لگے ہیں رازی!“  
 ”لوگوں کی تم پر واکیوں کرتی ہو؟“  
 ”کیونکہ جہاں سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔“  
 ”لوگوں کی تمہیں پر واس ہے اور مجھے نظر انداز کرنے لگی ہو؟“  
 ایک روز وہ مشکوہ کر ہی بیٹھے۔

میں نے گہرا کر ان کے منہ پہلنا اتنا دھردیا۔  
 ”نہیں رازی... میں بھلا کر سکتی ہوں ایسا۔“  
 ”پھر دو دو کیوں رہنے لگی ہو؟“  
 ”مجھے ڈر لگتا ہے۔“  
 ”ڈر! کیسا ڈر؟“

میں کیسے بتاتی انھیں کہ مجھے ڈر لگتا تھا اس وقت  
 سے جب میں دوڑتے دوڑتے آخری حد پر جا پہنچوں گی  
 اور مجھے معلوم ہوگا کہ سب کچھ سلب تھا۔ مجھ سے اپنی محبت  
 کو انھوں نے مصنوعی سہاروں پر زندہ رکھا ہوا تھا۔  
 بہت دنوں تک میں اس دکھ کو تنہا ہی گھونٹ  
 گھونٹ چتی رہی پھر ایک روز جب دل بہت بھر آیا تو  
 میں نے بجیا کو جلد روٹیا دکھ بھیجی۔ بجیا اس وقت تک  
 ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں۔ میری غروی کا قصہ ان تک  
 پہنچا تو انھوں نے کھا۔

• یعنی تم نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر مجھ پر ہنسنا لیکن تاہم یہی گفرت ہے۔ نئی جتنی تعقیقات لے لیاؤں وہوں کے لیے امید کے نشے و مانے کھول دیے ہیں۔ لگاؤ پر یا جن کا آہنے اپنے خط میں تذکرہ کیا ہے یقیناً ایک لائق اور ماہر ڈاکٹر ہوں گے مگر یہاں کینیڈا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر موجود ہے۔ تم اگر اپنی اور شیراز کی میڈیکل رپورٹس مجھے بھجوا سکو تو میں یہاں کس ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کروں گی۔ خدا کو منظور ہوا تو ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں تمہاری رپورٹس کی بے چینی سے منتظر ہوں ہو سکے تو یہ رپورٹس کسی کے ساتھ دستی بھجوا دو۔

میں نے بھیا کا یہ خط شیراز کو دکھایا تو انہوں نے خاصی نیم دل سے پڑھا۔۔۔ پڑھتے کے بعد جب انہوں نے خط مجھے لوٹایا تو میں نے کہا ہرازی! ہمیں بھیا کو فوری طور پر رپورٹس بھجوا دینا چاہئیں۔

شیراز نے توجہ دیکھا کہ میری طرف سے دیکھا مگر میں جو بھیا کے اس خط کو امید کی نئی کرن بھجوا رہی تھی شیراز کے توروں پر نیا وہ توجہ دینے بنا جوش کے عالم میں جولی۔ ہو سکتا ہے ہرازی کوئی ماسٹر نکل آئے مگر میں تو میڈیکل سائنس نے حیرت انگیز ترقی کر رہی ہے۔

• ڈاکٹر پیرا بھی فارن سے میڈیکل ڈگری یافتہ ہیں۔ کئی برس انگلستان میں پریکٹس کرتے رہے ہیں اور اب بھی گاہے گاہے باہر آتے جلتے رہتے ہیں۔ کئی میڈیکل سائنس کی نئی دریافتیں ان کے علم میں نہ ہوں گی۔ میں نے خود ان سے پوچھا تھا کہ کیا بیرون ملک اس پیچیدگی کا علاج ممکن ہے مگر انہوں نے کوئی امید نہیں دلائی۔

میرا دل بچنے لگا لیکن امید کا ایک جھونکا ہوا کر نو بھڑک اٹھی تھی۔

• کیا ہرج ہے اگر ہم بھیا کو رپورٹس بھجوادیں۔ میں نے شیراز سے کہا۔

• نہیں... کوئی ضرورت نہیں۔ شیراز کے لہجے میں ایک اعلیٰ کیفیت تھی۔

• آخر ہرج کیا ہے؟

• بس میں نے کہہ دیا نہیں۔ شیراز ناگواری سے بولے۔ میں نے چونک کر شیراز کی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی وہ تو میرا دم بھرا کرتے تھے میرا دل بھلایا کرتے تھے مجھے تسکین اور دلا سے دیتے تھے۔

• آخر کیوں نہیں؟ میں نے بھی قہقہے لگائے۔ شیراز نے زہر خند نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے کہ تم میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی عروسی کا شتادہ خند باطنی پھر دو۔ تم میری بیوی ہو۔ جب میں اولاد سے عروسی کا صلہ مرچ پاپ برداشت کر سکتا ہوں تو تم کیوں نہیں کر سکتیں؟ میرا ہی بھرا آیا اور انہیں بھی۔

• میں صحت ہوں رازی... بہت کمزور اور سب سے کم... تمہارے جتنا وصلہ نہیں ہے تمہاری... تم انداز نہیں کر سکتے کہ جب میں کسی ماں کے سینے سے اس کا پیچہ چٹا ہوا کھتی ہوں تو میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں تو لومہ مرئی ہوں رازی... میرے سینے میں آگ سی بھرتی جاتی ہے۔

• بہر حال تمہیں یہ صلہ مرچ پاپ سنا ہوگا۔ شیراز میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کچھ دم پڑ گئے تھے۔

• چپ چپ ہی تو سردی ہوں... لیکن امید کسی کرن سے نظریں چلانا میرے اختیار میں نہیں۔ بھیا نے رپورٹس لگوائی ہیں۔ میں انہیں ضرور بھجوں گی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ تم نہیں بھجواؤ گی انہیں وہ رپورٹس۔ شیڈ بھر جائے گی۔ بھیا میری بہادر ہیں۔

• اور میں دشمن ہوں تمہارا۔ انہیں نکل کر لو۔

• بعض باتیں کہے بنا ہی بگھ میں آجاتی ہیں۔ بھیا کو تم اپنا ہمد بھتی ہو اور مجھ... جہنم میں جائیں تمہاری بھیا اور تم بھی۔ شیراز چلائے۔

میں نے خورشید ہو کر شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے سوجا۔ دیکھا میں اس آخری صدمہ پر ہنسی بھری ہوں۔

اگلے دن میں نے شیراز کی ہمدنگی کی پرمانہ کرتے ہوئے بیدار شری رپورٹس بھیا کو بند لپور ڈنگ ارسال کر دیں۔ دستی طور پر کسی کے ہلو بھوانے کی امید میں وقت ضائع کرنا ممکن ہی نہ ہوتی۔

شیراز دو تین روز خفا خفا سے رہے پھر میں نے انہیں منایا۔ یہ میرا فرض بھی تھا اور بھوری بھی۔ شیراز اگر مجھ سے محبت کرتے تھے تو میں ان سے عشق کرتی تھی۔ خفا ہونا شیراز کا حق بنتا تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ میں گزشتہ چند ماہ سے ذہنی گرباب میں الجھی ہوئی تھی اور وہ بڑی مشکل منزلی کے ساتھ میرے احوالی تناؤ اور ذہنی بوجھان کو برداشت کر رہے تھے۔

اس روز انہوں نے بڑے پریم سے کہا: • میں! کیا تم نے خیال اپنے ذہن سے زوال کر نہیں چیک کر لیں؟

• کون سا خیال؟ میں نے چونک کر پوچھا۔

ہیسی کہ تمہیں لہنا کچھ چاہیے۔ ہم کوئی بچہ لڑو پٹ کیے  
لیتے ہیں۔ کل میں نے کاشانہ لون کیا تھا اور اس کے گلہن ہائی  
سے بات کی تھی۔ بے اولاد ہونے سے مناسب مناسبت کے بعد  
وہاں سے پتے حاصل کر سکتے ہیں :-

• نہیں رازی :- میں نے جواب دیا۔

• اس میں قباحت کیسا ہے ؟

• میں نے بچا کو پریش بھجوا دی ہیں۔ ان کا جواب

آئیے دو :-

”کیا... شیراز کے چہرے کا رنگ آنکھوں کا انداز  
اور تاثرات یکدم بدل گئے :- تم نے میری مرضی کے خلاف  
کیا نا؟“

وہ اگڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی آنکھیں  
شٹلے برساتے گئیں۔

میں انہری صدمہ پہنچ چکی تھی۔

مراب نے حقیقت بن کر میرے سامنے آچکا تھا۔  
”قرۃ العین بیگم ہیں شیراز احمد تھادی اس نامزدانی پر  
بقیہ ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں :- شیراز ہاڑے۔  
میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...“

میں متوحش ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں :-“

بھئیوں لگا جیسے میں تارکیوں کے اتھاہ مندر میں

ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔

پھر چہارٹواں ڈھیرا چھا گیا اور چہاڑوں میں روڈی نہ رہی۔

گو خدشات اور اندیشے کافی دنوں سے میرا بچھا کر

ابے تھے اور مجھے سہارا دے تھے لیکن میرے گمان میں بھی

نہ تھا کہ یوں آنا فنا سب کو ختم ہو جائے گا۔ شیراز اپنی زبان

سے ایک جملے کی تین مرتبہ گردان کر کے مجھ سے اپنی محبت

کے دعووں پر ایک بیک شیلڈ تیسخ کھینچ دیں گے اور میں

کارزار حیات میں تنہا بیسے کس ویسے بس، افسردہ اور زخور

کھڑی رہ جاؤں گی۔

وہ گھر جسے میں فخر سے اپنا گھر کہا کرتی تھی اس گھر

میں میرے لیے کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ اس گھر کے دو دوام

میری تیرہ بختی پر ہونٹ نکالے روز سے تھے شدت و غم

سے میرا بدن رواں لرز رہا تھا اور شہ آنکھیں چھاڑھا کر

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ خود اپنے گھر کے

دوازے اپنے اوپر بند ہو جانے کے بعد میں کہاں پناہ

پاسکوں گی۔



وہی انیکسی جہاں کہیں بھیجا رہا کرتی تھیں میسری  
جائے پناہ بٹھری۔

سنز ہدانی بچیا کے کالی کی ساتھی بھاگتی تھیں گو

بچیا کی شادی امدان کے کینیڈا چلے جانے کے بعد

سنز ہدانی سے وہ تعلق تعلق قائم نہ رہا تھا مگر کہیں بھاریوں

پر بات ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ بچیا نے کینیڈا سے

پاکستان آنے والے اپنے کس آشنا کے توسط سے سنز ہدانی سے

ان کے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی چند سوخا میں ہی بھجوانی

تھیں جنہیں سنز ہدانی بچ پھانے کے لیے میں شیراز

کے ساتھ ان کے گھر بھی گئی تھی۔ جاہا سنز ہدانی ہی دوسرے

ہلکے ان آئی تھیں۔ یوں بچیا کے حلالے سے سنز ہدانی سے

میرا تعلق ہنوز قائم تھا۔ طبعاً سنز ہدانی میں میلاپ رکھنے والی

ایک ہمدرد طبع خاتون تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کی ذاتی زندگی

کے اس الجسے سے کہ ابو ہاس سے ہوتے ہوئے بھی ہاس سے

نہ تھے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ میری شادی کے موقع پر انہوں

نے بچیا کو نہ صرف صلاح مشورے دیے تھے بلکہ ان کا بہنوں

کی طرح ہاتھ بٹایا تھا۔ ہمدانی صاحب نکاح کے دفعہ پر ہدی

جانب سے گواہ تھے۔ بچیا کی شادی اور ان کے کینیڈا چلے

جانے کے بعد سنز ہدانی سے میرا وہ پہلا سا تعلق تو قائم نہ

رہا تھا مگر اس سابقہ تعلق کے بل بوتے پر میں اپنے گھر کے

دوازے بند پا کر ان کے دوازے پر دستک دینے کی

جرات کر سکتی تھی۔

سنز ہدانی کو میں نے ساری روئیداد سنا کر مناسب

نہ بھیجی بس اتنا کہا کہ ایک معمولی سی بات پر اختلاف رکھنے نے

ہمارے درمیان کہیں نہ پٹ سکتے والی ایک فلیج حاصل کر دی

ہے۔ مگر سنز ہدانی جہاں خاتون تھیں جہاں تک نوعیت

کو بڑی حد تک سمجھ گئی اور سنز ہدانی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

”بی بی! اسی لیے تو بڑی بوڑھی شادی کے دوسرے برس

بھی بیوی بیویوں کی گود نہ بھرنے پر متکثر ہو جایا کرتی ہیں و

میرے دل کا لہو آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت

بہنے لگا۔

”تم گھبراؤ مت۔ میں تمہارے جہاں سے خود بات کروں

گی :- سنز ہدانی نے میرے سر پر ہڈی سین کی ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا۔

”اب کوئی فائدہ نہیں آپا :- میں نے کینیڈا چھوٹی



آواز میں کہا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ مجھے طلاق دے چکے ہیں اور میں نے  
گھٹن گھٹی آواز میں کہا۔“

سنرہدانی نے چونک کر کہہ دیا۔ ”یہ تمہیں سے میری  
طرف دیکھا پھر بولیں، زبان یا تحریر؟“

”زبان“

”رجحی یا...؟“

میں نے آنکھیں رومال سے خشک کیں اور سنرہدانی کی  
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔“  
”مطلب یہ کہ ایک یا دو طلاقوں کی صورت میں واپسی  
کا دعوا کھلا رہ جاتا ہے لیکن تین طلاقوں کی صورت میں  
واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔“

”آپا! انہوں نے ایک نکتہ سارے راستے سارے  
دوران سے بند کر دیا ہے۔“ میں نے گھٹن گھٹی آواز میں کہا  
اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسا کہ  
دکھ کے دھاڑے میرے حلق کی ساری پتلیں چرخ جائیں گی۔  
سنرہدانی میرے نزدیک آ بیٹھیں اور مجھے تسلی  
دینے لگیں۔

”حم فکر نہ کرو میں آج ہی... نور العین کو سب پرکھ  
کھے دیتی ہوں۔“

”نہیں آپا... میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے ملتی  
لیجے میں کہا۔ ”بجیا کو آپ ہرگز کچھ مت کہیے گا۔ انہیں دکھ  
ہوگا۔“

”تو کیا تم تنہا یہ دیکھ رہی ہو؟“ سنرہدانی بولیں۔

میری آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔

”عورت ذات بہت کمزور ہوتی ہے بس ہوتی ہے  
لہذا۔“

”ماں آپا! مجھے اس کا اندازہ ہے مگر معتد میں جو آزمائش  
کھی ہو، اس سے مفرج بھی تو ممکن نہیں۔“

”پھر اب کیا کروں؟“

اس سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے سنرہدانی  
سے خود ایک سوال کر ڈالا۔

”آپا! کیا آپ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے سکیں گی؟“  
”بی بی! اے اپنا ہی گھر کھو۔ تمہیں اور نور کو میں بہنوں  
کی طرح گھتی ہوں اور جب سے میرے میاں نے پونہ میں پر  
سوئی عرب گئے ہیں، تب سے تو یہ اتنا بڑا گھر مجھے بہت

خال خال سا لگنے لگا ہے مگر ایک بات ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں نور کو ضرور رکھوں گی۔“

”ابھی نہیں... ابھی نہیں آپا... ذرا مجھ میں حوصلہ

آجائے۔ عادت پڑ جائے اس ختم کی پھر میں نور رکھوں گی  
بجیا کو۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”بی بی! برسوں دنوں میں کہیں چلے کہ تم اب میرے

کی عادی ہو پاؤ گی۔ مجھا گرتا نہ چلتا تو کوئی بات نہ

تھی لیکن اب جبکہ میں حقیقت حال سے باخبر ہو چکی ہوں

نور کو فوری طور پر مطلع کرنا میرا فرض بنتا ہے ورنہ بعد کو

وہ شکوہ کرے گی کہ میں نے اسے فوری اطلاع کیوں

نہ کی۔“

”آپا... میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے

کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا۔ اب بجیا کو فوری اطلاع

کیا جائے یا تاخیر سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“

”ماں اگر شیراز نے تین طلاقیں دے دی ہیں تب

تو اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی نور کو اطلاع دینا

ضروری ہے۔“ سنرہدانی اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی۔

”آپا! تھوڑی سی مہلت دیکھیے مجھے تاکہ پورا تفصیل

سب کچھ لکھ سکوں۔“

”آج ہی لکھ دو نا۔“

”آج... آج تو اگر میں کہنے بھی بیٹھی تو نہ انگلیاں

ساتھ دیں گی نہ ذہن۔“ میری آنکھیں پھر پھر آئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ سنرہدانی نے

مجھے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپا...“ میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”مجھے آپ اپنی

انیکسی میں رہنے کی اجازت دے دیں گی نا؟“

”انیکسی میں کیوں تم ہمارے ساتھ رہو۔“

”نہیں آپا! ایک دو روز کی بات تو نہیں اب تو

مجھے انڈیپنڈنٹ زندگی گزارنا ہے۔ جس طرح آپ نے

بجیا کو انیکسی دے رکھی تھی اسی طور اب مجھے دے دیں۔“

میری مراد یہ تھی کہ میں پہلے ایک ٹیسٹ کے طور

پر انیکسی میں رہوں گی۔

”بی بی! نور کی بات اور تھی۔ وہ اپنے ہاڈن پر کھڑی

تھی۔ خود کفیل تھی۔“ سنرہدانی میری بات کا مطلب سمجھتے

ہوئے بولیں۔

”بی بی! انہوں نے میرے پاس ان زیورات کے سوا اور کوئی

...“

اثاثہ نہیں جو بچوانے مجھے جینز میں دیکھتے تھے مگر میں  
کوشش کروں گی کہ جلد ہی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تلاش کر  
سکوں.... کاش! میری تعلیم ادھوری نہ رہ گئی ہوتی و

تم دل چھوٹا مت کرو۔ مسز ہمدانی نے کئی دیکھی ہیں۔  
”اب جتنی جلدی ہو سکے بہن کو سامنے حالات تفصیل سے  
لکھنے کی ہمت پیدا کر اپنے آپ میں و

پھر مسز ہمدانی نے میری خواہش کے مطابق ایکس میرے  
لیے کھلوادی اس ایکس میں داخل ہوتے وقت میرے دل  
کی عجیب حالت تھی۔ بجیا مجھے بری طرح یاد آ رہی تھیں۔ کبھی  
ان دیواروں کے زنج ہم دونوں بنیں ایک دوسرے سے اپنے دل  
کی کہتے سنتے تھے، ایک دوسرے کے دل کا درد بٹانے کی  
کوشش کیا کرتے تھے مگر آج میں دکھ کے لاڈ میں تنہا جا رہی  
تھی۔ بجیا مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھی تھیں۔

دو تین دن خاموش اور سوگوار سے گزر گئے۔ پھر ایک  
روز مسز ہمدانی نے مجھ سے دہلی زبان میں پوچھا: تم نے مہر  
کا تھانہ کیا تھا؟

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر ہلکا کر کہا  
”جی نہیں“

”مطالبہ کرو گی تو سہی کیونکہ یہ تو تمہارا حق بنتا ہے۔“  
پتہ نہیں... میں نے آنسو پینے کی کوشش کی اور وقت  
کے عالم میں کہا: آپا! اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا  
کچھ جس حق نہ تھا، سناں گھر پر سناں نہیں پر۔ ورنہ آن کی آن اس  
نے مجھے اپنی زندگی سے یوں نہ نکال پھینکا ہوتا اس نے تو  
مجھے بالکل تھی دامن اور بے بس کر دیا۔ عروسی کا احساس مجھے  
سانپ کی طرح ڈسے لیتا ہے۔“

”تمہاریے شرعی حق سے تو وہ تمہیں ہرگز محروم نہیں کر  
سکے گا... یاد نہیں رہا کتنا مقرر ہوا تھا مہر؟“

میں چیپ رہی۔  
مگر مسز ہمدانی کے دوبارہ پوچھنے پر مجھے بتانا پڑا۔  
”سوالا کہہ رہی ہے۔“

”تم کونو میں فون کروں شیراز کو اس سلسلے میں؟“  
نہیں آپا، ہننے دیں و

کیور؟  
”میں اپنے اس شرعی حق سے دستبردار ہوتی ہوں و

”ارے! ایسی طاقت بھی نہ کرنا۔ جس شخص نے تمہارا  
خیال نہ کیا، تمہاری زندگی برباد کر دی اس کا خیال کیوں؟“

اس کا خیال!

میرے دل نے کہا: اس کا خیال تو دیکھ پاؤں  
ساری زندگی ساتھ چلے گا اور اب اسی ایک خیال کے  
سہارے تو بقیہ زندگی کے گے گی۔“

حقیقت یہ تھی کہ شیراز کی اس ناقابل معافی زیادتی کے  
باوجود شیراز کا خیال میں اپنے دل سے نہ نکال پارہی تھی۔  
جن سے محبت کی جاتی ہے دل ان کا مسکن ہوتا ہے جہاں  
مسکن سے ان کے خیال کو بے دخل کر دینا کار آساں تو نہیں  
ہوتا۔ پھر میں شیراز کے خیال کو اپنے دل سے کیوں کر نکال سکتی تھی۔  
”بولو گوتو میں فون کروں شیراز کو؟ مسز ہمدانی نے پھر  
سوالیہ انداز میں کہا۔

”نہیں آپا، ہننے دیں و

”تم نے اب تک خط بھی نہیں لکھا نور کو و

”لکھوں گی، دو چاندوں میں لکھوں گی و میں نے انہیں

اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”اور یہ کیا... سارا سارا دن تم ایکس میں بند پڑی رہتی

ہو... باہر بھی نکلا کرو و

”باہر نکلنے کی سوچ تو رہی ہوں و

”ابھی سوچ ہی رہی ہوں“ مسز ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں... فیصلہ کر لیا ہے و

”اچھا، مسز ہمدانی کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

”آپا! کیا آپ مجھے چھوٹی چھوٹی کوئی نوکری دلا سکتی ہیں؟

میں نے مسز ہمدانی سے کہا۔

”کیا نوکری کرو گی تم؟“

”جی ہاں و

”اور نور سے لعنت طاعت پٹھاؤ گی مجھ پر۔ جانتی ہو

وہ میری جان کو آجائے گی شاید تمہیں اذلاء نہیں کہ وہ تم سے

کس قدر محبت کرتی ہے اور مجھ پر اسے کتنا مان ہے۔“

”مجھے بخوبی اندازہ ہے آپا“

”تب ہی اس سے علاج مشورہ کیے بغیر ملازمت کرنے

کا فیصلہ کر لیا ہے و

”آپا! زندگی گزارنے کا کوئی بہانہ تو چاہیے و

”سیدھا سیدھا ایک کام کرو و

”وہ کیا؟“

”نور کو تفصیل سے کہہ دو۔ یا تو وہ خود آجائے گی حالات  
کا جائزہ لینے یا تمہیں اپنا سرکہ کے دان بلالے گا مگر شیراز سے  
مہر ضرور وصول کر کے جانا و

”نہ اعمال تو آپ کوئی نوکری دلا دیں مجھے و

ہرگز نہیں ۵

”پلیز ۵ میں خوشامد بہا ترائی اور میں نے ماتھ جڑھیہ۔  
 ”بی بی! جو راستہ میں بتا رہی ہوں وہ اختیار کرو۔ باہر  
 نکلو گی تو بڑی خشکیں ہیں ۵“

”جس مشکل سے زندگی نے مجھے دوچار کر دیا ہے کیا  
 اس سے بڑی مشکل بھی کوئی ہو سکتی ہے ۵ میں نے زخمی ہوتے  
 ہوئے کہا۔“

”سو سو طرح کے سوال کرتے ہیں لوگ طلاق یافتہ  
 خواتین سے اور عجیب عجیب قیاس آرائیاں کرتے ہیں ۵  
 ”آپا! آپ تو تعلیم یافتہ، با شعور اور ملازمت پیشہ خاتون  
 ہیں، آپ جو مسئلہ کھنکھاتی ہیں میری ۵“

”باہر نکلتی ہوں۔ باہر کے حالات سے واقف ہوں تب  
 ہی تو تمہیں بھانسنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم ایک ترقی پذیر  
 ملک کے قدامت پسند معاشرے میں سانس لینے والی عورتیں ہیں۔  
 بی بی... لوگوں کی زبانیں جب چاہتی ہیں حلقہ حیات تنگ کر  
 دیتی ہیں ہم پر... سعادت کرنا تم جیسی حسین و جمیل، دلکش اور  
 جوان سال محرت جب طلاق کا شکار اپنی پیشانی پر لگا رہا ہر نکلے  
 گی تو جو جس کے جی میں آئے گا کہے گا ۵“

میں نے ایک سرد آہ کھینچنے کے بعد کہا: ”آپا! مجھ جیسی  
 بہت سی عورتیں یہ خطاب سہہ رہی ہیں۔ میں بھی ہوں گی۔ مجھ  
 میں اتنا حوصلہ ہے آپا؟“

”بی بی! میں نے جو کچھ کہا ہے تنگ نظری کی بنا پر نہیں  
 اپنے طویل تجربے کی بنا پر کہا ہے۔ تم سوچ لو ۵ سنز ہمدانی بولیں۔  
 ”سوچ لیا ہے آپا اور اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے ۵  
 سنز ہمدانی نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اثبات  
 میں یوں سر ہلایا جیسے کہتی ہوں: ”ٹھیک ہے، میں تمہاری مدد  
 کروں گی ۵“

اور

واقعی انھوں نے میری مدد کی بھی۔

سنز ہمدانی کے ایک عزیز ملک شہر میں واقع ایک  
 تشریحی ادارے کے مالک تھے۔ سنز ہمدانی نے میری  
 ملازمت کے ضمن میں انہی سے عرض اس خیال سے بات کی کہ  
 اپنے وسیع اثر و رسوخ سے وہ مجھے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوا  
 ہی دیں گے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں خود ان کے اپنے اولاد  
 کے کلائنٹ سروں ڈیپارٹمنٹ کے لیے ایک خوش شکل خوش لباس  
 لادہ سے آگے بڑھی بولنے کی اہلیت رکھنے والی نوجوان خاتون کی  
 ضرورت تھی جو کلائنٹس کو بہترین خدمت کا یقین دلا سکتی۔ میں

مض خوش شکل ہی نہیں، خوبصورت تھی خوش لباس تھی، انگریزی  
 بول سکتی تھی اور شاید گفتگو کا سلیقہ بھی بدکتی تھی۔ سنز ہمدانی کے  
 توسط سے ہونے والی پہلی ہی ملاقات میں انھیں ہائونڈ ماڈرننگ کے  
 رعب دہاں عسکری صاحب نے جو سنز ہمدانی کے عزیز ہوتے تھے،  
 مجھے پروا نہ تھی تھا دیا۔ نہ مجھے وہ خواہت لینے کی ضرورت تھی  
 نہ تعلیم اسناد پیش کرنے کی۔ وہ نہ بڑی شکل ہو جاتی کیونکہ میری تعلیمی  
 اسناد تو اس گھر میں رہ گئی تھیں جس سے میرا ناما ٹوٹ چکا تھا۔

ملازمت ملنے سے میرے دل کو بڑی دھچکا ہوا ہے۔ یقین  
 کے خوفناک حصارے لنگر کر میں یقین بخود اعتمادی اور خود کفالت کے  
 راستے پر قدم رکھ چکی تھی۔ دل بھی کسی حد تک اس حد مہ گراں کا  
 حادی ہو چکا تھا۔ اوسان بحال ہونے کے بعد میں نے بیجا کو خط  
 لکھا مگر اس لیے کی اطلاع دینے کے بجائے میں نے انہیں لکھا  
 کہ زندگی کی کیا نیت سے آگے کر میں نے ملازمت کر لی ہے اور  
 اب دن کا بڑا حصہ میں دفتر ہی میں گزارتی ہوں لہذا بہتر ہوگا اگر  
 وہ مجھ میرے دفتر کے پتے پر خط لکھیں۔ بیجا کو یہ خط ارسال  
 کرنے سے قبل میں نے سنز ہمدانی کو بھی اس خط کا مضمون پڑھوایا۔  
 ”یہ کیا لکھ دیا تم نے؟ سنز ہمدانی خط پڑھنے کے دوران بولیں۔  
 ”آپ پورا خط پڑھ لو میں ۵ میں نے کہا۔“

خط کی آخری سطر پڑھنے تک سنز ہمدانی کا چہرہ تغیر کیفیت  
 کا آئینہ دار نظر آیا۔ خط پڑھنے کے بعد مجھے خط لکھتے ہوئے  
 انھوں نے تیرھی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا: ”حقیقت کیوں  
 چھپانا چاہتی ہو تم نور سے؟“

”آپا! حقیقت سے آگاہ ہو کر وہ بہت ملول ہوں گی  
 اور یہ میں نہیں چاہتی کیونکہ جو میرے مقدر میں لکھا تھا، وہ تو  
 ہو چکا ۵ میں نے آزر دہ ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”کب تک چھپا سکو گی تم یہ بات نور سے؟“  
 سنز ہمدانی بولیں۔

”جب تک ممکن ہو سکے گا ۵“

”اس کا مطلب ہے مجھے خود لکھنا پڑے گا نور کو؟“

”پلیز! ایسا نہ کیجیے گا ۵ میں نے ماتھ جوڑ دیے۔“

بیجا کو اس ایجنے کی روداد سے لاعلم رکھنے کا صرف ایک  
 سبب تھا اور وہ یہ کہ میں بیجا کو اپنی جانب سے دکھ نہیں کرنا  
 چاہتی تھی۔ اب تو کی دوسری شادی کے بعد بیجانے کافی صعوبتیں  
 برداشت کی تھیں۔ اب کچھ سکھ ملا تھا انہیں اور میں نہیں چاہتی تھی  
 کہ اب انہیں کوئی دکھ پہنچے۔

میری منت سماجت نے سنز ہمدانی کو بیجا کو میسر  
 از دو اجی زندگی کی ناکامی کی بابت کچھ لکھنے سے باز رکھا اور میں

نے دفتر کے پتے پر پھیلا کے خط منگوانے کی جو تیسرا زمانہ وہ سوئی مہنگا سیلاب رہی میرے اس خط کے جواب میں بھیانے پتے دفتر کے پتے پر خط لکھا انھوں نے لکھا تھا۔

یہ کیا طاقت کی تمہارے کہ گھر کا سکون چھوڑ چلاؤ دفتر کے ہنگاموں میں ابھر گئیں۔ بھلی صورت کے لیے جتنی شاقی گھر کی چار دیواری میں ہے اور کہیں بھی نہیں۔ بہر حال میں اصل بسبب جاتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ جلد ہی تمہاری زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلیں۔ میرے کچھ مدخلوں میں سے ایک کا بھی جواب نہیں آیا ہے اب تک۔ ایک بار پھر لکھ رہی ہوں کہ تمہاری اہل کلمہ میڈیکل ریسرچ سوسائٹی کے بعد ڈاکٹر ہریش نے جو یہاں کے صوف تریں گائیکو لوجسٹک کے جاتے ہیں مارچ کے دوسرے ہفتے میں تمہارے طبی معاملے کا وقت دیا ہے۔ تم وہاں کے پہلے ہفتے میں یہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ ڈاکٹر ہریش کی جانب سے دیا جانے والا اپائنٹمنٹ لیٹر میں تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ مذکورہ خود روزانہ کے سطح میں خاصا مہنگا ہو گا۔ عطا وہ انہی میری جانب سے تمہیں جس قسم کی امانت دیکار ہی بلا جھک سکوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارے جواب اور اس کے بعد تمہاری ہنگامہ منظر ہوں اور شیزاز کی بھی۔ ماہر کے تم دونوں لکھے ہیں تاکہ کے خاتمہ دونوں کی مرضی سلامت رکھے اور ہر نظر سے چلتے۔ خدا کا فکر ہے کہ ہم دونوں ہمیں ہی اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ جس شخص اور صحت کرنے والے شوہر نے ہیں۔

بجایا کے خط نے مجھے حیرت ہی آہی جو نے پہلے دریا۔ حالات یوں پٹا نہ کھا چکے ہوتے تو بجایا کے وہ خط جن سے جواب نہ دینے ہاتھ کا بیٹے ٹکوں کیا تھا کب کے مجھے شکر کے ہوتے اور ان خطوں کو میں امید کی سوزی کر لوں۔ تعبیر کرتی کتاب اسے تو ان خطوں کا طنا یا نہ طنا برابر ہی تھا۔ تاہم بجایا کو جوئی تسلیم دینے کی خاطر مجھے لکھا پڑا شیزاز کی کاروباری مصروفیات میں ہانڈل کرنے کے سبب میں ڈاکٹر ہریش سے جن معاملے کے لیے مارچ میں کینیڈا پر سفر سکون کی بجایا نے اپنے لگے خط میں لکھا۔

میں تمہاری مجبوری سمجھتی ہوں۔ شیزاز کے بغیر تم جہلا کہاں آسکو گی یہاں۔ غیر تمہاری میڈیکل ریسرچ میرے پاس محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر ہریش کوئی نے صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب کی بار میں تمہاری اور شیزاز کی صورت کے حساب سے ان سے وقت لینے کی کوشش کھلائی اور اس ضمن میں تمہارے خط کی منتظر رہوں گی و میں نے بجایا کو خط لکھا تھا کہ فی الحال تو چارچ ماہ تک شیزاز کی فونٹ کے آثار نظر نہیں آتے اور ان کی سٹاپا نہ روز مصروفیات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمیائیت اور بدیت کو میں نے ایک بار پھر اپنی ملازمت کا جواز بنا کر پیش کیا۔ اور یوں میں نے بجایا کو اصل حالات سے لاعلم رکھنے کی کوشش کی جس کی سزا جہان نے خاص غماخت کی۔



حاشی طمانیت سے قطع نظر اتفاقاً ایڈورڈ ٹانگ سے وابستگی کا ایک بڑا فائدہ جو میں نے محسوس کیا وہ یہ تھا کہ میں رنج و فکرت کے اس حصار سے نکل آئے میں کامیاب ہو گئی جس میں وقت اور حالات کے بدلے رحم ہاتھوں نے پہلے محسوس کر دیا تھا۔ گو اس حصار سے نکل آئے کے بعد مجھے لوگوں کی جیب و غریب لگا ہوں کہ سنا جہان پڑا معنی غیر مسکرا نہیں میرا استقبال کرتی اور وہی دلی سرگوشیاں تاقب۔ سزا جہان نے خط نہ لکھا تھا۔

مگر میں طبیعت، قومی سے حالات اور واقعات کا مقابلہ کرنے کا نتیجہ کر چکی تھی۔ اس کے سوا چلے میں نہ تھا گھٹنے ٹیک دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں نے زندگی کی بدلہ کے آگے شکست تسلیم کر لی ہے اور اتنی بات میں تھی نہیں کہ زندگی کی بے رحمی کے آگے گھٹنے ٹیک کر موت کو لگے سے لگا سکتی شیزاز کے بنا جینا واقعی عمل تھا مگر خود کشی کا مجھ میں خلا حاصل نہ تھا۔ اتفاقاً ایڈورڈ ٹانگ سے وابستگی زندگی سے مقابلہ کرنے میں خاصا معاون ثابت ہوئی نظر آئی تھی یہی بات ہے کہ اس لحاظ سے میں آگے بڑھ لوگ مجھے من شیزاز ہوں اور وہی دلی مسکرا ہوں سے دیکھتے تھے۔ مجھے دیکھ کر سرگوشیوں میں مصروف ہو جاتے تھے تو چند افراد ایسے بھی تھے جن کی نظروں میں یہی شرافت اور ہمدردی ہونے لگتی تھی۔ ایسے لوگوں میں میرا پرست تو انفا کے مالک من عسکری صاحب تھے جنہیں سزا جہان میری نجی زندگی کے اس ایسے سے آگاہ کر چکی تھیں۔ کلائٹ برکس ٹیپوٹنٹ کی سزا جہان کوئی مجھ پر خاصی ہر وہاں ہیں۔ استقبال

پر تعینات، دو جوان اور ہنس مکھ کیتھون سے تو میرے دوستانہ مراسم اتوار ہو چکے تھے۔ حکمی صاحب کے احترام سے قلع نظر مردوں میں میری دوستی کری ایٹو ڈپارٹمنٹ کے بلال مصطفیٰ سے ہو سکی اور وہ بھی محض اس لیے کہ مجھے دیکھ کر نہ تو اس کے لبوں پر معنی غیر مسکراہٹ آثار گردی کرنے کو نکل آتی تھی نہ اس کی نگاہوں میں سستاپن اجھتا تھا اور نہ ہی وہ مجھے دیکھ کر دوسروں سے سرگرمیوں میں مصروف ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ بلال مصطفیٰ نماؤ عمر اگرچہ مجھ سے بڑا نہ تھا تو چھوٹا بھی نہ تھا مگر سنجیدگی اور متانت کے لحاظ سے وہ اپنی عمر کے مردوں سے خاصا ممتاز نظر آتا تھا۔ وہ الفان کے کری ایٹو ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت مکرشل آرٹسٹ منسلک تھا۔ دفتر کے اوقات کا راجح نو تا سہ پہر پانچ تھے لیکن بلال دوپہر بارہ بجے کے بعد آتا اور چار بجے واپس چلا جاتا۔ یوں اس کی ملازمت مجزوقتی کسی جا سکتی تھی اگرچہ ماہوار سے خاصا معتول تھا تھا اس پر حکمی صاحب کی یہ مرحمت اس لیے تھی کہ وہ غضب کا آرٹسٹ تھا اور شہر بلکہ ملک کے معروف ترین مصور سجاد منصور کا چیتا شاگرد تھا۔ الفان سے مجزوقتی وابستگی کے علاوہ وہ آرڈر پر بھی تصویریں بنایا کرتا تھا خصوصاً پورٹریٹ بنانے میں وہ بلا کا کمال رکھتا تھا میں شروع شروع میں اسے عام سا آرٹسٹ سمجھتا تھا مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جوہر کچھ ادارے کے مختلف لوگوں کی زبانوں اور کچھ اس کی فنکارانہ مہارت دیکھ کر مجھ پر کھلتے چلے گئے۔ یہی سب کچھ میری ملازمت کے چوتھے ماہ کے دوران آرٹس کونسل میں ہونے والی بلال مصطفیٰ کی تصاویر کی نمائش نے پوری کر دی۔ وہاں بے مثل نہیں تویرش اور رنگوں پر کامل فنکارانہ قدرت رکھنے والا ایک فنکار ضرور تھا۔ میں اگرچہ مصور تو نہ تھی مگر رنگوں کی زبان سمجھتی تھی۔ خطوط و دائروں کی نفاست کو مسلحانہ کا ذوق رکھتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں میری جمالیاتی حس مرور نہ تھی۔ میں حسن سے خواہ وہ اشیاء میں ہو یا انسانوں میں کھپا کر کرتی تھی اور انہیں مزبور رکھتی تھی۔ اچھی چیز کو ایک بار دیکھ کر میں اسے ہمیشہ یاد رکھتی۔ شاید اسی لیے میں شیراز سے ناٹا ٹوٹ جانے اور ان کی زندگی سے نکل آنے کے باوجود انہیں اب تک یاد رکھے ہوئے تھی۔ مسز ہمدانی کی انیکسی میں رات گئے کچھ بستر پر کر رہی ہوتے ہوئے میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتی رہی کہ کیا میں اس جناح جو اس بے مروت کو بھول پاؤں گی؟

اس سوال کے جواب میں میرے دل سے صرف ایک صدا آتی۔

کبھی نہیں !!

بڑی عجیب بات تھی کہ شیراز سے ناٹا ٹوٹ جانے کے باوجود میں شیراز کے خیال کو اپنے دل سے بے دخل نہ کر پائی تھی اور نہ ایسا ہو سکنے کے کوئی امکانات نظر آتے تھے۔ بلکہ جب شیراز کا خیال میرے دل کو تڑپانے لگا اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے سنہری دنوں اور بد پہلی راتوں کی یادیں مجھے مجبور کرنے لگتیں تو میں خود اپنے آپ کو لعنت طاعت کرنے بیٹھ جاتی۔ میں سوچتی تھی کہ میری ہی تھی جن میں نے شیراز کی مرضی کے خلاف اپنی اور شیراز کی مہر سیکل ریپورٹس بھیجا کو بھیجی ہوتی تھی وہ اسے ناخوانی سے تعبیر کرتے اور نہ پورے بیداری سے مجھے اپنا زندگی سے نکل چھینکتے۔ میں کتنی احمق اور جاہل تھی نا انڈیش تھی کہ بھیجا کو ان کی مرضی کے خلاف ریپورٹس ارسال کر کے دقت یہ بھول گئی تھی کہ از دو واجی زندگی ایک ایسی بڑی ہوتی ہے جس میں تڑپ کی چالیں ہمیشہ مرد کے حق میں محفوظ رہتی ہیں۔ شیراز سے جدا ہو کر میں انتہائی دل گرفتہ اور مجبور تھی۔ میری بد قسمتی سبب مجھے ان سے دور کر دیا تھا۔ میں جو شیراز کے ساتھ زندگی کے ایک دھنک رنگ بندھن میں بندھ جانے کے بعد ایک دلیر تھی ان سے دور نہ رہی تھی بلکہ ان سے جدا ہونے سے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔



اس روز جب میں دفتر سے گھر لوٹی تو مسز ہمدانی نے مجھے ایک ایسی خبر سنانی جس نے میرا دل باغی تھیل کر کے رکھ دیا۔ شیراز نے ان کے گھر کے نمبر پر کچھ دیر قبل ہی فون کیا تھا۔ کیا کہہ رہے تھے وہ؟ میں نے پوچھا۔  
”رہی علیک سلیک کا ادم سے بات کہنے کی خواہش کا اظہار کیا؟“

”پھر؟“

”پھر کیا میں نے بتا دیا کہ وہ تو جاہل کہہ رہے۔ چھ ساڑھے چھ بجے تک واپس ہوتی ہے۔“  
”حیران ہوئے ہوں گے یہ سن کر تو؟“  
”بی بی حیران تو تب ہوتے کہ جب انہیں یہ بات پہلے سے معلوم نہ ہوتی۔“  
”انہیں کیسے معلوم؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔“  
”میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر بی بی! یہ مرد! مرد بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔“  
”انہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آپ کے ساتھ رہ رہی ہوں؟ میں نے تہذیب کے عالم میں کہا۔“

• بہت بھول ہو لا منرہمانی مسکائیں۔ اللہ سے بی بی ا  
جب انہیں یہ معلوم ہے کہ تم ملازمت کس جگہ کر رہی ہو،  
کس وقت گھر سے نکلتی ہو کس وقت واپس لوٹی ہو تو کیا  
یہ معلوم نہ ہو گا کہ کہاں رہ رہی ہو؟

• یعنی انہیں میرے آفس کا بھی معلوم ہے •

• ہاں... جب تمہاری بابت استفسار ہو میں نے  
کہا کہ میاں وہ تو جاہل کر رہی ہے تو کھنے لگے اس وقت  
تک تو واپس لوٹ آئی ہوں گی۔ میں نے کہا ہاں مگر کبھی کبھی  
دیر بھی ہو جاتی ہے۔ پبلک بسوں کے دھلے کھاتی پہنچی ہے۔  
” پھر پھر کیا کہا آپ انہوں نے؟“

• آٹھ بجے پھر فون کریں گے •

• اوہ •

میرادل بے اختیار ہولے لگا۔ میں نے اپنی  
کلانی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا کلمات بچنے میں چار منٹ  
باق تھے۔ آٹھ بجنے کا انتظار ایک کٹمن آن لائن سے گزرنے  
کے مترادف تھا۔ میں حسب معمول انیکسی میں جلنے کی بجائے  
لاؤنج میں بیٹھ کر فون کا انتظار کرنے لگی کچھ دیر لا منرہمانی  
کی ملازمہ میرے لیے چائے لے آئی۔ آٹھ بجتے ہی میرادل  
ایک ناقابل بیان بے تکان سے دو چار ہو گیا اور کان ٹیلیفون  
کی گھنٹی پر ٹپک گئے۔ آٹھ بج کر سات منٹ پر ٹیلیفون کی  
گھنٹی بجی اور میرادل بے مہار دھڑکنے لگا کال منرہمانی  
نے ریسروک پھر گرون موڈ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔  
قرۃ العین! تمہارا فون ہے •

میں جو دن کی گھنٹی سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی  
ہوئی تھی، کپکپاتی ناگوں سے فون تک پہنچی۔ منرہمانی نے  
ریسیور مجھے چھایا اور خطاطی سے ہالائی منزل کو جانے والے  
نہینے کا رخ کیا۔

• ہیلو! میں نے ریسورکان سے لگاتے ہوئے کہا۔  
• کیسی ہو؟ •

شیراز کی آواز سہمت سے کھراتی ہی میرادل ایک  
عجیب سی کیفیت سے دو چار ہو گیا۔ یہ آواز! یہ آواز میں نے  
کتنے دنوں بعد سنی تھی۔ وہی جس نے گھاؤ لگایا تھا، اب ہرٹن  
اور سیل آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کس ہیں بے اختیار  
میرادل بھرا پلہ اکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

• زندہ ہوں! میں نے گھنٹی گھنٹی آواز میں کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی سی چھا گئی اور مجھے یوں لگا جیسے رابطہ  
منقطع ہو گیا ہو لیکن پھر ایک گہرا سانس لینے کی آواز میرے کان

سے کھرائی اور شیراز کی آواز سنائی دی۔

• جیتی! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں •  
• فائدہ •

• محبت فائدہ یا نقصان نہیں دیکھتی •

• پیٹریا پیٹریا رازی محبت کا نام نہ لو۔ کیا محبت اسی قدر  
ظالم ہوتی ہے؟ میں نے آنسو لپٹنے دوپٹے کے انہل میں  
جذب کرتے ہوئے کہا۔

• میں پاگل ہو گیا تھا یعنی! مجھے معاف کر دو •

میں چپ رہی اس سوال کا کیا جواب دیتی۔

• تمہیں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ بہت برا  
بھلا کرتا ہوں میں اپنے آپ کو •

میں چونکی۔

” مجھے دیکھ کر! میں نے تجھ سے پوچھا۔“

• ہاں •

• کہاں دیکھا تمہارے مجھے؟ •

• روز دیکھتا ہوں۔ کبھی گھر سے نکلتے ہوئے، کبھی بس  
اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے، کبھی دفتر کی سیڑھیاں  
پر چڑھتے ہوئے اور کبھی ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے •  
• گویا تم میرا پوچھا کرتے رہتے ہو؟ •

• یہی سمجھ لو •

• اور یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ رہی ہوں؟  
• بہت پچکانہ سا سوال ہے... جن سے محبت کی جاتی  
ہے جتن ان کی تو لہو لہو خبر گیری کی جاتی ہے •

• پھر... پھر تمہارے محبت کا نام آیا... • میں بھرائی ہوئی  
آواز میں بولی۔

• یہ حق مجھ سے نہ تم چھین سکتی ہو نہ کوئی اور... ایک بار  
نہیں بار بار کہوں گا، سو بار کہوں گا اساری زندگی کتنا ہوں گا کبھی  
تم سے محبت ہے •

• تمہیں چھ ماہ بعد پلٹ کر خبر لے رہے ہو • میں نے  
شکوہ کیا۔

• میں تمہیں آنا چاہتا تھا •

• مجھے آنا چاہتے تھے • میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

• ہاں میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم مجھ سے لائق  
اور بے خبر رہ سکتی ہو •

• تعلق رہ ہی کیا گیا ہے • میری آنکھیں پھر بھیگ گئیں

اور آواز بھی آنسوؤں کے بوجھ سے گھٹ گئی۔

• جو کچھ ہوا، میں اس پر شرمندہ ہوں یعنی حساب تم

فائدہ ہے؟

فائدہ سے اور نقصان کا بعد میں سوچیں گے، فی الحال تو تم میرے سوال کا جواب دو !!

صبح نو بجے سے پانچ بجے تک میں دفتر میں ہوتی ہوں، گولی مارو دفتر کو... میں دفتر میں تم ملازمت کر رہی ہو اسے میں اس کے مالک کے ساتھ خرید سکتا ہوں !!

میں جانتی ہوں !!

پھر دفتر کو کیوں اہمیت دے رہی ہو؟

کیونکہ ملازمت میری عبوری بن چکی ہے !!

سنو! کل صبح آٹھ بجے میں بس اسٹاپ پر تمہارا منظر ہوں گا... حالانکہ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات لگتی ہے کہ

میں اپنی بیوی کا بس اسٹاپ پر انتظار کروں !!

بیوی !! میں نے افسردہ لہجے میں کہا: ہاں کبھی تھی

تو سہی میں تمہاری بیوی !!

تھی سے تمہارا کیا مطلب ہے، یو آر ایشل مائی وائف؟

میں بھی اب تک تم ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں !!

میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا مگر دل کی یہ بات زبان پر نہ لائی۔

کل صبح آٹھ بجے شیراز نے کہا۔

اتنی صبح جاگ سکو گے تم؟ میں نے پوچھا۔

کل صبح آٹھ بجے کے انتظار میں تین رات بھر جاؤں گا؟

یعنی بھڑکی آزمائش نے شیراز پر میری اہمیت آشکار کر

دی تھی۔ میں غرور و ناز سے مسکادی۔

بڑے عمدہ ہائی انداز میں ایک دوسرے کو فون پر

چل گئی سارے نو بجے

سرخ ہدائی سے میری دوبارہ ملاقات

ہوئی۔ کھانے کی میز پر بچوں کی موجودگی کے خیال سے نہ سن رہی تھی

نے مجھ سے کچھ پوچھا، نہ میں نے از خود کچھ بتانا مناسب سمجھا

البتہ کھانے کے بعد جب سن رہی تھی کہ تینوں بچے ڈانٹک ہم

سے چلے گئے تو سن رہی تھی کہ گہری نگاہوں سے میری جانب

دیکھتے ہوئے کہا: کوئی خاص بات؟

جی !! میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

سن رہی تھی نے کڑے وقت میں جس طور میری دلجوئی

اور مدد کی تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں انہیں اپنا ہمدرد جان کر

اس نئی صورت حال سے بھی آگاہ کر دیتی۔ چنانچہ میں نے انہیں

شیراز سے ہونے والی گفتگو کا کتبہ کتاب بتا دیا۔ انہوں نے

خاصی حیرانی سے یہ بات سنی پھر سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کے

سے دوبارہ ملاپ کی کوئی صورت نکالنا چاہتا ہوں... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں... بولو کب اور کہاں ملوں تم سے؟ میں نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا: قسمت نہیں بھدا کر چکی ہے رازی۔ واپس کا کوئی راستہ نہیں !!

کوئی نہ کوئی راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے یعنی ہم راستہ تلاش کریں گے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ محض ہذیان تھا۔ میں اپنا الفاظ واپس لینا چاہتا ہوں !!

کیا یہ اسی قدر آسان ہے؟

تم ملو تو سہی مجھ سے... کچھ سوچیں گے کچھ کریں گے...

میں وہاں اجماعاًں تھا کہ پاس؟

نہیں ہرگز نہیں !!

تو تم گھر آ جاؤ !!

کون سا گھر اور گھر جس کے دروازے تم نے مجھ

پر بند کر دیئے !!

مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ آئی ایم سوری... آئی ایم

ریٹیل سوری یعنی... شیراز نے پل بھر کو توقف کیا پھر کہا۔

ویسے بھی میں نے جو کچھ بکا زبان سے قلم سے تو اب

بیک کچھ نہیں لکھا۔ کوئی کاغذی ثبوت نہیں اس بات کا کہ میں

تمہیں طلاق دے چکا ہوں !!

دل سے تو میں نے بھی قبول نہیں کیا تھا تمہارا وہ

ظلمانہ فیصلہ !! میں نے جی ہی جی میں کہا۔

ہاں تو کب اور کہاں مل رہی ہو تم مجھ سے؟ کتنے دن

ہو گئے تمہیں نزدیک سے دیکھے ہوئے !!

دکھ کی ایک لہر میرے سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ بھر

کی جس بے تابی کا شیراز ذکر رہے تھے اس سے تو میں خود

بھی دوچار تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے شیراز کو دیکھے ہوئے۔ وہ

مرد ہونے کا فائدہ اب بھی اٹھا رہے تھے، مجھے دیکھ رہے

تھے خواہ وہ وہی سے سی میری نگاہوں سے پنہاں ہو کر

ہی مگر میں! نزدیک سے انہیں دیکھنے کا تو سوال ہی کیا،

میں تو دور سے بھی ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس رہی تھی۔

بے شک ان کا تصور میرے دل میں ہمہ وقت بسا رہتا تھا مگر

تصور سوائے اس بے گل اور خطرناک کے مجھے کیا دے سکتا تھا

جو تصور کے سراپے حقیقت کے رنگزار میں نکل آسے پر

میرے دل کو ایک ان کسی ازیت سے دوچار کر دیا کرتا تھا۔

ابھی مل سکتی ہو تم مجھ سے؟ شیراز پوچھ رہے تھے۔

نہیں !!

کل ہے؟

چہرے پر بکھری گبیر تادیکھ کر میں نے کہا: آپا اودہ کہہ ہے  
تھے تمہا اب بھی میری بیوی ہو کیونکہ تمہارے پاس طلاق کا کوئی  
تحریری ثبوت تو ہے نہیں ۛ

ۛ پھر تمہارا کیا خیال ہے؟ مسز بہمانی نے... پکے  
اس طور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے میرے چہرے  
کے راستے دل کی گواہیوں کا حال جان لینا چاہتی ہوں۔

ۛ آپا...! میں نے قدیمے اچکھپاتے ہوئے کہا: ہتی  
بات یہ ہے کہ دل سے تو میں نے بھی قبول نہیں کیا تھا  
ان کے اس فیصلے کو ۛ

مسز بہمانی کچھ اس طرح مسکرائیں جیسے میں نے کوئی  
بچکانہ اور احمقانہ بات کہی ہو پھر بولیں: بی بی! میں مسلمان  
ہوں اور خدا کے فضل سے اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور میری  
خوش قسمتی کہ اسلامک اسٹڈیز میرا مضمون ہے اور خداوند کریم  
نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں دوسروں کو بھی اوسروں کی  
آگاہ کر سکوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے مجھے بتایا  
تھا کہ شیراز نے تمہیں تین مرتبہ طلاق دی تھی۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا  
تو تمہیں شرعاً طلاق ہو چکی ہے اور جہاں تک تمہارے اس  
جواز کا تعلق ہے کہ تم نے دل سے طلاق کو قبول نہیں کیا تھا تو  
طلاق مرد کا اختیار اور حق ہے۔ مرد کے طلاق دے دینے  
سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ عورت کے قبول نہ کرنے سے  
کوئی فرق نہیں پڑتا ۛ

مسز بہمانی کی اس بات نے مجھے متذہب کو دیا۔ اس  
تذہب کو میرے چہرے کے تاثرات سے تاثراتے ہوئے  
انہوں نے کہا: ویسے تو تم غرار ہو مگر ایک مسلمان کی حیثیت  
سے میرا فرض بنتا ہے اور جس علم سے خدا نے مجھے نوازا ہے  
اس کا فکریہ ادا کرنے کی بہتر صورت یہی ہے کہ میں اگر اپنے  
کسی مسلمان بہن بھائی کو دینی معلومات کے ضمن میں کسی تذہب  
یا غلط فہمی کا شکار دیکھوں تو اس کو غلط راستے سے بھاؤں اور  
مجھ راستے سے آگاہ کروں۔ تمہیں طلاق ہو چکی ہے۔ پھر بھی اگر  
کوئی شک ہو تمہارے یا تمہارے میان کے دل میں تو تم کسی  
عالم سے فتویٰ لے سکتی ہو ۛ

ۛ اگر عالم نے بھی طلاق کا فتویٰ دے دیا تو؟

ۛ تو واپسی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے حلال۔  
اور اگر تم لوگ اس راستے سے گئے بتا رجوع کرو گے تو یہ  
بڑا گناہ ہوگا جس کی بہر حال سزا مقرر ہے ۛ

ۛ کہا! ہو سکتا ہے شیراز نے دو طلاقیں دی ہوں ۛ

میں نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ

شیراز نے مجھے تین طلاقیں دی تھیں۔

ۛ شب بھی رجعت کا وقت تو گزر چکا... ۛ مسز بہمانی  
بولیں پھر انہوں نے بڑی ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے  
ہوئے کہا: لائل! ایک عورت جس کے ناتے میں تمہاری  
کیفیت سے آگاہ ہوں۔ مگر میں اور تمہیں مکانات عمل پر تین  
رکھنا چاہتا ہوں۔ راستے بڑے کٹھن اور خاردار ہوتے ہیں۔  
ان سے گزرتے ہوئے پاؤں ہی نہیں دل بھی رگھی ہو جاتا ہے  
لیکن اس عارضی دنیا کی فانی خوشیوں کی خاطر اگر یہ دوائی انجام  
سے نظر میں چرائیں تو بے شک یہ بڑی غلطی اور قسمتی ہوگی ۛ  
میں جو فون پر شیراز کی آواز اور ان کی باتیں سن کر  
بہت غوط اور قلم سے متذبذب تھی مسز بہمانی کی باتیں سن کر  
میری خوشی کا فور ہو گئی اور الجھن گہری پڑ گئی۔

ۛ

تاہم اگلی صبح میں شیراز سے ملنے پنانہ رہ کر بس بسٹاپ  
پر وہ اپنی گاڑی میں میرے منتظر تھے۔ وہی مرد تھا وہی گاڑی  
مگر میرے دل پر اجنبیت کا سا احساس طاری تھا۔ شاید گزرتی  
سات مسز بہمانی سے بات نہ ہوئی ہوتی تو یہ احساس اتنا گہرا  
نہ ہوتا۔

ۛ یہ کیا حالت ہماری ہے تم نے؟ شیراز نے کھل کر  
پر گاڑی دوڑاتے ہوئے کہا۔

ۛ اچھی ہوں... شک ہے تو ہوں ۛ

ۛ وہ میری والی عینی کہاں گئی...؟ ہنستی مسکراتی...

آنکھوں میں ستارے سمائے ۛ

ۛ اے تو تم نے مارا سلا! میں نے بھڑائی ہوئی آواز  
میں کہا۔

ۛ ڈونٹ ٹاک نان سنس... ۛ شیراز نے کہا اور باپاں  
ہاتھ اسٹیئرنگ ویل پر سے ہٹا کر آہستہ سے میری کمر کے گرد گھول  
کرنے کی کوشش کی۔

میں سمٹ کر ذرا آگے کو سرک گئی۔

ۛ اپنی گرفت اسٹیئرنگ پر رکھو! میں نے دھیرے سے کہا۔

ۛ تم بدل گئی ہو؟ شیراز کے لہجے میں شک تھا۔

ۛ تم میری بات کرتے ہو۔ میرے لیے تو پوری دنیا ہی  
بدل گئی ہے ۛ

نئی میری آنکھوں کے کناروں تک چلی آئی تھی۔

ۛ آئی ایم سوری ڈارنگ... میری وجہ سے تمہیں بڑا دکھ

پہنچا... بہر حال تم ٹکر نہ کرو۔ اب اتنی محبت اتنا پیار دوں گا  
کہ تم ان چھ ماہ کا ہر دکھ بھول جاؤ گی ۛ



”یہ تم مجھے لیے کہاں جا رہے ہو؟“

”گھر اور کہاں؟“

”کون سا گھر؟“

”اپنے گھر۔“

”کیا یہ ممکن ہے؟“

”ممکن نہ ہونے کی کیا بات ہے؟ شیراز نے اپنے سامنے آدھیلیں آہینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے طلاق سے چکے ہو؟“

”ثبوت؟“

”میں نے آہینے میں شیراز کو مسکراتے ہوئے پایا۔“

”تم مجھ سے زبردستی تو نہیں کر سکو گے رازی؟“

”کیا مطلب؟ شیراز نے سرگھبرا کر ایک ہل کو میری طرف دیکھا۔“

”مطلب یہ کہ اگر تم مجھے طلاق سے چکے ہو اور میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”میں نے سوچا کہ کہا تھا غصے میں کہا تھا اور غصے میں دی جلنے والی طلاق واقع نہیں ہوتی۔“

”میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔“

”طلاق غصے اور جذبات ہی میں دی جاتی ہے۔ کوئی مرد محبت کو پیار سے طلاق نہیں دیتا۔“

”ڈونٹ بی سٹی میں۔۔۔ کیا یہ بات ہمارے حق میں نہیں جاتی کہ اس طلاق کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے؟“

”اس عارضی دنیا کے وقتی فائدے کی خاطر میں دائمی انجام سے نظروں نہ چھرا سکوں گی رازی۔ بالآخر ہم ساتھ رہنے میں لگے تو یہ ایک خیالی میرے لیے ہمیشہ سوانحِ روح بنا رہے گا کہ ہم گناہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”پاگل اور جذبات مت جو اب یہ طلاق نہیں ہوتی ہے۔“

”آل رائٹ! اگر تم ٹھہر جاؤ اور تمہیں شبہ ہے تو ہم کسی عالمِ دین سے فتویٰ لیے لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“

”رازی! میرے دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔“

”دفع کرو دفتر کو۔ میں تمہیں گھر لے کر جا رہا ہوں۔“

”تم زبردستی نہیں کر سکتے۔“

”شیراز نے پھر گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔“

”آئی مین اسٹ رازی؟ میں نے کہا۔“

”آئی ٹو یو۔“

”رازی! آج پہل دفعہ میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم نے تو مجھ سے محبت ہی کی میں تو تم سے عشق کرتی تھی، کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ مگر گناہ کی دلدل میں پھنس کر میں اس عشق کو داغدار نہیں کرنا چاہتی۔“

”بہت بد دل لگی ہو تم؟ شیراز نے پھر شکوہ کیا۔“

”ہاں شاید اس لیے کہ میں نے اپنے دکھ کی مہلیا کو شالوں پر اسٹھا کر چلنا سیکھ لیا ہے۔“

”شاعری کرنے لگی ہو کیا؟“

”ابھی تک تو نہیں کی۔ شاید اب کرنے لگوں۔۔۔۔“

”اور یہ جو تم اپنے گھر کو جانے والے رستے پر گاڑی دوڑا رہے ہو فضول ہے؟ میں گاڑی سے نہیں اتروں گی۔“

”آئی دل شوٹ یو۔“

”یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے آرام سے کہا۔“

”دفعہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی اور شیراز نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”کیا چاہتی ہو؟“

”نی الحال تو میں دفتر جانا چاہتی ہوں۔“

”پھر؟“

”پھر جب تم چاہو گے میں تمہارے ساتھ کسی عالمِ دین کے پاس چلوں گی اور ہم فتویٰ لیں گے۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں بہت ضروری بلکہ ناگزیر۔“

”شیراز کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے: ”آل رائٹ! ہم ابھی چلے چلتے ہیں کسی عالم کے پاس۔“

”ابھی نہیں۔۔۔۔۔ نوبے مجھے دفتر پہنچنا ہے اور آج دس بجے ایک کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ ہیں کلائنٹ سرورس ایگزیکٹو کی معاونت کرنا ہے۔“

”گویا کلائنٹس ہم سے زیادہ اہم ہو گئے۔“

”وقت وقت کی بات ہے رازی۔“

”بہت ظالم ہو تم!“

”کیا تم سے زیادہ ہو سکتی ہوں؟“

”شیراز شرمسار سے نظر آنے لگے۔“

”براہ کرم اب تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کرنے کی کوشش کرو جہاں سے میں میکلوڈ روڈ کے لیے کوئی سٹوری لے سکوں۔“

”شیراز نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اسٹیشننگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ پھر گاڑی فرارٹے بھرتی شہر کی سڑکوں سے گزرنے لگی۔ میرے برابر کھنکھنے کے

باوجود شیراز نے مجھے راستے میں کہیں نہیں اتارا بلکہ اس چھ منزلہ عمارت کے سامنے جا کر گاڑی روکی جس کی چوتھی منزل پر الفا ایڈورٹائزنگ کا دفتر تھا۔  
 "دفتر سے کتنے بجے نکلو گی؟" شیراز نے میرے اترنے سے قبل پوچھا۔

"پانچ ساڑھے پانچ بجے"  
 "اندازاً نہیں بالکل صبح وقت بتاؤ"  
 "کیوں؟"

"میں تمہیں لینے آؤں گا اور پھر ہم دونوں کسی عالم دین کے پاس چلیں گے"

میں فزادیر کو تو سوچ میں پرگئی پھر میں نے کہا "میں ٹھیک سوا پانچ بجے نیچے اتروں گی"  
 "اور میں اسی جگہ تمہارا منتظر ہوں گا"  
 پانچ بجے کے وقفے کے بعد میں نے مندرجہ ذیل کو فون پر مطلع کیا کہ میں دیر سے گھر لوٹوں گی۔

"کوئی خاص سبب؟" مندرجہ ذیل نے پوچھا۔  
 "رازی کے ساتھ جانا ہے" میں نے دبی دبی آواز میں بتایا۔

"کہاں؟"

"کسی عالم کے پاس"

"ہو سکے تو مفتی حکیم الدین صاحب کے پاس جانا میں نے ان کی بڑی شہرت سنی ہے"  
 "کہاں ہوتے ہیں یہ؟"

جواب میں مندرجہ ذیل نے اس دارالعلوم کا پتہ مجھے نوٹ کروا دیا جس کے احاطے میں مفتی حکیم الدین صاحب کی رہائش گاہ بھی واقع تھی۔

سوا پانچ بجے جب میں دفتر سے نکل کر شیراز میرے منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گاڑی کا دروازہ وا کر دیا۔ شیراز کزیم کمر کے کرتے شلوار سوٹ میں ملبوس تھے اور اسی رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ گاڑی کے اندر کی فضا اس ہوشیار خوشبو سے مہک رہی تھی جو انہوں نے اپنے اوپر چھڑک رکھی تھی۔

"آج دن بھر مولویوں کی بابت پوچھتا پھر ہوں" شیراز نے میرے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

"باحق پریشانی اٹھائی تم نے"

"باحق کیوں! اس تحقیق کے نتیجے میں تو میں تمہیں اس وقت ایک مولوی صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں"

"رازی! ہمیں کسی مولوی کے نہیں ملے گی کے پاس جانے کی ضرورت ہے اور ہم مفتی حکیم الدین صاحب کے پاس چلیں گے۔ میں نے سنا ہے ان کی بڑی شہرت ہے"  
 "یار! کیوں جیسے چکر میں پڑتی ہو۔ کسی مولوی کے پاس چلتے ہیں"

"نہیں رازی! ہمیں فتوے کی ضرورت ہے ہمیں ملے سکے پاس ہی چلانا چاہیے"  
 شیراز کچھ دیر سوچتے رہے پھر ادلی ناخواستہ تاملی ظاہر کی۔

مفتی حکیم الدین صاحب سے ان کے دولت کردے پر جو حکیم دارالعلوم کے احاطے ہی میں واقع تھا ملاقات ہوئی۔ ان کا چہرہ انتہائی نورانی اور گستاگو جھگڑا تھی۔ انہوں نے فاضل توجیر اور انہماک سے ہمارا مسئلہ سننا کہ مفتی صاحب کی شخصیت کے ناظر اور کچھ مندرجہ ذیل کی اس بات سے کہ اس عارضی دنیا کے وقتی فائدے کی خاطر ہمیں دائمی اوسا بدی انجام کو نہیں بھولنا چاہیے، مجھے مفتی صاحب کے مدد پر پرج بولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اعتراف کیا کہ شیراز کی زبان سے میں نے اپنے لیے یہ غلطیوں پر تاملی ہوش و حواس ہی نہیں مفتی صاحب کے استفسار پر شیراز نے کہا کہ انہیں کچھ یاد نہ تھا کہ وہ اس روز غصے کے عالم میں کیا کہہ گئے تھے۔ مفتی صاحب کچھ دیر غور و فکر کے بعد میری جانب روٹے سخن کرتے ہوئے بولے: "دیکھیے عزم! اگر آپ نے اپنے شوہر نامہ دار کی زبان سے اپنے لیے تین مرتبہ طلاق کے الفاظ سننے تو شرعاً طلاق واقع ہو چکی ہے۔"

"مفتی صاحب! ہم نے جو کچھ کہا غصے میں کہا۔ میری نیت طلاق دینے کی نہ تھی"  
 "صاحب! یہ فعل قبیح غصے اور ناراضگی کے عالم میں ہی سرزد ہوتا ہے۔ میرے پاس بعد کو پھٹانے والے جتنے بھی لوگ آتے ہیں وہ یہی جو انہیں پیش کرتے ہیں کہ ہم نے غصے میں ایسا کیا۔ مجھے نہیں یاد کہ رجعت کے خواہاں کسی سرور نے مجھ سے یہ کہا ہو کہ مفتی صاحب! میں نے اپنی بیوی کو پیار سے طلاق دی تھی۔ سب سے ہی کہتے ہیں کہ غصے میں ایسا ہرگز سے بھائی! اسی لیے تو غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور طلاق کو جائز ہے۔ نے کے باوجود خداوند ذوالجلال نے ناپسندیدہ قدر دیا تلاش! آپ جیسے مرد بعد کو پھٹانے کے بجائے غصے پر قابو پانا سیکھ لیں۔ مفتی صاحب نے بڑی رہنمائی سے کہا۔  
 "مفتی صاحب! میں نے تجرباً تو انہیں کوئی استاویز نہیں دی۔ شیراز بولے۔"

مفتی صاحب تبریز سے مکرا دیے پھر فرمایا: بھائی میرے ساری اہمیت زبان کا ہے۔ آپ نے زبان سے میں مرتبہ اپنی اہمیت کو طلاق دی طلاق واقع ہو گئی۔ یہی دستاویز کی بات تو وہ ضمنی سی بات ہے۔ قانوناً دستاویز کی اہمیت ہے مگر شرعاً زبان سے اس امر کا اعلان کافی ہے۔ میں نے اور شیراز نے پہلے ہی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”اب آپ دونوں کا لاپ ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ صورت ہے حلال...“ مفتی صاحب نے فرمایا۔

میں سر تاپا کانپسکے رہ گئی۔ یہ تصور بھی میرے لیے محال تھا۔

”کوئی اور راستہ مفتی صاحب؟ میں نے گھسی گھسی آواز میں پوچھا۔

مفتی صاحب نے نفی میں سر ہلادیا اور بولے: یہ واحد راستہ ہے اور اس میں بھی ایک عمومی غلط فہمی کی تصحیح فرمائیے۔ اتنا کہہ کر چند لمحوں میں مفتی صاحب نے توقف فرمایا پھر بولے۔

”حلالہ کے ضمن میں منعموہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے مرد سے نکاح کے بعد فطری انداز میں ازدواجی زندگی گزارنا ضروری ہے۔ پھر اگر کسی باعث صورت اور اس کے دوسرے خاوند کے مابین جیلوندگ ہو جائے تب خاتون مذکورہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔“

مفتی صاحب نے جو شرعی مسئلہ بیان فرمایا، میں اس کی گہرائی کو سمجھ سکتی تھی۔

”بہت مشکل ہے یہ۔“ میں نے تھم تھم میں کہا۔

”۲۰ مرتبہ بے شک بہت کٹھن منزل ہے یہ اس مرد کے لیے بھی جو غلطی کر چکا ہو اور عدالت کے لیے بھی جو مرد کی اسی غلطی کا نشانہ بنی ہو۔ اسی لیے تو طلاق کو جائز قرار دینے کے باوجود ناپسندیدہ کہا گیا ہے۔“

مفتی صاحب کے پاس سے اٹھ کر جب ہم ڈارالعلوم کے باہر کھڑی گاڑی میں آ بیٹھے تو شیراز کا چہرہ شدید ذہنی ایجان کا عمار نظر آتا تھا۔ تاؤ کا شکار میں بھی تھی۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا ان چکروں میں مت چڑھو۔ سیدھی سی بات ہے تمہیں طلاق دینے کا کوئی تحریری ثبوت نہ میرے پاس ہے نہ تمہارے پاس اور نہ ہی کسی اور کے پاس۔ ہم بغیر کسی پیچیدگی کے پھر یکجا ہو سکتے ہیں۔“

ذرا دیر کو تو میرا بھی دل ڈالوا ڈول ہو گیا۔ شیراز تک واپس بلانے کے لیے کسی دوسرے مرد کی زوجیت سے گزرنا میرے

لیے ایک جاں گسل تصور تھا۔

لیکن پھر ایک اور تکلیف وہ خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ بے شک طلاق کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا مگر کچھ لوگ تھے جو اس ایلیے سے واقف ہو چکے تھے۔ مسز بہدانی ان میں سرفہرست تھیں اور پھر میرے دفتر کے ساتھی۔ شیراز نے کج بانی کی صورت میں میں ان سے کیوں کر نظر میں ملا سکتی تھی۔

شیراز مجھے اسی روز زبردستی گھر لے جانا چاہتے تھے مگر میں ضد کر کے مسز بہدانی کے گھر پر اتر گئی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں متلک و منعموہ سی گھر میں داخل ہوئی تو مسز بہدانی فوراً مجھے تنگیوں میں کھینچ لے گئیں اور انہوں نے تشویش کے ساتھ پوچھا: ”کیا بات ہے تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟“

میں نے جملہ صورت حال ان کے گوش گزار کی تو وہ بولیں۔

”مفتی صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے۔“

”مگر آپ آپ یہ بھی تو سوچیے کہ واپسی کا جو راستہ انہوں نے بتایا ہے وہ کتنا کٹھن ہے۔“

”وہ تو ہے۔“

”میں اس راستے سے نہیں گزروں گی۔“

”تو واپسی کا خیال بھی ترک کرنا ہوگا۔“

”آپا! مجھے شیراز سے پیار ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”بی بی! دو ہی راستے ہیں ایک صحیح دوسرا غلط۔ اگر غلط راستہ اختیار کرو گی تو وہ بھی نہیں گے جو جانتے ہیں کہ تمہیں طلاق ہو چکی ہے اور تم خدا کی نظروں میں بھی گرجاؤ گی۔ یہ گناہ رسوائی اور ذلت کا راستہ ہوگا اور جو خدا کا متعین کردہ راستہ ہے اس پر بھی اس امر کی ضمانت ممکن نہیں کہ شیراز تک تمہاری واپسی ممکن ہو سکے گی نہیں۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گی آپا۔ میں نے سر ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

مسز بہدانی مجھے تسلیاں دینے لگیں۔



اگلے دن ہفتہ واری تعطیل تھی۔ شیراز خلاف توقع صبح ہی مسز بہدانی کے گھر آدھکے۔ مسز بہدانی نے انہیں ایکسی میں بھولانے کے بجائے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مجھے مازو کے ذریعے بلوایا۔ شیراز کافی الجھے الجھے اور پریشان نظر آتے تھے۔ مسز بہدانی ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر باہر چلی گئیں۔

”رات بھر نہیں سو سکا ہوں میں۔“ شیراز نے شکوہ کن

لکھے ہیں کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے نیند آئی ہوگی۔“

”میری بات کیوں نہیں مان لیتیں تم؟“

”رازی! وہ گناہ کا راستہ ہے اور میں کیسی ہی بدشخص خیال“

آزاد بیچ اور تم سے وابستگی کے حوالے سے آئی سوسائٹی میں

گھوم پھر چکنے والی عورت کیوں نہ سہی بہر حال مسلمان ہوں۔ مجھے

لوگوں سے بھی ڈر لگتا ہے اور خدا کا خوف بھی رکھتی ہوں دل

میں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ان لوگوں کو جو جانتے ہیں کہ میرا

شوہر مجھے طلاق دے چکا ہے اپنے اوپر ہنسوا سکوں اور نہ ہی

میں اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتی ہوں۔“

”لوگوں کی پروا مت کرو۔“

”اور خدا کی؟“

وہ لاجواب سے نظر کرنے لگے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر

بولے ”تو اب کیا کریں؟“

میں اضطراب کے عالم میں بری طرح اپنے ہونٹ دانتوں

سے چبانے لگی۔

”بولو کیا کریں؟ شیراز نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

میں بدستور چپ رہی۔

”یعنی! کسی بھی قیمت پر کسی بھی راستے سے تمہیں میرے

پاس واپس آنا ہوگا؟ شیراز انتہائی جذباتی اور فیصلہ کن لہجے

میں بولے۔

”کسی بھی راستے سے؟ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا

”ہاں۔“

”یعنی؟“

”یعنی یہ کہ اگر تمہیں لوگوں کی اور اپنی عاقبت کی اس قدر

پروا ہے تو تمہیں بحالت مجبوری اس دوسرے راستے سے

گزرنا پڑے گا۔“

”اس بل صراط سے۔“

”ہاں۔“

”کیوں؟ کیوں گزارنا چاہتے ہو تم مجھے اس بل صراط

سے رازی۔“

”کیونکہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی کسی بھی راستے سے

تمہیں مجھ تک لوٹنا ہوگا۔“

”رازی! کتنی بڑی بڑی قربانیاں مانگتے ہو کبھی کبھی تم

مرد ہم عورتوں سے... میں نے شکوہ کیا۔

”جی کاز یو آر میڈ فار ایٹ۔“

”ہاں ٹھیک کہتے ہو تم ہم عورتیں قربانیاں دینے کے

لیے ہی بنائی گئی ہیں۔ اوہ! رازی! تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم مجھ

سے کیا مانگ رہے ہو۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میرے لیے

تمہارے سوا کسی دوسرے مرد کی قربت کا تصور ہی محال

ہے۔ میں رونے لگی۔

شیراز اٹھ کر میرے نزدیک آ بیٹھا اور میرے شانے

پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولے ”ٹھیک ایٹ اینڈی...“

میں مل جل کر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ہے۔ تم تنہا تو

اس بل صراط سے نہیں گزرو گی۔ اس آزمائش سے تو میں بھی

گزروں گا۔“

میں نے سر جھکا دیا۔

تب ہی مسز ہدانی کی ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی

اندر داخل ہوئی۔ مسز ہدانی سمجھ دار خالون تھیں۔ انہوں نے

چائے تو بھجوا دی مگر خود عمل ہونا مناسب نہ سمجھا تھا۔

چائے کے بعد میں نے شیراز سے کہا ”تمہیں آٹے

بہت دیر ہو چکی ہے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب تم چلے جاؤ۔“

”یار! کیسی بے مروتی دکھا رہی ہو تم۔“ انہوں نے

شکوہ کیا۔

”بات بے مروتی کی نہیں گھر دوسروں کا ہے اور غیر

لوگوں سے کتنی ہی بے تکلفی کیوں نہ ہو، بہر حال احتیاط برتنا

پڑتی ہے۔ خصوصاً جب حالات ایسے ہوں جن سے کہ قسمت

نصف مجھے دو چار کر دیتا ہے۔“

”آئی ایم سوری مینی، مگر میری ذرا سی غلطی کے سبب تمہیں

اتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔“ انہوں نے معذرت خواہانہ

لہجے میں کہا۔

”رازی! تمہاری خاطر تو میں سب کچھ برداشت کر سکتی

ہوں... تمہاری خاطر تو میں اس بل صراط سے بھی گزرنے

کو آمادہ ہو گئی ہوں۔“

”تھینک یو... تھینک یو ویری میچ ڈارلنگ...“

اب ہمیں کوئی ایسا سیدھا سا داسا بندہ تلاش کرنا ہوگا جو ہمیں

ایک دوسرے سے ملانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔“

میں ان کا مطلب سمجھ گئی۔

گو میرے لیے یہ خیال ہی روح فرساتا تھا مگر اس

بل صراط سے گزرنے کا چارہ بھی نہ تھا۔

کھانا

اپنی زندگی گزارنے والے جانناہ فری ہاتھ پر منصوبہ بندی  
کے کون گیمز نہیں، یہ سب سے تھا کہ میں اس وقت سے ایک  
منصوبہ کے تحت گن گن ہوں، تاکہ لوگوں کے کہنے سننے  
کی اور انگلیاں اٹھانے کی گیمز نہ رہیں۔ اس سلسلے میں خدا  
کی جانب سے طے والی منزلتوں پر عمل میرا مقدر تھی ہی۔

شیراز کی اور میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔  
سنز ہوائی کوشش نے ان ملاقاتوں سے لاعلم رکھنے کی پوری  
کوشش کی۔ ان سے ملاقاتی مرتبے کے دو اسباب تھے۔ اول  
تو یہ کہ میں ان کا بجایا کی طرح احرام کرتی تھی اور ان کی متانت  
بجائے دل میں احرام تھا۔ دوسرا سبب غالباً یہ خوف تھا  
کہ وہ مجھے غلط مانتے تھے، مگر ان کی کوشش ضرور کوس گئی۔  
مصلحت کے جس طوق کو پہننے پر میں نے شیراز سے آمادگی  
قاہرہ کی تھی، وہ صحیح راستہ تو ہرگز نہ تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی  
منصوبہ بندی تھی۔

اب ایک سیدھے سادے بے ضرر سے آدمی کی  
کوشش جاری تھی جس سے ناما جھٹتا جس آسان ہوا اور ٹوٹتا بھی۔  
اسی دوران میرے ابا پر شیراز نے مجھے قانوناً بھی طلاق  
دے دی۔ ایک وکیل کے توسط سے تیار ہونے والے  
اس قانونی طلاق نامے میں شیراز کی جانب سے یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ  
وہ مجھے چھ سات ماہ قبل زبانی طور پر بھی طلاق دے چکے  
تھے اور یوں شرعاً طلاق ہوئے مذکورہ مدت ہو چکی تھی۔ اس  
طلاق نامے کے ذریعے اس طلاق کی قانونی توثیق کی گئی تھی۔ شرعاً  
میں حدت بھی گزار چکی تھی۔

جب سے شیراز سے دوبارہ تعلقات استوار ہوئے  
تھے تو فترے والی برہانہ تقریباً ہر مذہب کے گھر گھر پہنچانے  
اور کہیں کہیں برصغیر کے وقت میں دفتر تک پہنچنے کا فریضہ  
بڑی خذہ پیشانی کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے مگر ایک  
روز وہ پابجھ کے بگ بگ میرے دفتر آدھکڑ میں نہیں  
رکھ کر کہ گھبرا سی گئی۔

آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔  
بابا! تم کلائنٹس دوسرے ڈپارٹمنٹ میں لے گیا کلائنٹس تم  
سے ملنے نہیں آتے ہوں گے؟ وہ سرگوشی میں بولے۔  
ہاں مگر وہ کلائنٹس ہوتے ہیں؟  
تھکنے دفتر کے لوگ مجھے بھی کوئی کلائنٹ ہی  
بجھیں گے؟

وہ فریضے ہم کلائنٹس کو جانتے پہناتے ہیں؟  
ہی کرئی نیا کلائنٹ ہی تو ہو سکتا ہوں؟

”آل رائٹ! آپ یہ فرمائیں کہ دعوت کیوں کی؟“  
”یاریت وہ کری کھینچ کر نیزہ کنیاں لکھتے ہوئے خدا آگے  
کو جھک گئے۔“ لندن سے ایک دوست آیا ہوا ہے میرا،  
تقریباً مہینہ بھر کے لیے۔ وہ ہمارے کام آسکتا ہے بس ایک  
خوش ہے۔“  
”وہ کیا؟“

”دوست تو ہے میرا لیکن ذرا دل پیچک قسم کا آدمی ہے۔  
شادی تو وہ تم سے خوشی خوشی کرنے لگا بلکہ وہ کیا تمہیں دیکھ کر تو بڑے  
بڑے منا ہر دو عابد بھی ہنس جائیں گے۔ یہ یاد دہری ہے کہ  
سالہ کی نیت نہ بدل جائے۔ تم جیسی دلکش اور دلنواز عورت  
کو کون کا فر چھوڑے گا؟“

”تم اور کون؟ میں نے گھائل بچھے میں کہا۔  
”اس کی منزل بھی تو بھگت رہا ہوں۔ ذرا سوچو کیا یہ ایک  
کٹھن آزمائش نہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو دوبارہ اپنلانے کے لیے  
ایک بندہ تلاش کرتا پھرے؟“  
میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

”ڈارنگ! دوست تو وہ بڑا گرا ہے میرا بس یہی ڈر ہے  
کہ کہیں وہ بے ایمان نہ ہو جائے؟“  
تب ہی کری یا بیٹھو ڈپارٹمنٹ کا کمرشل ڈسٹ بلال مصطفیٰ  
میرے کہیں کے المونیم کی چوکھٹ والے شیشے کے صوفے پر  
ایک ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا اور اس نے سبزنگ  
کا ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا: ”مس قرۃ العین!  
پانچ تاریخ کی شام کو آرٹس کونسل میں میری تصاویر کی نمائش ہے۔  
یہ آپ کا دعوت نامہ ہے۔“

”اوہ! تھینک یو۔“ میں نے لفافہ بلال سے لے لیا اور  
کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”بیٹھو۔“  
”بس اب چلوں گا میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔“  
”یعنی تمہاری چھٹی کا وقت ہو چکا ہے؟ میں مسکرائی۔  
”جی۔“ جواباً وہ بھی مسکرا دیا اور چلتے ہوئے ٹوٹا: ”آپ  
آئیں گی نا؟“

”ضرور۔۔۔ ہائی دی وے بلال کیا میں پوچھ سکتی ہوں  
کہ اس نمائش میں تم کتنی تصویروں رکھ رہے ہو؟“  
”پچاس سے زائد۔“  
”گڈ!“

”اس نمائش کے سلسلے میں میں نے یہاں سے ایک  
پختہ کی چھٹی لے لی ہے۔ کل سے میں چھٹی پر ہوں اور اب  
پچھ تاریخ کو جوائن کروں گا۔ آپ یاد رکھیے گا کہ پانچ تاریخ کو



تلاش آئی اور ڈانٹ مارو... اور کسی بھی قیمت پر میں تمہیں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں!"

میرے دل سے ہوا کرتے ہو میرے دل سے بعد ناز کیا۔  
تمہارے دفتر کا وہ آرٹسٹ بالکل ٹھیک رہے گا! میں نے بس سے شیراز کی طرف دیکھا وہ اپنی کمرے سے تڑپتے ہوئے آئے اور کرسی کی پشت کی آڑ میں اپنا بازو لگا کر میری کمرے کے گرد مائل کر دیا۔  
پہلیز میں کس آکر دور ہو گئی۔

شیراز نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے۔  
"میں نے لورٹے کہا ہے کہ تم مجھے اپنے قریب نہیں لے سکتے۔"

بلال... دور رہو، تو تم نے غور ہی کیا تھا! میں نے گھاٹں نکھا ہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
"مصلیٰ کی سزا جگت، تو رہا... وہ شرمندہ نظر آئے لگے پھر لے۔" بستری سے کہ تم وقت ضائع کرنے کے بجائے اس آرٹسٹ کو چاکس لو۔ اور اس لیے میں وہ خاصا ٹھیک ٹھاک رہے گا!"

"وہ شریف آدمی ہے۔ رازی!"  
"تو تم کون سے پدمشاہی ہیں!"  
"کیا کسی شریف آدمی کو میں یوز اور ایکسپلاٹ کرنا ہوا ہوتا ہے؟"

یار! دوبارہ شخص کے لیے ہیں کسی نہ کسی کا استعمال کرنا ہی ہوتا ہے گا۔ لہذا یہ قدری کہ اتنے مجھے تو ضرور پاگل کو سے گی۔ تم نہیں جانتیں تمہارے بغیر میں کیسا پاگل ہوا جا رہا ہوں... جین کر ڈم میں تڑپ رہا ہوں!"

شب!  
شب!  
دفتہ میرے بازو پر جو میں نے کہنی کے جوڑ کر ڈالتے ہوئے میز پر دھر رکھا تھا چند قطرے گرے۔ میں نے چونک کر شیراز کی طرف دیکھا وہ رو رہے تھے میرا دل چھیننے لگا میں نے اپنے بگ سے رومال نکال کر شیراز کی طرف بڑھانے ہوئے سر جھکا کر شکست خوردہ اور مجبور لہجے میں کہا: "اوکھا آئی دل ٹرائی!"

شیراز نے رومال سے اپنی آنکھیں بلوچتے ہوئے کہا۔  
"کوشش نہیں... تمہیں ایسا کرنا ہے اپنی خاطر نہ کسی میری خاطر!"  
میں ایک ٹھنڈی مٹھی بھر کے رہ گئی۔

واپسی پر اس نے میں شیراز نے کہا مجھے یقین ہے کہ جب تم اس کی طرف اتنے بڑھاؤ گی تو وہ تمہارا ہاتھ تمام لینے پر مجبور ہو گا!"

میں ایک ان کی کشمکش سے دوچار تھی۔ میرے گلن میں بھی نہ تھا کہ حالات کا دھاما اس رخ پر بہنے لگے گا۔  
خدا یا! خدا یا! تو نے ہم مجبوروں کے مقدر میں ایسی آزمائشیں کیوں لکھ دی ہیں! میں اس سختی سے اپنے دونوں جڑے باہر پھینچنے سوچ رہی تھی۔



شیراز کا اتنا نہ درست تھا بلال مصطفیٰ میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہو گیا۔  
اور اس کے لیے مجھے زیادہ جگ دو نہیں کرنا پڑی۔  
تصویروں کی نمائش دس دن میں خاص اہتمام سے تیار ہو کر تقریب میں پہنچی اور بلال کی تصاویر سے زیادہ حاضرین کے توجہ کا مرکز بنی رہی۔ سہ پہر کو نمائش کا افتتاح ہوا اور رات کا اندھیرا چھیننے تک شائقین جن ایک ایک کے رخصت ہوئے مگر میں آخر تک بڑکی رہی۔ نمائش سہ روزہ تھی، اس لیے بلال کو اسباب سیٹھنے کی فکر نہ تھی۔ بلال کو منتقل کرنا آرٹس کونسل کے منتظمین کی ذمہ داری تھی۔ بلال سے نکلنے والے آخری دو نفوس میں اور بلال تھے۔ آرٹس کونسل کی سیڑھیاں اتر کر جب ہم نیچے پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔

"اب آپ کیسے جائیں گی؟" بلال نے پوچھا۔  
"اس وقت تو یہاں سے کوئی سواری بھی ملنا مشکل ہوگی!"  
میں نے مصنوعی فکر نہی کا اظہار کیا۔  
"اُسے باہر نکل کر دیکھتے ہیں شاید کچھ مل جائے بلال نے اپنے اسکوٹر کو آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں تک جاؤ گے؟"  
"نیڈل کی پیشل ایریا!"  
"وہیں ہے تمہارا گھر؟" میں نے قدم بہ قدم بلال کے ساتھ آرٹس کونسل کے صدر دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے پوچھا۔

"گھر کیا ہے دو دروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ ایک کمرے کو... اسکوٹر کے طور پر استعمال کرتا ہوں، دو کمرے کر دس باہری کے لیے ہے۔ بلال نیم خم اسکوٹر کو آگے دھکیل رہا تھا۔  
"گھر میں اور کون کون ہے؟"  
"کوئی نہیں!"

کیا مطلب ہے؟

مطلب یہ کہ شادی کی نہیں ہے ابھی، والدین مر رہے ہوں  
فوت ہو چکے، ایک شادی شدہ بہن تھان میں رہتی ہے باقی یہ  
فقیر ہے اور اللہ کا نام ہے

دویری گڈ! میں نے دل میں کہا۔

ہم آرمی کونسل کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور موٹر  
کاٹ کر بس اسٹاپ پر آکھڑے ہوئے تھے۔

مختاری تصویریں مجھے بہت پسند آئیں!

شکر یہ!

تب ہی ایک بس آتی نظر آئی۔

آپ کو جانا کہاں ہے؟

سوسائٹی!

آگے آپ اس بس سے حد تک چلی جائیں تو وہاں سے  
آپ کو سوسائٹی کے لیے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے  
گی، جلال نے تجویز کیا۔

سات ہو گئی ہے اب میں صدر میں اتر کر کہاں غوار  
ہوتی پھروں گی؟  
بس آئی اور چلی گئی۔

ہم دونوں بہت دیر تک چکیتی دیکتی مدھنیوں والے  
ٹریک کے بیچوں میں عالی رکشا کے متلاشی رہے، ایک  
رکشا عالی بلا بھی ٹر ٹر خوش قسمتی سے سوسائٹی جانے پر آمادہ  
نہ ہوا بہت دیر ہونے لگی تو میں نے کہا: تمہیں بھی میری وجہ  
سے پریشان ہونا پڑ گیا ہے؟

میں کوئی بات نہیں۔ یوں بھی گھر پر کون میرا منتظر بیٹھا  
ہے جب پہنچوں نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ فکر کرنے والا!  
شادی کر لو!

وہ چپ رہا۔

زیادہ دیر ہونے لگی تو میں نے پوچھا: یہ بتاؤ جلال تم  
گھر کس رستے سے جاتے ہو؟

کبھی گرومنڈرے کبھی سوسائٹی اور حسن اسکوٹر سے  
ہوتا ہوا!

دویری گڈ تو اس کا مطلب ہے تم سوسائٹی کے رستے  
بھی اپنے گھر جاتے ہو؟

جی ہاں!

اوسے تو پھر ایسا کرو تا تم مجھے سوسائٹی چھوڑتے  
ہوئے چلے جانا!

اسکوٹر پر!

ہاں، مجھ سے کہو کیا کیا ہائے!

آگے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو میں اس  
کی مرضی!

میں سنبھل کر اسکوٹر پر چل کر پچھلے بیٹھ گئی اور آن  
کی آن جلال کی اسکوٹر شہر کی پر رونے لگیوں پر نہ لگنے لگی۔ میرا  
دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

سوسائٹی کے علاقے میں پہنچنے کے بعد مجھے جلال کے

رہنمائی کے لیے راستہ بتانا پڑا۔ اسکوٹر میں نے مسز جلال کے

گھر سے کچھ فاصلے پر رکوائی اور اسکوٹر سے اترتے ہوئے کہا:

آئی ایم سوری جلال! میں تمہیں ایک کپ ہائٹس کے لیے بھیج رہی

نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ میرا گھر نہیں بلکہ میرا گھر ہے!

کوئی بات نہیں، جلال نے کہا۔

اوسے... تمہیں کس دویری پر چلے!

جلال کے جانے کے بعد مسز جلال کے گھر کے صدر

دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے میں نے ہی ہی جی

میں کہا: ہاڑی اکیسی آزمائش سے گزار رہی ہے تمہارا ایک

غصی مجھے!

فیٹ فلاؤ نے کھولا۔ میں مسز جلال کی گری سوالیہ

تھا ہوں سے بچنے کی خاطر اکیسی میں چلی گئی جب سے میرے

گھر آنے کے اوقات جانے کے مسز جلال مجھے خاصی گری اور

سنی خیز لگا ہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔



پندرہ بیس دن کے اندر اندر میں نے جلال سے

بے تکلفانہ تعلقات استوار کر لیے تھے پھر ایک روز اس

کا اسٹوڈیو دیکھنے کے بہانے میں فیڈل کوشیل ایریا میں واقع

اس کے دو کمروں کے ٹیلیٹ پر جا پہنچی۔ یہ ٹیلیٹ اس نے

کرانے پر لے رکھا تھا۔ ایک گرو اسٹوڈیو بنا ہوا تھا اور وہ

کمرے کی حالت کسی کباڑ خانے سے کم نہ تھی۔ دھول مٹی،

سگریٹ کے بے شمار ٹوٹے، میسے کپڑوں کا ڈھیر، مثیلے

رنگ کا بستہ زسے تزیین اسباب۔ باورچی خانہ بے جگہ

ہو رہا تھا۔ وہاں سے ڈھنگے سے برتن تھے اور چائے کی

چند ٹوٹی چھوٹی گندی پیالیاں۔

مان گاڈ! جلال تم یہاں رہتے ہو؟ میں نے منہ بناتے

ہوئے کہا۔

کیا کرنا، غریب آدمی ہوں، آپ کی طرح سوسائٹی میں

تو نہیں رہ سکتا!

غریب تو غیر تم نہیں ہو۔ اچھا جلال کتنے بڑے میں بناتے



جاتی ہیں... دوسری بات یہ کہ تم نے میری بات کو غلامی  
میں سمجھا ہے جس کو دراصل یہ کتنا چاہ رہی تھی کہ اس قدر لاکھ  
سہا ادا ہے قریب گھرا

گھر عورت سے بنتا ہے اور اس گھر میں عورت ہے  
نہیں۔ اسی لیے تو ابال کہہ گئے ہیں کہ جس وجود زن سے ہے  
تصویر کائنات میں رنگ؟

سوال ہے کہ عورت کیوں نہیں ہے اس گھر میں؟  
میر نے بلال سے نظر میں چراتے ہوئے کہا۔  
وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

شادی کر لیجئے؟  
مدیم! اگر صرف شادی ہی کرنا ہوتی تو میں کب کی کر  
چکا ہوتا؟

کیا مطلب؟  
مطلب یہ کہ ہم آرٹسٹ لوگ آئیڈیلز کے سہارے  
جیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک عورت کو گھر میں لاؤں اور  
اس میں اپنا آئیڈیل کھوجتا ہوں۔ یہ بددہانتی ہوگی؟  
مخار سے آئیڈیل میں کیا خوبیاں ہیں؟  
رہنے دیکھے..... نہ پوچھیے؟ وہ نظر میں چراتے  
ہوئے بولا۔

میر نے اس روز اتنی ہی یورش کانی بھی۔  
چلنے نہیں گی؟  
چلاؤ گے تو تپ لوں گی؟  
اچھا! آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی بسنا کر  
لاتا ہوں چلئے؟  
کیا چلئے تم خود بناؤ گے؟  
جی ہاں! وہ مسکرا دیا۔

بلال کے باورچی خانے میں جانے کے بعد میں ماشی  
اور میں نے کمرے کی بے ترتیب چیزوں کو ترتیب سے  
رکھنا شروع کیا۔ بستر کی جاڑ بھاڑ کو دوبارہ بچھائی۔ کمرے  
کی شرقی دیوار کے ساتھ جھاڑو پڑی تھی۔ جھاڑو سے میرے  
تے کمرے کا فرش صاف کیا اور سگریٹ کے ٹوٹے لور کوڑا  
کمرے کے دروازے کے پیچھے دھیر کر دیا۔  
بلال چلنے لے کر آیا تو کمرے کی حالت میں غامض تبدیلی  
دیکھنا ہو چکی تھی۔

ارے اب آپ نے کیا کیا؟  
بے ترتیبی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی؟  
تمہیں کب پوچھا وہ چلنے کا رنگ میری طرف بڑھاتے

ہوئے بولا۔

ایک معاہدہ کر لو۔ میں سب تک تھامتے ہوئے کہا  
کیسا معاہدہ؟

میں یہاں اگر یہ بے ترتیبی دور کر دیا کروں گی اور تم مجھے  
برنگوں سے کھینا سکا دو گے؟

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر بولا کیا  
آپ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں؟  
پوری سنجیدگی سے؟  
اوکے..... مجھے شکوک ہے؟

پھر ہر شام شیراز مجھے ریموے کراٹنگ تک چھوڑنے  
گئے وہیں سے میں پیدل بلال کے فلیٹ تک نکل جاتی۔ واپسی  
پر بلال مجھے مسز بہدانی کی کوٹھی سے کچھ دور چھوڑ دیتا۔ مسز بہدانی  
کے مدتیے اور ان کے چہرے کے تاثرات سے میرے  
لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ میرے شوقی مصوری کو  
تالپندہ بدہنگاموں سے دیکھ رہی تھیں ان سے میں نے  
یہی بہانہ کیا تھا کہ میں دفتر سے واپسی پر ایک آرٹسٹ سے  
مصوری سیکھنے جا رہی ہوں۔ ویسے میں نے فلوٹ بھی کب  
کھاتا اور یوں بھی اب مجھے مسز بہدانی کے ہال کتے دن  
اور رہنا تھا!



شیراز بے تابی سے میرے اور بلال کے رشتہ ناکت  
میں بندہ جاننے کے منتظر تھے کیوں کہ اسی راستے سے مجھے  
ان کے پاس واپس جانا تھا۔ میری اب ان سے تقریباً ہر روز  
ملاقات ہونے لگی تھی۔ ہارٹ انخوں نے مجھ سے گھر چلنے پر  
اصرار کیا مگر میں ہر بار ٹال گئی۔ اس گھر سے میرا ناتا کوٹھے کئی  
ماہ گزرنے کے تھے جس گھر پر کبھی میرے حکم کا سکتا جلتا تھا اور  
چاکر میری نظر کے اشارے پر چلتے تھے۔ انہی سے نظر میں چرا  
کہ اس گھر میں داخل ہونا مجھے گوارا نہ تھا۔ گو شیراز یہ کہتے تھے  
کہ نہ لو کروں کو اصل قہقہے کا علم ہے اور نہ ہی انخوں نے اپنے  
علقہ احباب میں مجھے دی جانے والی طلاق کا کوئی تذکرہ کیا  
تھا۔ مگر مجھے ذہنی طور پر اس گھر کے اور اپنے درمیان ایک  
تعلیق مائل محسوس ہوتی تھی۔

اس بچے کی طرح جس کی اسکول سے واپسی پر اس کے  
ماں اس سے اسکول میں کیے جانے والے اور گھر پر کونے  
کے لیے دیے جانے والے کام کی بابت استفسار کرنے بیٹھ  
جائے شیراز بھی بلاناظر میرے اور بلال کی روز افزوں بے تکلفی  
کے جدول پر ایک نقطہ نکا کر پھیلے نقطے کو اگلے سے ملا دیتے۔

شروع شروع مجھے بڑی ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی پھر میرے  
 مادی سی ہو گئی۔ ہر روز تادم ترین صورت حال شیراز کے گوش گزار  
 کرتے ہوئے کبھی تو مجھے شیراز پر ترس آنے لگتا۔ بے چارے  
 کس قدر صبر و تحمل سے سنا کرتے تھے اور کبھی مجھے جھجلاہٹ  
 سی ہونے لگتی۔ شیراز پر غصہ آنے لگتا ان کی ایک فطرت  
 مجھے کیسی صلیب پر لٹکا دیا تھا اور کبھی وہ مجھے بڑے اجنبی  
 اور بیگانہ محسوس ہونے لگتے۔ اپنا مرد جھلاہٹ کی زبان  
 سے غیر مرد سے استوار ہوتے تعلقات کی کتھا کہاں سنتا  
 ہے اور اگر سنتا ہے تو نہ وہ اپنا ہوتا ہے نہ باخیرت اور  
 نہ باضمیر!

بلال سے میرے تعلقات کا گراف جس تیزی سے  
 اوپر گیا اس میں میری یہ شعوری خواہش بھی پورے طوق کا ڈھرا  
 تھی کہ میں بے یقینی، تذبذب، کوفت اور ڈانواں ڈول کیفیت  
 سے نکل کر جلد از جلد اس خلیج کے جویر سے اور شیراز کے  
 مائیں مائل تھی اس پار پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں شیراز میرے  
 منتظر تھے شیراز اس ضمن میں مجھ سے بھی زیادہ مضطرب  
 تھے وہ چاہتے تھے کہ یہ گراف پوری تیزی سے اپنی انتہائی حد  
 پر پہنچ جائے اور اس آٹری حد سے ٹکرا کر ایک بیک ہارہ پارہ  
 ہو جائے یا ہر عروج کو زوال کے مصداق بننے لگے۔

بلال کتنا ہی شریف، مقرب اور محتاط کیوں نہ ہو جہاں  
 ایک مدت تھا اور میں غرض اور اندھی محبت کی ماری ایک ایسی  
 عورت جو پگتے ہوئے چھل کی طرح کسی بھی لمحے جلال کی جھولی میں  
 گرنے کو تیار تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ  
 میں شیراز کو دو بارہ ہانسنے کی خاطر اپنے مقام سے ہٹنے پر گئی  
 تھی اور ان دنوں میں کھیل کھیل رہی تھی تنہائی میں مجھے اس  
 پر انتہائی کوفت، ہونی وغورہ اپنے سگمن آنے لگی اور شیراز  
 سے بھی۔

پھر ایک روز وہ موقع آ گیا جس کی میں منتظر تھی اور  
 شیراز بھی!

بلال نہ کچھا۔ تے ہوئے مجھ سے کہا: میرے ایک  
 پڑوسی نے لی جے عجیب سی بات بتائی ہے۔  
 ”وہ کیا؟“

بلال نے سر جھکایا اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا: آپ  
 کے روزانہ یہاں آنے اور کئی کئی گھنٹے فلیٹ میں رہنے کو نکلنے  
 والے کچھ عجیب منظر ہوں سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ اصل میں  
 یہاں لوئر مڈل اور مڈل کلاس کے لوگ رہتے ہیں اس لیے  
 یہ مسند ہوا نہ اگر کئی کئی خوش پوش علاقے میں رہ رہا ہوتا تو دن

میں ایک عین میں عورتیں آئیں میرے فلیٹ میں تو کوئی رہا  
 نہ کرتا۔

”گو خوش پوش علاقوں میں رہنے والے اخلاقی اقدار و قیود  
 کی پروا نہیں کرتے۔ میرے لیے میں اعتراض کی تو تھی۔“  
 ”ہاں یہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ خوش پوش علاقوں میں سے  
 رہنے والوں کی اپنی مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ وہ دوسروں  
 کی کھوج میں رہتے ہیں نہ پروا کرتے ہیں۔“  
 ”یعنی تمہیں دوسروں کی پروا ہے؟“  
 ”مبورا کرنا ہوگی؟“

”اس کا مطلب ہے میں گل سے یہاں نہ آؤں؟“  
 ”وہ سوچ میں پڑ گیا پھر ایک گرمی سانس لینے کے  
 بعد بولا: ”آپ کے نہ آنے سے یہ ساری تزیین جو آپ  
 نے اس فلیٹ کی بے ترمیمی کو بخشی ہے بکھر جائے گی؟“  
 ”شادی کر لو یہ میں نے مشورہ کیا۔“

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ وہ محتاط لہجے  
 میں بولا۔  
 ”مترود؟“

”بیشرطیکہ آپ جتنا نہ مٹائیں؟“  
 ”کبھی میں بہت زور دے رہا ہوں کہ تمہی بلال مگر اب  
 چوٹی موٹی باتیں میرے احساس کا بل بھی بیکار نہیں کرتیں۔  
 بلکہ بسا اوقات رنگ ہنپانے والی بعض بڑی بڑی باتوں کو بھی  
 میں ہنسنے مسکراتے ہی جاتی ہوں۔“

وہ چند لحظے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا: ”آپ اس طرز زندگی  
 کب تک گزاریں گی؟“  
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ۔۔۔۔۔ جوان ہیں، حسین ہیں، عورت  
 ہیں۔۔۔۔۔ تنہا کب تک رہ سکیں گی؟“

”تنہائی تو اب مقدر بن چکی ہے بلال ویسے بھی ایک  
 مطلقہ عورت کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ مطلقہ عورت کو  
 تو لوگ ہمیشہ تنگ و شبح کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“  
 ”خیال نہیں یہ حقیقت ہے اور اسی لیے مجھے اپنے  
 موجودہ حیثیت سے خوف آنے لگا ہے، حالانکہ میں طے  
 کر چکی تھی کہ اب کبھی کوئی مرد میری زندگی میں نہیں آئے گا مگر  
 تنہائی کا عفریت اور لوگوں کی معنی خیز نگاہیں مجھے ڈر سے  
 لیتی ہیں۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا: ”تو گویا آپ

... وہ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔

ہاں بلال... میں کسی شریف اور پُر خلوص شخص کی تلاش میں ہوں، میں نے مدغم نمریوں میں گیا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولا لیکن مات کا اندھیرا چھا جانے کے بعد جب وہ حسب معمول مجھے اپنی اسکوٹریز پر ماری ماضی پناہ گاہ تک پہنچانے آیا تو اس نے مسز بھدانی کے گھر سے ایک مخصوص قاصدے پر مجھے چھوڑ کر واپس جانے سے قبل کہا: "مات سب سمجھیں تو میرے باسے میں سوچے گا خلوص کی کسوٹی پر کھٹانہ پائیں گی آپ مجھے"

نیم تاریکی میں نہ تو میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ پائی اور نہ وہ اس فاتحانہ مسکراہٹ کو دیکھ سکا ہوگا جو میرے لبوں تک نمود کر آئی تھی!

پھر وہ چلا گیا۔

اگلے روز میں بلال کے فلیٹ پر تو نہ گئی تاہم غیر از سے حسب معمول ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں گزشتہ روز بلال سے ہونے والی گفتگو کا احوال سنا یا تو وہ سگڑ سگڑتے ہوئے بولے: "ویل ٹون مائی ڈار لنگ... اویل ڈون"

صرف تمھاری خاطر میں نے کہا۔

مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ کس قدر دیوانی ہوئی جا رہی تھی میں اس جفا جو مرد کے عشق میں!

"دل چھوٹا مت کرو... ایک بار موقع ملنے دو مجھے ساری شکایتیں دور کر دوں گا تمھاری"

مگر یہ ایک شکایت تم کبھی دور نہ کر سکو گے رازی کہ تمھاری ایک فلسفی نے مجھے خود اپنی نظروں میں بھی کتنا بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ دل کی یہ بات میں زبان پر نہ لاسکی۔



پھر دو تین روز بلال سے کوئی بات نہ ہو سکی وہ مقررہ وقت پر آتا اپنا کام نمٹاتا اور حسب قاعدہ چار سو چار بجے کے لگ بھگ واپس چلا جاتا۔ میں اپنے کیمین میں بیٹھی بیٹھے کے دروازے سے اسے آتا اور جاتا دیکھتی رہی۔ غالباً تیسرے یا چوتھے دن میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دفتر سے خلاف معمول جلدی نکلی۔ زینہ اتارنے ہوئے تیس نے اسے پکارا تو وہ جو تک کر پٹا اور رک گیا۔

"کیا بہت جلدی میں ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں"

تو کیوں اتنی تیزی سے بیڑھیاں پھلانگ رہے ہو۔ ایک وقت دو دو مٹھاپس۔

وہ مسکرا دیا پھر بولا: "یہ تو میری عادت ہے"۔ مڑ کر پیچھے آئے والوں کو بھی دیکھ لیا کرو: اس کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی تھی اور میں بیڑھیاں اتارنی اس کے نزدیک جا پہنچی تھی۔

تم سے مین چار دن کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ میں نے اگلی سیر می پر قدم بڑھانے ہوئے کہا۔ "جی شاید" وہ میرا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ "شاید نہیں یقیناً"

جی یقیناً"

میں اس کی صلح پسندی پر مسکرا دی۔

تم نے ایک جواب طلب بات کہی تھی مجھ سے؟

جی... کبھی تو تھی؟

اور بھول گئے؟

جی نہیں بلکہ میں تو جواب کا منتظر رہا؟

آئندہ ایسی فلسفی مت کرنا جواب کا انتظار نہیں کیا جاتا جواب طلب کیا جاتا ہے؟

بقیہ دس بارہ قدم ہم خاموشی سے نیچے اترے سر لہرائی میں وہ رک گیا اور اس نے میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا: "اچھا... تو سمجھ لیجیے کہ میں جواب طلب کر رہا ہوں"

"ہوں... میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر اس سے نظر بس چراتے ہوئے کہا: "میں نے تمھارے باسے میں اچھی طرح سوچا ہے بلال اور... میں سے راضی ہوں"

اس کی آنکھوں میں بے یقینی ہلکے لینے لگی پھر اس نے سر جھٹکا اور ہنس دیا۔

"لیکن کوئی شور شرابا نہیں جو کچھ ہوگا خاموشی سے ہوگا: میں نے مشروطاً انداز میں جتایا۔

"کیا میں یقین کر لوں؟"

"ہزار فی صد"

میں اس کی آنکھوں میں مسترت کی لہریں اٹھتے دیکھ رہی تھی۔



اسی بیٹھے ہم دونوں نے سادگی سے نکاح کر لیا۔ اب بچیا کو محالات سے لاعلم رکھنے کے لیے مسز بھدانی

کیا تم نے اس شخص کو جس سے تم نے نکاح کیا ہے پایا  
 رہا ہے کہ تم اس سے نکاح کیوں کر رہی ہو؟  
 ”جی نہیں.... میں بھلا کیسے جتا سکتی تھی؟“  
 بیکل کیا ہر ج تھا جب ایک باقاعدہ منصوبے کے  
 تحت تم نے اس سے نکاح کیا ہے تو وہ تو اس منصوبے کا گہری  
 کردار ہے؟

”مجھے شرمندہ نہ کریں آبا“  
 مجھے اس شخص پر ترس آ رہا ہے جس کا تمہارے ہاتھوں  
 استعمال ہوا ہے اور مزید ہو گا؟  
 ”آبا! ایک التجا ہے آپ سے؟“  
 ”کہ میں تو کو اب بھی کچھ نہ لکھوں؟ مسز بھلائی کی جماندگی  
 نے میرے دل کی بات تاڑ لی۔  
 ”وہ ناحق پریشان ہوں گی؟“

”اب مجھے انسوس ہو رہا ہے اور اپنی قلبی کا احساس  
 بھی کہ اگر میں نے اول روز نور کو سب کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید  
 حالت اتنی ابتر صورت نہ اختیار کرتے۔ سچی بات سنا مجھے  
 تو اس حد میں شیراز کا کم سے کم کے لیے یہاں آنا ایک آٹھ نہ  
 مہا یا تھا۔ جو مرد عورت کو چھوڑ چکا وہ مہرم کہاں رہا اور اگر  
 وہ دونوں ملتے ہیں تو اخلاقی فیروہ کے پھال ہونے کا ہمیشہ  
 خطرہ رہتا ہے؟“

”میں اضطراب کے عالم میں ایک ہاتھ کی انگلیوں سے  
 دوسرے ہاتھ کی انگلیاں چٹانے لگی۔ مسز بھلائی کو کیا پتا تھا  
 کہ میں شیراز سے مدد مانگتی رہی تھی اور اس کی کیا پر میں نے  
 بھلائی کے ساتھ یہ ٹالک کھیلا تھا!

”آبا! آپ بھلائی کو کچھ نہیں کہیں گی نا؟“  
 ”بھلائی! اس منہ سے نکھوں گی اب۔ کیا وہ مجھ سے شکوہ  
 نہ کرے گی کہ اتنے دن سے میں نے کیوں نہ لکھا ہے؟ بدبو جو بھی  
 لکھوں خود ہی کھتا؟“  
 ”تھیک یو... تھیک یو آبا۔“



ازدواجی رشتے میں منسک ہو جانے کے بعد بھلائی  
 نے چاہا کہ میں ملازمت کو خیر باد کہہ کر گھر بیٹھ رہوں۔ مجھے  
 ذرا تردد نہ ہوا بلکہ میں نے ملازمت کو خیر باد کہہ دینا ناگزیر  
 سمجھا۔ کیوں کہ اسی طور میں شیراز سے ملنے کے لیے سارا کمال  
 کتنی تھی۔ دوپہر بارہ تا چار بجے سہ پہر بھلائی کو الفافہ میں کام کرنا  
 ہوتا تھا۔ ان چار گھنٹوں کے علاوہ اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔  
 گویا اپنی چار گھنٹوں کے دوران کسی وقت میں شیراز سے ملنے

کو گھری جانب سے پھیلے کچھ عرصے میں کہنے سی گئی تھیں احمد  
 میں لینا ضروری تھا ان کا گھر چھوڑنے سے قبل جب میں سے  
 نے اٹھیں بتایا کہ میں اپنے دفتر کے ایک ساتھی سے نکاح  
 کر چکی ہوں تو کچھ دیر کو نورہ میرا منہ دیکھتی رہ گئیں پھر بولیں۔  
 ”بھلائی! تمہارے دوستے میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے مجھے  
 بار بار یہی کھشکا ہوا تھا کہ تم ضرور کسی جگہ میں ہو؟“

”میرے لیے دعا کیجئے گا آبا؟“  
 ”دیکھو! ایسے تو تم خود مختار ہو مگر میں یہ کہے بنا نہیں رہ  
 سکتی کہ تم نے اس شخص میں مجھ سے غیرت اور رازداری برت  
 کر مجھے دکھ پہنچایا ہے؟“  
 ”آئی ایم سوری آبا....“ میں نے مسز بھلائی کے گلے  
 میں اپنی باہیں مائل کرتے ہوئے کہا۔ ”اصل میں صدمت حال  
 ہی کچھ ایسی تھی؟“

”اور یہ سب کچھ تم نے شیراز کے پاس بولیں جانے  
 کے لیے کیا ہے؟“ وہ تادری اور استغناء یہ لہجے میں بولیں۔  
 ”میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں نے سب کچھ  
 کر کہا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موقع پر تم سے کیا کیوں  
 بہر حال اتنا ضرور کیوں گی کہ اسلامی احکامات و تعلیمات کے  
 سلسلے میں اپنی غرض کو مد نظر رکھ کر منصوبہ بندی کرنا نیت کا  
 فتور ہے اور اسلام زندگی کے ہر معاملے میں نیت کی راستی کو  
 اہمیت دیتا ہے؟“

”میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا آبا۔“  
 ”کیوں نہیں تھا.... لعنت مجھ پر شیراز پر اور کسی  
 شریف و نیک طبیعت آدمی کا ہاتھ تھا۔ تمام لینیں علاوہ کا اہمیت  
 اور اس کے جائز ہونے سے مجھے انکار نہیں ہے۔ اگر مقدر  
 کا ہاتھ سونے اتفاق تھیں شیراز کے پاس واپس لے جاتا تو  
 بات دوسری تھی مگر جو راستہ تم نے اختیار کرنے کی کوشش  
 کی ہے اسے تو میں عورت کی تذلیل سمجھتی ہوں۔ عورت انسان  
 ہے گھلونا تو نہیں کہ جب مرد نے ہاتھ اٹھا کر پھینک دیا اور جب  
 چاہا زمین سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو  
 ہرگز ہرگز ایسی حماقت نہ کرتی جیسی کہ تم کر رہی ہو؟“  
 ”کاش! آپ نے کسی سے محبت کی ہوتی؟ میں یہ کہے  
 پتا نہ سکا۔“

”جو محبت، مادہ ذلت و رسوائی ہو اسے میں محبت نہیں  
 جہل ثابت کستی ہوں؟“  
 میں چہچہ ہی رہی۔



”پوچھے تو بتا دو“

”کیا...؟ کیا بتاؤں؟“

”یہی کہ تم نے اس سے محض اس لیے شادی کی تھی کہ تم اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھیں“

”اوہ...!“ میں نے اپنا سر بے بسی سے ہاتھوں میں تنگ لیا۔

”اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ ان کا لہجہ اور تیکھا ہو گیا۔

”تم... تم... نہیں... سمجھ کتے رازی؟“

”گناہ ہے تم خود اسے نہیں چھوڑنا چاہتیں؟“

”یہ... یہ تم کہہ رہے ہو رازی... تم! جس کی خاطر میں نے خود کو داؤ پر لگا دیا ہے؟“

”بس تو ختم کرو اب یہ قصہ... کہہ دو کہ میں طلاق چاہتی ہوں؟“

”رازی! وہ اس قدر سیدھا سادا نہیں ہے جتنا کہ ہمارا اندازہ تھا۔ مجھے اس سے بہت سنبھل کر، بڑی اعتیلا سے بات کرنا پڑے گی... مجھے سوچنا پڑے گا کہ میں اس سے طلاق کا مطالبہ کیوں کر کروں؟“

شیراز کا سر میں گیا تھا۔ وہ خفا خفا سے نظر اٹھے تھے۔

”الٹی کس شکل میں گرفتار ہو گئی ہوں میں!“ میں نے بے بسی سے سوچا۔

دن کا بقیہ حتمہ انتہائی کوفت میں گزرا۔

شام کے وقت جب بلال اسٹوڈیو میں معروف کار تھا اور میں اس کے لیے باورچی خانے میں کھڑی چائے بنا رہی تھی، دودھ کی بچی چولھے پر دھری تھی، دوپہر کو غیر از کی زبلیں سے ادا ہونے والے چند تکلیف دہ الفاظ نے مجھے آگے اخیالات کی بدیلیں اتنی دور نکل گئی کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ کب دودھ آبل آئی کہ رچی سے گرنے لگا اور کب بلال میرے عقب میں آکھڑا ہوا۔ میں تو اس وقت چونکی جب بلال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”عین! یہ دودھ آبل رہا ہے یا منی نیا گرافال جو آپ اس قدر محویت سے دیکھ رہی ہیں۔“

”اے... ہاں...“ میں چونکی اور میں نے دودھ کو کس دیکھی کی جانب اٹھ بڑھانے مگر بلال نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیے اور مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا: ”آپ کو شاید اپنے ہاتھوں کے جل جانے کی پروا نہ ہو مگر مجھے ہے۔“

میں نے اس کا بقیہ حتمہ انتہائی کوفت میں گزرا۔

شام کے وقت جب بلال اسٹوڈیو میں معروف کار تھا اور میں اس کے لیے باورچی خانے میں کھڑی چائے بنا رہی تھی، دودھ کی بچی چولھے پر دھری تھی، دوپہر کو غیر از کی زبلیں سے ادا ہونے والے چند تکلیف دہ الفاظ نے مجھے آگے اخیالات کی بدیلیں اتنی دور نکل گئی کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ کب دودھ آبل آئی کہ رچی سے گرنے لگا اور کب بلال میرے عقب میں آکھڑا ہوا۔ میں تو اس وقت چونکی جب بلال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”عین! یہ دودھ آبل رہا ہے یا منی نیا گرافال جو آپ اس قدر محویت سے دیکھ رہی ہیں۔“

”اے... ہاں...“ میں چونکی اور میں نے دودھ کو کس دیکھی کی جانب اٹھ بڑھانے مگر بلال نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیے اور مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا: ”آپ کو شاید اپنے ہاتھوں کے جل جانے کی پروا نہ ہو مگر مجھے ہے۔“

میں نے اس کا بقیہ حتمہ انتہائی کوفت میں گزرا۔

میں کیسے بتائی اسے کہ میرا تون میں جل رہا تھا!

پھر بلال نے میرا ہاتھ چھوڑ کر چولہا بجھایا اور میری کمر کے گرد اپنا بازو جھانکی کرستے ہوئے مجھے سہارا دے کرے تک لایا بلادر مجھے بڑے پریم سے مسری پر بٹھانے کے بعد میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا: ”کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں؟“

”کیا مجھے صاف صاف کہ دینا چاہیے؟“ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

”ہاں! میرے تصور میں ابھرنے والے شیراز کے چہرے نے کہا۔“

میں نے بے بسی سے بلال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے غمور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کئی بار یہ بات نوٹ کی ہے کہ کبھی کبھی آپ کچھ الجھی الجھی اور پریشان سی نظر آنے لگتی ہیں، کیوں؟ وہ بولا۔“

”نہیں... نہیں تو...“ میں نے گہرا کر کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی پھر میرے شانوں پر اپنا بازو دماز کرتے ہوئے بولا: ”عین! میں جانتا ہوں آپ نے زندگی کا بڑا بڑا سائنس روپ دیکھ رکھا ہے، زندگی کا یہ روپ جو آپ اس گھر میں دیکھ رہی ہیں آپ کو یقیناً بڑا ہی تکلیف دہ محسوس ہو رہا ہو گا کہیں کوشش کروں گا کہ اسے تھوڑا بہت نکھارتے سکوں۔“

”یہ... یہ... بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“ وہ قدر سے اداس ہوتے... ہوئے بولا۔

اس کے اس سوال کا جواب میرے حلق میں پھنس کے رہ گیا۔

”میں... میں... تمہارے لیے... چائے... بنا دوں...“ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، آپ آرام کریں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مجھے دونوں شانوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔ میں رو بوٹ کی طرح چپٹ پڑ گئی۔

”آپ اٹھیں گی نہیں چاہتے ہیں خود بنا کر لانا ہوں آپ کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی؟“

وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک ریلا دیوانہ وار کپٹیوں کے سہارے میری

میں نے اس کا بقیہ حتمہ انتہائی کوفت میں گزرا۔

شام کے وقت جب بلال اسٹوڈیو میں معروف کار تھا اور میں اس کے لیے باورچی خانے میں کھڑی چائے بنا رہی تھی، دودھ کی بچی چولھے پر دھری تھی، دوپہر کو غیر از کی زبلیں سے ادا ہونے والے چند تکلیف دہ الفاظ نے مجھے آگے اخیالات کی بدیلیں اتنی دور نکل گئی کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ کب دودھ آبل آئی کہ رچی سے گرنے لگا اور کب بلال میرے عقب میں آکھڑا ہوا۔ میں تو اس وقت چونکی جب بلال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے اس کا بقیہ حتمہ انتہائی کوفت میں گزرا۔



ایک صاحب جیسے میوزیم میں  
داخل ہوئے، ملاحظہ نہیں  
روک لیا۔

• ماچس یا لائٹرو غیرہ گارڈروم میں چھوڑ جائیے جناب  
لیکن میرے پاس ماچس یا لائٹرو نہیں ہے۔ میں مگر ٹ  
نہیں پتا۔ "ان صاحب نے جواب دیا۔  
تب پھر آپ اندر نہیں جا سکتے۔ ملاحظہ بولا: ہمیں  
سختی سے جلالت کی گئی ہے کہ مگر ٹ یا لائٹرو گارڈروم  
میں چھوڑے بغیر کوئی شخص اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ مائی گاڈ! شیراز شکیاں بھیجتے ہوئے بڑبڑائے۔  
"اس قدر پیلیوں میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی صاف  
صاف کہہ دیجئے کہ تم اس سے طلاق چاہتی ہو اور بس!"  
"یہ اس قدر آسان نہیں ہے رازی! میں نے بے بسی  
سے کہا۔

"مشکل بھی کیا ہے؟"  
"مشکل یہ ہے کہ اگر وہ سبب پوچھ بیٹھا تو میں کیا  
کہوں گی!"

شیراز نے ڈیش بورڈ پر دھرا ایک خاکي لفافہ اٹھا کر  
اس میں سے ایک تصویر نکالی۔ یہ میری اور ان کی ایک  
یادگار تصویر تھی۔ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ کی تصویر ان کی  
آن انھوں نے اس تصویر کے نمودار ڈسکریٹ کر دیے  
اور اس طرح کہ ایک مگر ٹ پر میری تصویر تھی اور دوسرے  
پر خود ان کی۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔  
"تواری مشکل آسان کرنے کی کوشش۔" وہ گھبرایے  
میں بولے پورا انھوں نے وہ دونوں مگر ٹے میری جانب  
بڑھاتے ہوئے کہا: ان دونوں مگر ٹوں کو تم اس کے سامنے  
لکھ کر کھنڈ پتھر! انھیں طلا دیجیے۔ وہ حیرانی سے تمہاری طرف  
دیکھے گا تم کتنا قسمت نے ہمیں جدا کر دیا تھا آپ ہمیں ملا سکتے  
ہیں بس یوں بات شروع ہو جائے گی.... کیا سمجھیں؟"  
میں نے تصویر کے دونوں مگر ٹے ان سے لیے اور  
اپنے پرس میں رکھے لیے۔

اگلے روز ہفتہ واری تعطیل تھی۔ بلبل سارا دن گھر ہی  
پر رہا اور میں اس سے نظر میں چراتی گھر کے مختلف کاموں میں  
معمروف نظر آنے کی کوشش کرتی رہی حالانکہ میرے دل

ابھی زلفوں کی جانب بہہ نکلا۔  
بات کو بلبل میرے نزدیک بیٹھا میری ابھی زلفوں کے  
بجائے اٹھکیاں گھماتے ہوئے مستقبل کی باتیں کرتا رہا۔

اگلی صبح میں حسب معمول بلبل کے بیدار ہونے سے  
بہت پہلے جاگ گئی۔ بلبل دن چڑھے جاگنے کا عادی تھا۔  
تھرک صفائی ستمرائی کے بعد میں آیتنے کے روبرو کھڑی بال  
سنبھاری تھی کہ بلبل مسکراتا ہوا میرے عقب میں اکھڑا ہوا  
اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے شانوں کو دبوچتے ہوئے  
میرے بالوں میں اپنا منہ چھا کر ایک لمبا سانس کھینچا۔ میرے  
کسائی اور میں نے دور ہٹنے کی کوشش کی مگر میرے شانوں  
پر اس کی گرفت بدستور رہی۔ میں نے گردن موڑ کر بے بسی  
سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"  
وہ میرے اس سوال کے پیچھے چلتے تقاضے سے بکھر  
بے پردہ مست رہے خود منظر آتا تھا۔  
"پہننا چھوڑ دو مجھے" میں گڑگڑائی۔  
اس کی آنکھوں میں شکاک سے دارتے تمہارے جگہ تذبذب  
کی ایک اونچی لہر ابھری۔

"اگر نہ چھوڑوں تو؟"  
"تو میرا دم گھٹ جائے گا!"  
اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر کہے  
کتنے بنا میرے شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیا اور ہاتھ  
روم کی جانب مڑ گیا۔ میں اور الجھ گئی!  
بلبل نے کوئی مزاحمت کوئی سوال کیوں نہیں کیا ہمیں  
نے اظہار اب کے عالم میں سوچا۔  
بات تو وہیں کی وہیں رہی تھی۔

اس روز جب حسب دستور میں شیراز سے ملی تو شیراز  
نے پوچھا: تم نے بات کی اس سے؟"  
"کی تو نہیں گمروہ سمجھا ہی نہیں!"  
"کیا کا تھا تم نے؟"  
"میں نے کاتم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے...!"  
"پھر؟"

"اس نے کاتم چھوڑوں تو؟"  
"اور تم چپ ہو گئیں؟"  
"نہیں.... میں نے کاتم میرا دم گھٹ جائے گا!"

دماغ میں جو اربھانے کی سی کیفیت تھی۔ بلال اسٹوڈیو میں سے  
مصرف کارہا لیکن حسب عادت ہر ٹھوڑی دیر بعد مجھے بکھانا  
یا خود میرے پاس اٹھ کر آتا جاتا رہا۔ شام کو اپنا اسباب معوی  
سیٹنے کے بعد جب وہ اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو میں کپڑوں پر  
اسٹری کر رہی تھی۔

”میں باہر چلنے کا موڈ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں“

”کیوں؟“

”بس یونہی“

اس نے سوچ آف کر دیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر  
میرا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا: ”آپ مجھ سے شادی  
کر کے خوش نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ہے نا؟“

میرے لبوں کے گوشے کپکانے لگے۔

”یہ انتہائی ہی ترنا تھی تو قابلِ اعتنا کیوں سمجھا بھلا“

وہ پھر سے ہونے لہجے میں بولا۔

”چھوڑ دو۔۔۔۔۔ چھوڑ دو مجھے“ میں نے اس کے ہاتھ

بھٹکتے ہوئے کہا۔

”میں نے سوچا تھا جنسی خوبصورت آپ میں اتنا ہی

خوبصورت آپ کا دل بھی ہو گا مگر آپ۔۔۔۔۔! آپ بھی غلام

عورتوں کی طرح آسائشوں کی متمنی نکلیں۔ اس چھوٹے سے

گھر میں آپ کا جی نہیں لگتا۔۔۔۔۔ اگنائی اگنائی سی رہتی ہیں آپ۔

میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کے پاس آتا ہوں اور آپ

مجھے دور بٹاتی ہیں۔ میرے ہاتھ جھٹک دیتی ہیں۔۔۔۔۔ اس نے

پل بھر کو توقف کیا پھر مذہم سڑوں میں بولا: ”مجھے کچھ مہلت

تو دیکھیے جو کچھ میرے اختیار میں ہو گا آپ کے لیے کر گزرنے

کی کوشش کروں گا“

وہ مڑا اور تیزی سے اسٹوڈیو میں جا گھسا۔ میں اپنا سر

ہاتھوں میں مقام کر بیٹھ گئی۔

نادیر ظیفٹ میں سوت کا سا سناٹا چھایا رہا پھر میں اپنے

تمام قوی مجتمع کر کے اٹھی، پر میں سے تصویر کے دونوں ٹکڑے

نکلے اور بلال کے پاس جا پہنچی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا

سر ہٹا سے بیٹھا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے

گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ذہنی سبجان کا ممتاز

نظر آتا تھا۔ میں کسی مجرم کی طرح سر جھکانے آگے بڑھی

اور اس کے نزدیک پہنچ کر لرزتے ہاتھوں سے پھٹی ہوئے

تصویر کے دونوں ٹکڑے اس کے سامنے کرتے ہوئے کھڑی تھی

آواز میں کہا۔

”پنیر انھیں ملا دو“

اس نے تصویر کے دونوں ٹکڑوں کو دیکھا اور اس سے  
چوٹکا پیسے لوسے کی پتی ہونے لگا۔ میں اس کی دونوں آنکھوں  
میں جھونک دیکھی تھی ہوں۔

”مقتدر ہو بلال۔۔۔۔۔ پارہ پارہ تصویر کو بھی جلا دے

سکتے ہو۔ مانند پڑ جانے والے نظروں کو نئی زندگی دے سکتے

ہو۔۔۔۔۔ مٹ جانے والے نقوش کو آجا کر کہہ سکتے ہو۔۔۔۔۔ پنیرا

اس تصویر کو بھی جوڑ دو۔۔۔۔۔ ملا دو انھیں جنہیں مقتدر کے لیے رقم

ہاتھوں نے جدا کر دیا تھا۔“ میں جذبات کی رو میں بولتی چلی گئی

اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے پر دھری بھاری نیل

ہٹ گئی ہو۔

وہ ہٹا ہٹا کبھی مجھے کبھی تصویر کے دو ٹکڑوں کو دیکھتا

رہا پھر اس نے کشمکش کے عالم میں کہا: ”یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کیا

مذاق ہے!“

”یہ مذاق نہیں ہے بلال۔۔۔۔۔ یہ تو ایک المیہ ہے۔۔۔۔۔“

میں نے کٹھنے میں کٹھنے مجرم کی طرح سر جھکا کر اعتراف

کیا یہ مجھے افسوس ہے بلال کہ میں نے مصلحتاً تم سے حقیقت

چھپائی۔ میں شیراز کے پاس واپس جانا چاہتی تھی اور والیسی کے

لیے میرے پاس فائدہ راستہ ہی تھا۔ میں اس پل صراط سے گزر

گئی ہوں۔ میں شیراز سے پیار کرتی ہوں اور ان کے پاس واپس

جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ پنیرا مجھے آزاد کر دو“

دل کا بوجھ اتار دینے کے بعد میں بلال کی جانب

دیکھنے کی ہمت کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ دھواں

دھواں تھا اور آنکھوں میں وحشت سی آہٹ آئی تھی۔

”کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اور

کس سے کہہ رہی ہیں!“ اس کے نیوز نہیں تھے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ اس امر کا

بخوبی احساس ہے کہ اس وقت میں کلیننگ سے اختیار

میں ہوں۔ تم اگر چاہو تو مجھے آزاد کر سکتے ہو اور چاہو تو سولی

پر لٹکا سکتے ہو مجھے آزاد کر دو۔۔۔۔۔ پنیرا میں نے نجات

سے کہا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر زخمی نگاہوں سے

میری جانب دیکھتے ہوئے بولا: ”قرۃ العین بیگم! اگر آپ کسی

کو دوبارہ پانے کے لیے پل صراط سے گزر سکتی ہیں تو یقین

رکھیے کہ کوئی سر پھرا ایسا بھی ہے جو آپ کو پا کر نہ کھونے

کے لیے پل صراط ہی سے نہیں بگڑے کسی بھی آزمائش سے گزر

جانے کا حوصلہ رکھتا ہے“



اس کا انکھوں میں کسی حد تک سچے کی طرح بھر جانے  
 دل سُٹنے سے بچھڑاؤ کر دیا۔  
 پلیر! پلیر! پلیر! میں تو لالہ ہے سوچے بنا کہ میں اس  
 سے کیسے سیو ہو سکتا ہوں؟

اس نے فیصلہ کن انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔  
 مقررہ اس میں یکم ایسی چند لمحوں میں شہر آپ میری محبت تھی، مگر  
 اب آنا اور غیرت کا سوال بن گیا ہے۔ سب کچھ ظہور ہے کہ آپ  
 نے جو کچھ میرے ساتھ کیے ہیں ان کو کوشش کی ہے اس میں آپ  
 کے سابق شوہر کو یقین دہانی ضرور ملے گی کہ آپ  
 کو ایک مرتبہ پھر قبول کرنے پر آمادہ ہے لیکن آپ پر فیصلہ  
 نہیں کیجیے۔۔۔۔۔ وہ بن بھر کوڑ کا پھر اس نے فیصلہ کرنے  
 لیے میں کہتا ہوں کہ میں خود بخود جیت آپ کے ہاتھ میں  
 لکھی ہے تو میں اس کی سے شکست نہیں کھاؤں گا۔ میں  
 اس وقت میں سے نہیں جو صورت کوئی مراعات سے گزرتے  
 دیکھتے ہیں اور خود عاشق بنا سکتا ہے کھڑے رہتے ہیں میں  
 اس وقت میں سے ہیں جو خود قیامتوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ  
 رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے اسی کے  
 عالم میں میرے دونوں ہاتھ اس شدت سے دبوچ لیے کہ  
 میں تڑپ کے رہ گئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں  
 چلیں اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا: میں کسی  
 قیمت پر آپ کو آزاد نہیں کروں گا!

پھر اس نے ایک شدید جھکے کے ساتھ میرے  
 بازو چھوڑ دیے۔ میں لڑکھرائی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی وہ  
 پاؤں پھینا اسٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔ پھر چند لمحوں بعد فلیٹ  
 کا بیرونی دروازہ کھٹنے اور پوری شدت سے بند کر دینے  
 کی آواز میری سماعت سے فکرائی۔ میں گھبرا کر اسٹوڈیو سے  
 باہر نکل آئی اور دیوار مار فلیٹ کا گوشہ گوشہ دیکھنے لگی وہ  
 باہر جا چکا تھا۔

ان گنت خدشات نہ ہرے سانپوں کی طرح میرے  
 ذہن میں رہ جاتے تھے۔ خوف کی ایک لہر میرے دل سے  
 اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ اس کے جا رہا ہے تو میری  
 کٹھنوں میں مزید اٹھانے کا پیش نہیں تھے۔ ایک پرہیزگار  
 خیل کو ڈر جانے کے ساتھ ہی اس کی طرف سے ذہن میں لہرایا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے مار ڈالے۔  
 میں باہر نکلنے کی طرف دوڑی اور میں نے نیچے دیکھا۔  
 وہ لیے لیے ڈگ بھرتا رہا لیکن شہر کی طرف جا رہا تھا۔  
 اس کا دل آگت قتل مجھے ڈرانے اور سہانے لگے۔ مرد کا کیا

اعتبار! اگر ایک دو بجے میری فدا سی خطا اور حکم مدد ملی پر  
 علیحدگی ہو سکتا ہے تو وہ سر غیرت اور انا کو اپنے خون  
 کا جواز بنا کر میری گردن بھی اڑا سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس  
 ہوا تھا جیسے کچھ دیر اور میں اس محسوس فلیٹ میں پھری  
 رہتی تو پھر کبھی وہاں سے زندہ سلامت نہ نکل پاؤں گی میں  
 نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں کے چند جوڑے ہاتھ لگا کر ایک  
 تھیلے میں ڈھونڈے کپڑے اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل آئی۔  
 دروازے کی کڑی چڑھانے کے بعد میں بھرت تمام نیچے  
 سے نیچے اتری اور پیلو بہ پیلو ایسا وہ محلوں کے پیرے  
 گزرتی بلکہ آخر چار نمبر کی طرف نکل آئی۔ بڑک محسوس کر کے میں نے  
 نے ایک پبلک کال آفس تلاش کیا اور شیراز کو فون کیا۔ خوش  
 قسمتی سے وہ گھر ہی پر تھے۔ میری آواز سننے ہی انھوں نے  
 نہ چونک کر پوچھا۔

غیرت!

مازی اتم فوراً میرے پاس پہنچا۔ میں دس نمبر پر پوسٹ  
 آفس کے نزدیک مقصدی منتظر ہوں!

اتنی پریشانی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟

ہو پلیر! تم آجا لور!۔۔۔۔۔ پھر بتاؤں گی!

آلہ اسٹ۔۔۔۔۔ آتا ہوں!

کافی دیر میں کال آفس ہی میں بیٹھی رہی پھر جب مجھے  
 یقین ہو گیا کہ شیراز کو گھر سے نکلے دیر ہو چکی ہوگی تو میں باہر  
 نکل اور پوسٹ آفس کی طرف چل دی۔ آسمان سے اتنا اندھیا  
 مصوئی ریشمیوں سے فیرو آزمایا تھا۔

شیراز کو پہنچنے میں دیر ضرور ہوئی لیکن بالآخر وہ میری  
 سب سے بڑی ڈھارس بن کر آ پہنچے۔

کہ کیا ہوا؟ انھوں نے میرے گاڑی میں بیٹھے ہی  
 پوچھا۔

پہلے گاڑی کسی محفوظ مقام پر لے چلیں!

محموظ مقام پر!

ہاں!

کیا یہ غیر محفوظ ہے؟

پتا نہیں۔۔۔۔۔ بس مجھے ڈر لگ رہا ہے!

کچھ بتاؤ تو سہی!

آپ گاڑی یہاں سے کہیں اور لے چلیں پھر بتائی  
 ہوں۔ ایسا کریں، اگر ہم آباد سے مار تھے کی طرف چلیں!

ماہر کے!

پانچ منٹ میں ہم رشید ترائی روڈ پر نکل آئے تھے۔

ضیاء الدین اسپتال کے نزدیک میں نے خیراز سے کہا میں  
یہاں تک نہیں؟  
انھوں نے گاڑی بختہ سڑک سے کچے راستے پر  
اتار کر روک لی۔

”اب تو ہٹاؤ گی یا یہاں بھی نہیں؟“

”جانی ہیں؟“

”وہ بہتر فن گوش ہو بیٹھے۔“

”میں نے بلال سے طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے۔“

”وہی لگتا؟“

”مگر.....“

”مگر کیا؟“

”وہ تو پھر گیا اور بولا، میں کسی قیمت پر تمہیں کاٹا نہیں  
کر سکتا گا؟“

”تم نے کہا کیا تھا؟“

”وہی طریقہ استعمال کیا تھا جو آپ نے بتایا تھا“

”تصور یہ والا؟“

”پھر تم نے اسے بتا دیا کہ تم نے اس سے شادی

کیوں کی تھی؟“

”ہاں مگر وہ تو مجھ گیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مجھے

اس کے تورا پچھے نظر نہیں آئی ہے مجھے۔ میں وحشت کے

مالم میں وہاں سے بھاگ نکلی۔“

”وہی ڈن؟“ وہ میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

”لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے گاڑی؟“

”کس بات سے؟“

”وہ بہت سختی میں تھا؟“

”ڈونٹ ڈی؟“

”اب کیا ہو گا رازی؟“

”ہو نا کیا ہے؟ وہ تمہیں طلاق دینے پر مجبور ہو گا۔“

میں کل ہی کسی وکیل سے رابطہ قائم کرنا ہوں؟“

”مگر اس نے تو طلاق دینے سے صاف انکار کر

دیا ہے؟“

”سو ماٹ! اگر وہ طلاق نہیں دینا چاہتا تو دے۔“

طلاق حاصل کرنا تو تمہارا حق ہے، تمہاری جانب سے طلاق کی

درخواست مقامی عدالت میں داخل کر لے دیتے ہیں، مگر اس کا

کیا گے اور جیسے جیکب کر تمہارا بچیں گے اس کنگال

آرٹسٹ؟“

”تو مجھے عدالت بھی جانا پڑے گا؟“

”ہاں وہ بہ ضرورت ہوگی، جانا تو پڑے گا لیکن تمہیں  
فکر کرنے کی ضرورت نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اور سب کچھ ٹھیک ہونے تک میرا ٹھکانا؟“

”خیراز سوچ میں پڑ گئے پھر بولے: موجودہ حالات

کے پیش نظر میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ گھر چلو کیوں کہ اگر

اس کنگال آرٹسٹ نے اپنی اوقات بھول کر ہمارے منہ کو آنے

کی کوشش کی تو تمہارا میرے ساتھ رہنا ہمارے خلاف اس

کے حق میں ایک اہم پوائنٹ بن جائے گا بلکہ تم ایک بات

نوٹ کر لو کہ اب جب تک اس سے گلو فلاس نہیں ہو جاتی

تم بھولے سے بھی کسی کے سامنے یہ بات زبان پر نہیں

لاؤ گی کہ تم اس سے طلاق حاصل کر کے میرے پاس آنا

چاہتی ہو؟“

”مگر بلال سے تو میں نے کہہ دیا۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا، ویسے وہ اس نکتے کو تمہارے

خلاف بنیاد بنانے کی کوشش کر سکتا ہے مگر تم کہہ سکتی ہو

کہ یہ محض اس کا قیاس ہے ایسی کوئی بات نہیں؟“

”طلاق کی درخواست میں طلاق حاصل کرنے کے لیے

کس بہت کچھ جواز بنا یا جاتا ہے گا؟“

”یہ وکیل کا ہیڈ ٹیک ہے ہمارا نہیں، وکیل ایک نہیں،

سب جواز نکال لیتے ہیں؟“

”وہ سوال تو وہی رہ گیا کہ میرا ٹھکانا کہاں ہو گا؟“

”ایک دفعہ کی صحت دیکھ کر کہانے پر کوئی ٹیٹ

لے دیتا ہوں تمہیں؟“

”جہاں بچھا کیلے رہنا ہو گا؟“ میں نے استفسار یہ

لیجے میں پوچھا۔

”ہاں دن میں تو تنہا ہی رہنا پڑے گا، خیراز نے سنی پتھر

سکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں کسی قیمت پر تنہا نہ رہ سکوں گی، مجھے ڈر لگتا“

”تو پھر؟“

”میں نے پاول بنا خواستہ کیا، مجبوراً مجھے مسز بھارتی کے

ہاں جانا پڑے گا؟“

”چلو میں چھوڑ دوں تمہیں وہاں تک؟“

”مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے ان کو سب کچھ بتانا ہو گا۔“

”ظاہر ہے؟“ وہ بڑے کام سے بولے۔

”چلیں؟“

”میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔“

”ماستے بھر خیراز باہمیں کہنے دہستے میں ان کی باتیں

سنتی رہی بولتی بھی رہی مگر میرا ذہن بڑی طرح الجھ رہا تھا۔  
سنز بہدانی کے گھر سے کچھ فاصلے پر مجھے ڈراپ کرتے ہوئے  
شیراز نے پوچھا۔

”کل ملاقات کہاں ہو گی؟“

”آپ کل کسی وقت فون کر لیجئے گا مجھے۔“

اور اگر تعدادی خونخاک سی آپا نے فون پر میرا سوگٹ

کیا تو؟“

انہیں میں اعتماد میں لینے کی کوشش کر رہی تھی کہ

اس کے پناہ نام نہیں چلے گا۔“

”مگر ذرا احتیاط سے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے کما اور دروازہ کھول کر گاڑی

سے اتر گئی۔“

سنز بہدانی کو اعتماد میں لینے کی خاطر مجھے جلد صحت حال

ان کے گوش گزار کرنا پڑی۔ تاہم میں نے فاسٹان کا یہ حصہ

ان سے پہلے رکھا کہ جلال کی زوجیت میں رہتے ہوئے

بھی میں جلال سے جوڑی چھوے روزانہ شیراز سے ملتی رہی

تھی۔ میں نے مصلحتاً یہ بھی نہیں بتایا کہ اس وقت بھی شیراز

مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ سنز بہدانی ساری کتھا سننے کے

بعد ہنس سے بولیں: ”بی بی! مجھے ڈرتا تھا کہ تم کنویں سے

نکل کر کھائی میں جا کر دو گی اور وہی ہمارا موجودہ شوہر کے

سامنے یہ اعتراف کر لینے کے بعد کہ تم نے اس سے

مضامین اس لیے شادی کی تھی کہ تم اپنے سابقہ خاوند کے

پاس جانا چاہتی تھیں تم نے اس کا اعتماد تو بیکس کھویا ہے

اور اب جیسا کہ تم بتا رہی ہو کہ اس نے طلاق دینے سے

صاف انکار کر دیا ہے وہ نہیں طلاق بھی مشکل ہی سے

دے گا۔ سچی بات یہ ہے بی بی کہ اسے شدید صدمہ پہنچا ہو

گا۔ کوئی بھی شریف، غیرت مند اور باضمیر مرد اپنی بیوی کی

زبان سے دوسرے مرد کا نام سننا برداشت نہیں کر سکتا۔

گناہ کہ عورت اس سے یہ کہہ دے کہ اس کی حیثیت تو

ضمنی تھی۔ نہیں بی بی! تم نے اچھا نہیں کیا۔ طلاق لینا ہی

تھی تو شیراز کا ذکر تو نہ کر میں۔ اب تو وہ چر گیا ہو گا۔ آسانی

سے طلاق نہیں دے گا۔“

”آپا! طلع حاصل کرنا تو میرا حق ہے۔“

”یعنی مقدمہ بکھری کر دو گی؟“

”شیراز سے مفورہ کرنا پڑے گا۔“

”بی بی! مجھے تو تمہارے مقدر پر انوس ہونا ہے۔“

انوس تو خود مجھے بھی تھا۔“

سنز بہدانی کی زبان سے ہمدردی کے دو بول سننے تو

پہا اختیار میری آنکھیں بھراؤں۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”آپا! آپ نے پیسے بھی مجھے پناہ دی تھی اب پھر آپ کے

پس پناہ لینے آئی ہوں۔ بس کچھ دن اور رہ گئے میں مصیبت

کے ساری سوئیاں نکل گئیں صرف آنکھوں کی نکلنا باقی ہیں۔“

”آنکھوں کی سوئیاں آسانی سے نہیں نکلا کر میں بی بی؟“

”میں جانتی ہوں آپا!“

”خداوند کریم تمہارے حال پر رحم فرمائے اور تمہیں

اس مفد صدار سے نکالے۔“

”کہا میں آپ کے پاس پناہ حاصل کر سکوں گی آپا؟“

”بی بی! میں پناہ دینے والی کون۔ اس گھر کو تم اپنا ہی

گھر جانتو۔“

”مشکر یہ.... میں آپ کا یہ احسان تاحیات نہ بھولوں

گی.... ہاں آپا ایک بات اور....“

”ہاں کہو۔“

”وہ.... آپا....“ میں سچا کپالی۔

”کہو بی بی۔“

”کیا میں شیراز سے مشورہ کرنے کے لیے انہیں یہاں

بلا سکتی ہوں؟“

سنز بہدانی کچھ دیر سوچتی رہی پھر نیم دلد سے بولیں۔

”ٹھیک ہے۔“

”میں فون کر لوں انہیں؟“

”ہاں.... ہاں....“

سنز بہدانی کو میں نے جو یہ تاثر دینے کی کوشش کی

تھی کہ شیراز اس صورت حال سے لاعلم تھے اس میں کیا

صدف حد کا سیاب رہی تھی اور شیراز کے دماغ آنے کے

لیے لہ ہوار ہو گئی تھی۔

اگلے دن شیراز مجھ سے ملنے کے لیے سنز بہدانی

کے گھر آ پہنچے۔ میں انیکسی میں تھی۔ سنز بہدانی نے انہیں

وہیں بھجوا دیا۔ انہوں نے اس قدر مستعدی کا مظاہرہ کیا

تھا کہ شہر کے ایک نامور وکیل سے طلع کی درخواست کے

مضمون کی ایک نقل بھی لے آئے تھے۔ میرا خیال تھا،

سیدھی سادی سی شریفانہ درخواست ہو گی مگر جب میں نے

پڑھا تو سراسیمہ ہو گئی وکیل صاحب نے میری جانب سے

بلال پر انتہائی رکیک قسم کے الزامات عائد کیے تھے مثلاً

یہ کہ وہ غیر مردوں کو گھر پر لانا ہے اور مجھے بدکاری پر مجبور

کر رہا ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو بے رحمی سے

زندہ کو بکرتا ہے۔ میں یہ الزامات پڑھ کر شرم سے  
میں گر گئی۔

مازی ایسی تو کوئی بات نہیں تھی! میں نے کہا  
وہ یوں نہیں دیکھے جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات  
کہی ہو پھر بولے "یادِ خلقِ حاصل کرنے کے لیے زندہ کو بکرا  
سا جواز ہونا چاہیے تھا وکیل صاحب کورٹ میں لاوا کر دیں  
گے اس تھرڈ کلاس آدمی کو!"

مگر راز کی عدالت میں یہ باتیں زیر بحث آنے سے  
بلال سے زیادہ رسوائی اور تذلیل تو میری ہوگی! میں نے  
اجتہاد کیا۔

"ڈونٹ بی پائلڈش... مدھی کے دھوکے کو پوٹ  
دینے کے لیے اس کے وکیل کو مخالف پارٹی پر جاننا بند...  
تا جرات ہر قسم کے الزامات فائدہ کرنے پڑتے ہیں کیا بتاؤں  
ساتیر نشانے پر جانگے۔ میں نے مقالمے لیے جن وکیل صاحب  
کی خدمات حاصل کی ہیں ان کی طلاق اور طلع کے مقدمات  
میں بڑی شہرت ہے یہ تو رن ڈیفنڈ ہے، جب فاسٹل  
درخواست تیار ہو کر سامنے آئے گی تو بقول وکیل صاحب کے  
وہ دھوکے کا آرٹسٹ ایک ہی ہے میں نیچے گر جائے گا۔  
وکیل صاحب کہہ رہے تھے کورٹ کی جانب سے فائدہ پر اس  
قسم کے الزامات کا نتیجہ خاموشیت رہتا ہے، جب کوئی  
صحت اپنے مرد پر یہ الزام لگاتی ہے کہ وہ اسے بدکاری پر  
مجبور کرتا ہے تو سب ایسے آدمی پر تھوٹھو کر نے کو تیار  
ہوتے ہیں!"

لیکن مازی پھر میں لوگوں سے نظریں کیوں کر پھاٹکی  
گی، اگر بہت سوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہوں گی تو چند یہ  
سوچ کر مجھ سے نفرت بھی تو کر سکتے ہیں کہ میں غلط کام کئی رہی  
ہوں خواہ زبردستی ہی سہی!"

"ہنسی گرائی میں ست جاؤ، دو مردوں کی پرہیزگاری  
تعمیر صرف مجھ سے حرم ہونا چاہیے اور تم، بات ابھی طوع  
جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

خیر اس نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر میں  
نے اجازت نہ دی۔  
"آل رائٹ! وہ مجھے شکایتی اور تیسری دنیا ہوں سے  
دیکھتے ہوئے بولے

اور میں خیراز کی باتیں سن کر سوچ رہی تھی۔  
پہلے اس کا یہ سفر نہ جانے کب ختم ہو گا!"



تین ہمارے روز کے بعد شیراز مجھے وکیل صاحب کے پاس  
لے گئے، عدالت میں پیش کیے جانے کے لیے میری جانب  
سے درخواست طلع تیار تھی، مجھ کو سخت دکھ تھا جو میں نے  
بغیر کسی پس و پیش کے کر دیے۔

وکیل صاحب! آپ کے خیال میں کتنا وقت لگ جائے  
گا؟ "شیراز نے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"شیراز صاحب! امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ تین ماہ وقت  
نہیں لگے گا!" وکیل صاحب نے اطمینان دلایا۔

لیکن پہلی پیشی پر جب بلال اپنے وکیل کے ساتھ عدالت  
میں حاضر ہوا تو ہمارے وکیل صاحب کے چھوٹے چھوٹے گھٹے بلال  
نے ایک ایسے وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں جو عاکی مقدمات  
کے ضمن میں ایک مستند نام اور حیت کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔

پہلی پیشی کے بعد عدالت کی راہداری میں بلال نے  
میرا سامنا ہوا تو وہ لحظہ بھر کو ٹوٹکا پھرا اس کے چہرے پر ایک  
نشانی کیفیت ابھری اور وہ دو طرفہ جھڑپے باہم بیٹھنے لگے  
ٹھہ گیا، شیراز جاسے دیکھ کر ایک سٹون کی آڑ میں بیٹھ کر  
کھڑے ہو گئے تھے، اس کے کمرے ٹھہ جانے کے بعد عدالت  
سے بولے "اسٹیو پٹا: بی بی ہوں گی دو چار تصویریں.....  
دیکھا ہوں کب تک مقابلہ کسے گا!"

مجھے بعد دیکھتے میں پیشیاں گزر گئیں مگر میرے حتم میں  
جانے والی کوئی مثبت صورت حال سامنے آئی خطر نہ آئی بلال  
کا وکیل میرے موقف کی تردید میں ثبوت شہاد میں اور گلابی  
پیش کرنا چلا گیا۔

اللہ

اس دوران میری طبیعت روز بروز مضمحل سے مضمحل تر  
ہوتی چلی گئی، طبیعت کے اس انحلال اور مضمحل کی تبدیلی کو میں  
نے علی الترتیب حالات کا لازمی نتیجہ اور کسی وقتی توجیہ کے  
تیسرے کیا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں ان دنوں ذہنی طور پر اس قدر  
مستغفر تھی کہ اپنے خاں پر توجہ دینے یا اپنا خیال رکھنے کا ہوش  
بھانہ تھا۔

طبیعت کا انحلال اور کمزوری اس حد تک بڑھی کہ  
ایک روز شام کے وقت مسز بھائی کے گھر پہنچا اور سر سبز  
لان پر چل دی کہتے کہ مجھے ایسا پتلا یا گر آنکھوں کے  
آگے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرانے گر پڑی۔ مسز بھائی کے  
پہلیوں جو ٹینس کھیلنے میں مصروف تھیں، ان کو میری طرف پکیں  
اور مجھے سالانہ کاٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے لہلاہلا

مسز ہمدانی کے اصرار کے باوجود میں نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرنا ضروری نہ سمجھا۔

لیکن تیسرے روز پھر میں بڑی طرح چکرا کر گرتے گرتے بچہ زینے سے اترتے ہوئے میں زینے کی ریٹنگ تمام کر زینے ہی پر بیٹھ نہ گئی ہوتی تو اچھٹا رطھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ تب میں مسز ہمدانی کے اصرار پر ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے معائنہ کیا تفصیلی احوال سنائے میں نے اسے یہ بتا دینے میں کوئی تردد نہ سمجھا کہ مشورہ گائناکو رجسٹ ڈاکٹر پر یا میرے لیبارٹری سٹڈ دیکھ کر مجھے بانجھ قرار دے چکے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کچھ دیر کوشش دہتے میں پڑھیں پھر بولیں۔

”خاتون! کبھی کبھی بعض سپید گیاں بغیر کسی علاج کے قدرت کا ہاتھ معجزاتی طور پر دور کر دیتا ہے بہتر ہے آپ لیبارٹری ٹیسٹ کروالیں۔“  
”جیسی آپ کی مرضی“ میں نے سر پیر ڈال دی مگر کسی خوشی میں مبتلا نہ ہوئی۔  
لیکن لیبارٹری ٹیسٹ کے نتیجے نے مجھے خوشی سے پاگل کر دیا۔

”بی بی! آپ ملا بننے والی ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر کا یہ جملہ سن کر لفظ بھر کو تو میرا دل مارے خوشی کے دھڑکنا بھی بھول گیا پھر مجھے بول لگا جیسے میں مدھر خوشبوؤں اور دھنگ رنگ روشنیوں اور خوشیوں کی میٹھا میں سنائی کھڑی ہوں۔ میں خود کو فضاؤں کے دوش پر اونچا بہت اونچا اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ میرے ارد گرد پھول ہی پھول ملک اٹھتے تھے اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے زمین کے بلند ترین مقام پر کھڑی ہو جاؤں اور جلا چلا کر کھوں۔“

”دنیا والو! سنو! میں... میں جو کہ بانجھ قرار دے دی گئی تھی سرخرو ہونے جا رہی ہوں!“

اور  
اس بے کراں مسرت کے سمندر میں غلطاں میں پھول گئی تھی کہ میں جس بچے کے حوالے سے سرخرو ہونے جا رہی تھی اس کا باپ وہ شخص تھا جس سے جھٹکارا پانے کی خاطر میں عدالت کے کٹھے میں جا کھڑی ہوئی تھی!!



شیراز کو میں نے یہ خوشخبری ٹیلیفون پر سنا تا مناسب نہیں سمجھا۔ میں انھیں روبرو بٹھا کر ان کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ یہ خوشخبری سن کر

کو بکا مانہ بند پکارنے لگیں۔ ان کی آمازیں میں سن رہی تھی ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہی تھی مگر نہ زبان کو حرکت دے پارہی تھی نہ آنکھیں کھولنے کی ہمت ہو رہی تھی۔ مجھے بول تک رہا تھا جیسے میں نیچے بہت نیچے گرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ کس کس نے مجھے سہارا دے کر اندر پہنچایا۔ گرائی میں ڈوبتے چلے جانے کا احساس نونوا حادی تھا۔

صبح جب میں بیدار ہوئی تو پتا چلا مسز ہمدانی کے فیملی ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لیے گھر آئے تھے۔ طاقت کا الجھن لگانے کے ساتھ چند دوا میں دے گئے تھے اور کسی لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کروانے کی ہدایت بھی کر گئے تھے۔  
”اس کی کوئی ضرورت نہیں آپ آب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ تم کہہ رہی ہو مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے خنداں پر جھانپاں پڑ رہی ہیں اور کمزور بھی ہو رہی ہو۔“

”آئی ایم پریگنٹلی آل دائنٹ آپا۔“  
”دیکھو بی بی! اگر نور سے میرا بننا پانا ہوتا تو جو حالتیں تم نے کی ہیں ان کے پیش نظر میں ذما بھی پروا نہ کرتی تھی مگر نور میری بہت اچھی دوست اور میں ہے اس کی خاطر میں تمہیں اتنی اہمیت دیتی ہوں۔“  
”یہ میری خوش قسمتی ہے آپ اور نہ میں کہاں پناہ پاتی! میری آنکھیں چپکے سے بھیگ گئیں۔“  
”ڈاکٹر صاحب کچھ شبہ سا ظاہر کر رہے تھے۔“  
”کیسا شبہ؟“ میں چونکی۔

”کہ شاید تم ایچ پی کٹ کر رہی ہو۔ مجھ سے انھوں نے کچھ سوالات کیے مگر میں جواب نہ دے سکی تم ایسی نڈھال پڑی تھیں کہ کچھ پوچھا ہی نہ جاسکتا تھا۔“  
”میں دکھ سے مسکرا دی۔ میرے نصیب میں ایسی خوشی کہاں تھی اگر ہوتی تو میں یہ دن کا ہے کو دیکھتی!“

شہر ہلکے ملک کا معروف ترین گائناکو لوجسٹ مجھے بانجھ قرار دے چکا تھا۔ نہ دوائیں کام آئی تھیں نہ دواؤں نے اثر دکھایا تھا بلکہ مذکورہ گائناکو لوجسٹ کی جانب سے منے والی میڈیکل رپورٹیں بھیا کو خیر از کی منشا و معنا کے خلاف ارسال کر دینا ہی تو مجھ پر اس مناب کے نزول کا سبب بنا تھا جس نے بالآخر مجھے کٹھے میں لاکھڑا کیا تھا اور معمول کی جس بے فائدگی کو جواز بنا کر کسی خوش نصیب کا دامن متا مایا جاسکتا وہ کوئی نئی بات نہ تھی ماضی میں بھی میں اس بے فائدگی کی بار بار شکار رہی تھی۔ چنانچہ مسز ہمدانی کے فیملی ڈاکٹر کے مشورے اور

کتنے خوش ہوتے ہیں۔  
 جب میں نے یہ خوشخبری انہیں سنائی تو وہ یوں چونکے  
 جیسے کسی زہریلے پھوٹے ڈنک مار دیا ہو۔  
 واٹ! انہوں نے یوں منہ بنا یا جیسے کہ پیٹے کے  
 عرق میں نیم کاسٹ ملا کر ان کے منہ میں اندر ڈال دیا گیا ہو۔

ہاں رازی.... یہ سچ ہے!  
 اپنی خوشی میں میں ان کے تاثرات کو نظر انداز کر گئی۔  
 "نان سینس!" وہ خرائے۔  
 "نان سینس....! تم اسے نان سینس کہہ رہے ہو اب  
 میرے چونکنے کی باری تھی۔  
 اور کیا؟ وہ سر جھٹک کر بولے۔  
 "تم خوش نہیں ہوئے!" میں مدخجور ہوتے ہوئے بولی۔  
 کیا واہیات سوال ہے؟  
 "واہیات!"

میں نے ان کی تنی ہوئی ابروؤں، سختی سے بیٹھے ہونے  
 جڑوں، پھٹکتے ہوئے نتھنوں اور شعلہ بار آنکھوں کے مجموعی  
 تاثر کے نتیجے میں جگر جاننے والے چہرے کی طرف پھیٹی  
 آنکھوں سے دیکھا ان کی وجہ بہت بد صورتی میں بدل گئی تھی۔  
 "مازی! کیا تمہیں یاد نہیں، تم کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی  
 بچہ اڈو پٹ کر لیں گے اور میں ہمیشہ کیسی کستی تھی کہ مجھے اپنا  
 بچہ چاہیے۔ میری کوکہ سے جنم لینے والا بچہ، اب ہمیں کسی  
 اور کا بچہ ٹوڈ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی  
 کہ میں کتنی خوش ہوں۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ کسی بعض بچہ گیا  
 بغیر کسی علاج کے قدرت کا ہاتھ معجزاتی طور پر دور کر دیتا ہے۔  
 مازی! خدا نے مجھے سرخورد کر دیا ہے وہ مجھے میرا بچہ لے  
 رہا ہے!"

"ہنسنہ....! بچہ....!" وہ طنز و حقارت سے پھنکائے۔  
 "مازی! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ میں نے گھٹی گھٹی آواز  
 میں کہا۔

ہاگل ہو گیا ہوں میں: وہ جھبک کر بولے۔  
 "فار گاڈ سیک رازی!" میں گڑ گڑائی: ایسا تو نہ کہو!  
 "کو کیا ہنسوں، قہقہے لگاؤں اور چٹا چٹا کر لوگوں کو نالوں  
 کہ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں وہ میرے رقیب میرے  
 حریف کا بچہ اپنی کوکہ میں پال رہی ہے!"

"مازی!" مجھے خود اپنی آواز کسی اندھے کوئی سے آتی  
 محسوس ہوئی۔  
 شہزاد نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا۔

بڑی دیر یونہی بیٹھے رہے پھر اچھے چہرے پر سے ہاتھ ہٹانے  
 کے بعد مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔  
 "آئی ایم سوری عینی.... میں اس بچے کو کسی قیمت پر برداشت  
 نہیں کر سکتوں گا!"

"ہا.... رازی....!" میں نے وحشت زدہ ہو کر ان  
 کی طرف دیکھا۔

دیکھو میں نے ہر راہ مسدود پا کر یہ بات گوارا کی کہ تم کسی  
 دوسرے مرد سے ناتا استوار کرنے کے بعد مجھ تک واپس لوٹو۔  
 ...تمہاری واپسی پر میں اس شخص کو اور اس سے متعلق ہر بات  
 کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں ہو گا کہ  
 جب تم میرے پاس واپس آؤ تو اس شخص سے متعلق کوئی وعدہ  
 یا نقش یا تدم ہم سے پرچھاؤں بھی تمہارے ساتھ ہو.... جس  
 شخص کا نام میں حرف قلم کی طرح تمہاری زندگی سے مٹا دینے  
 کا خواہاں ہوں، جس کا چہرہ میں بھول جانے کی کوشش کروں  
 گا تم اس شخص سے اپنے تعلق کی جیتی جاگتی نشانی کے ساتھ  
 میری جانب لوٹنا چاہتی ہو.... تو.... تو عینی.... وکس از  
 ایسا سبیل.... آئی ول بی وی لاسٹ پرس تو ایک سپیٹ  
 دیکھ جاؤ!"

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا،  
 اور خود کو لیے بس پا کر بیک بیک چھوٹ چھوٹ کے رو دی  
 وہ میرے قریب آ بیٹھے اور میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ  
 ہوئے بولے: "شرابی تو انڈر اسٹیڈ عینی.... کیا یہ بہتر نہ ہو گا  
 کہ ہم کسی اور کا بچہ پالنے کے بجائے اپنا بچہ پالیں۔ یہ مطلب  
 ہے، وہ بچہ جو تمہاری کوکہ سے جنم لے اور میں اس کا باپ قرار  
 پاؤں.... پھر وہ بڑے پریم سے بولے: "دیکھو عینی! قدرت کے  
 ہاتھ نے وہ بچہ پیدا کیا تو دور کر لیں۔ یہی سب سے حسین کام شکار تھیں۔  
 اگر ایک مرتبہ تمہارے ماں بننے کی امید ہوئی ہے تو نشانہ  
 دوبارہ بھی ہوگی۔ اس قصے کو ہمیں ختم کر دو ورنہ الجھن اور  
 بڑھ جائے گی!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے ہر اسال ہوتے  
 ہونے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ...." وہ کہنے کہتے تک گئے اور اپنا  
 ہاتھ دھیرے سے میرے شانے پر سے ہٹاتے ہوئے بولے  
 "کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا تمہیں.... سوچ لو کہ....  
 تم اس بچے کی ماں بننا پسند کرو گی یا میری بیوی؟"  
 میں نے متوجہ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔  
 "تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا: وہ آنکھ کھڑے ہوئے۔

اس لیے وہ کس قدر بیگناہ نظر آسکتے تھے۔“

مجھ پر ایک سربانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرا جی چاہا انھوں اور شیراز کا گریبان دونوں ہاتھوں سے چھو کر انھیں بڑی طرح جھنجھوڑ ڈالوں اور چلا کر ان سے پوچھوں۔ تم نے مجھے صورت سمجھا ہے یا پتھر...؟“

مگر میں جو چاہتی تھی کرنے لگی۔ آنسو میرے اختیار میں تھے سو بہنے لگے۔ میرے آنسو دیکھ کر یا خدا جانے کسی اور باعث شیراز موم پڑ گئے۔ ایک بار پھر میرے نزدیک آکر میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے نرم لہجے میں بولے۔

”آؤ کہیں چلتے ہیں؟“  
میں سر جھکاتے اپنی بے نصیبی پر بدستور آنسو بہاتی رہی۔

”مک آن؟“  
میں نے ڈیڑبائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔  
”کیا پاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کہاں؟“  
”باہر... کہیں گھر میں پھرنے؟“  
”نہیں؟ میں نے انکار کر دیا۔“

”کیوں؟“ انھوں نے اس قدر تعجب سے پوچھا جیسے میری جانب سے انکار کی امید کی ہی نہ جاسکتی تھی۔

”میں... ایک گھر میں پناہ لیے پڑی ہوں۔ نہیں پتا ہے کہ مسز بھدانی کو اجازت من کا کوئی موقع دوں۔ کیا یہ کافی سربانی نہیں ہے۔ ان کی کہ انھوں نے تمہیں یہاں آنے کی اجازت سے رکھی ہے خواہ باطل بناوٹ سے ہی سہی۔“

”ان کی پروا مت کرو۔ دیتے بھی تمہیں باب کتنے دن رہنا ہے یہاں۔ میں نے وہیں صاحب پر واضح کر دیا ہے کہ حد سے حد مزید دو تین بیٹیوں میں فیصلہ ہو جانا چاہیے۔“  
”فیصلہ کتنی ہی جلدی کیوں نہ ہو مجھے تو بہر حال کم از کم چھ ماہ اور گزارنا پڑیں گے یہاں۔“

”چھ ماہ...؟“ وہ چونکے پھر تیور بیاں پڑھا کر بولے۔  
”اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس وقتے کو لوڈ آؤٹ کر دو۔“  
”پتیرا ایسا نہ کہو۔ میں نے عاجزی سے کہا۔“

”میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں تمہیں، اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ چلی رہی ہو میرے ساتھ یا میں جاؤں؟“

میں نے شیراز کی طرف دیکھا اور اپنے دل سے پوچھا۔  
”کیا تو اس آمادہ ستم شخص کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتا؟“  
میرے دل نے کسی شریک پتے کی طرح اٹھلا کر کہا۔ ”میں“

”تو بس محبت کر سکتا ہوں؟“  
”آہ! بڑا ہوا اس محبت کا جو خود تانہ می ہوتی ہے، عقل کو

مجھے بے دست پا کر ڈالتی ہے۔“

میں نہ جانتے ہوئے بھی شیراز کے ساتھ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیراز ڈیڑھ دو گھنٹے مجھے شہر کی پُر رونق سڑکوں پر گھماتے پھرتے، باہر رنگ تھے، روشنیاں تھیں، ہنگامے تھے۔ اندر کار میں کیسٹ پیئر پر بستی مڈھر اور رومان پر دروس یعنی اور شیراز کی قربت اس ذہنی آسماں کو کچھاڑ دینے کی کوشش کر رہی تھی جس سے مجھے شیراز کے تکلیف دہ لہجے نے دوچار کر دیا تھا۔

دو روز بعد شیراز نے مجھے اس وقت فون کیا جب مسز بھدانی کالج اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔

”خدا نخواستہ تمہاری وہ خوفناک قسم کی آپا آج کالج سے چھٹی کیے تو نہیں بیٹھی ہیں؟“

”نہیں وہ کالج گئی ہوئی ہیں... خیریت؟“  
”میں تمہارے پاس آ رہا ہوں تمہیں کہیں باہر لے جانے کے لیے تم تیار رہو؟“

”کہاں؟“  
”اس قدر گھبرا کے کیوں پوچھ رہی ہو؟“  
”اس لیے کہ لوگوں کو گھر پر ہوتے ہیں۔ مسز بھدانی کو پتا چلا تو زبان سے کچھ کہیں یا نہ کہیں دل میں ضرور بدگمان ہوں گی۔“

”ہاں دی سے پروگرام تو بتاؤ؟“  
”میں آسکے بتاؤں گا۔ اور تم اگر مسز بھدانی اور ان کے نوکرین سے اسی قدر مخالف ہو تو ایسا کوئی خیام تک پیدل نکل آؤ۔ میں وہاں سے تمہیں پک کر لوں گا تو کروں گے کوئی بھی بہانہ نہ دینا۔“

”اگر یہ طبیعت مضمحل تھی مگر میں نے پھر بھی ہا می بھر لی۔ میں خیام تک پہنچی تو شیراز کو اپنا منتظر پایا۔“

”بڑی جلدی دکھائی تم نے پہنچنے میں؟ میں نے اگلی میٹ پر ان کے برابر بیٹھنے کے بعد گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے کہا۔“

”بارا میں تو بے چینی سے اس دن کا منتظر ہوں جب یوں چوری چھپے طے سے نجات ملے گی؟“

”اب تمہیں بھی گھبراگئی ہوں۔ خدا جانے کب آئے گا وہ دن؟“

”حوصلہ... حوصلہ ڈارنگ۔“ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے نیرا دایاں شانہ دباتے ہوئے بولے۔

پھر انھوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی کاؤنٹر کی جانب کرتے ہوئے پوچھا: ہم ڈاکٹر کے پاس چلے رہے ہیں؟  
ڈاکٹر کے پاس! میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔  
ہاں!

مگر کون سے ڈاکٹر کے پاس اور کس لیے؟  
ڈاکٹر ٹیس کے پاس، بڑی شہرت سنی ہے میں نے اس کی ایسے کاموں میں۔ نازداری کے اعتماد کے ساتھ کام کی ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہونے دیتی۔ کل خاصی جستجو کے بعد اس کا پتہ لگا سکا تھا۔ اتنا گیارہ بجے کونک پر ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک بات نے مجھے بڑا اپیل کیا۔ قاتلوں کوئی نہیں کیا جس کام کی بات کی۔ مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا کرنا ہے اور خود یہ بتایا کہ کیا لے گی... آئی اپریٹیشن، اسے... کام ایسے ہی ہونا چاہیے!

میں دم سادھے شیراز کی بات سن رہی تھی۔  
شیراز نے اپنے سامنے آدراں آئینے میں دیکھا لیکن تیرے کس پر نظر ڈالی ہوگی اور بولے: گھبرانے یا پریشان ہونے کی تلقین کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری اس ذاتی تکلیف میں ہماری دیکھی خوشیوں کا راز مضرب ہے!  
میرا جی چاہا گاڑی کا دروازہ کھولوں اور گاڑی سے چھانگ لگا دوں۔

مگر بڑی آٹسے آگئی۔  
اس خیال کے کچھ سے آنے والی گاڑیاں مجھے روکنی اور پامال کرتی گزر جائیں گی میرے بدن میں ایک جھری سی دردناوی۔

میں سانس روک کے دم سادھے پریشان بیٹھی تھی۔  
سب ٹھیک ہو جائے گا... ہم اس مرتبہ اپنا اپنی دلچسپی میں گزاریں گے۔ میں تمہارے ایک ایک دکھ کی نکالی کر دوں گا جیسی... اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم سنبھال نہ سکو گی۔ تم اپنی قسمت پر ناز کر دو گی! شیراز مجھے مستقیم کے خواب دکھا رہے تھے۔

نازی! میں تم سے کچھ اور نہیں مانگوں گی جس سے ایک خوشی مجھ سے نہ چھینو! میں گھٹی گھٹی آواز میں گڑ گڑاتی۔  
میرے ذہنی کی بات مت کرو۔ وہ تمہارے لیے میرے لیے میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ میری آنکھوں میں گرنے لگے۔ مجھے اپنے اور غم سے آنسو آنے لگا۔ کیسی بے وقوف صورت تھی میں ایک مرد کے حلق میں اس قدر دیوانی ہو گئی تھی کہ وہ مجھے کٹھ پتلی کی طرح جھکے دے دے کر پھاڑا پھاڑا اور میں چپ چاپ

ہم یہی تھا اس وقت ہی جب کہ وہ مجھ ایک ڈیڑھ سے عرصہ سے گولف کے لیے لے رہا تھا جو میری ہی نہیں اس کی حالت کی انتہائی ترقی ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے گولف کی چھٹی چھٹی پاپا پاپا پاپا پاپا تھی۔  
میرے ذہنی میں غمازیہ اس صورت نے جو وہاں بننے لگی تھی اچھلائی لے کر بیدار ہونے کا کوشش کی مگر صحت کوئی نئے سے تھپکن شروع کر دیا۔  
شیراز کے قبضے سے دو گولف کی صورت میں میرے لیے جانے پتاہ کلاں تھی!  
بہ صحت مجھے اس کے کنگے جھکا تھا۔

بڑی بڑی رنگ ہوم۔ ڈاکٹر ٹیس نے میرا تھیلی ساڑھ کیا چند ضروری سوالات پوچھے پھر شیراز سے بولیں: تو پرانم، سب ٹھیک ہو جائے گا!  
میں نے ہاتھ دھو کر اپنا ہاتھ پھیرا۔  
آف کوری!

میں کچھ پارچت پڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔  
شیراز ڈاکٹر ٹیس کے سامنے سے اٹھ کر میرے ننگے آسنے اور جھک کر بولے: آج ہی اپنی اپنی پھاڑو۔  
نازی... میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔  
جب ہی کمرے کا دروازہ کھلا ایک باوردی لڑکی داخل ہوئی اور اس نے ڈاکٹر ٹیس سے کہا: ڈاکٹر صاحب! چھ نمبر کو ڈیوٹی روم میں لے گئے ہیں!  
آل ہاٹ ڈیوٹی آرہی ہوں... ڈاکٹر ٹیس اسٹاکسٹری ہوئی اور ہلکی جانب مڑتے ہوئے بولیں: میں تمہاری دیر میں آئی ہوں!

بہتر! شیراز نے کہا اور ڈاکٹر ٹیس کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کچھ پر جھکتے ہوئے بڑی چاہت سے میرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے سنوارتے ہوئے استغفار بھر میں بولے: یو ٹو می؟

ہاں!  
مگر جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے میری خاطر؟  
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
بس یہ آخری بات اور مان لو... میری خاطر۔ پتہ پتہ!  
میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک طرف دل کی آہ میرے سینے میں چل کر رہ گئی۔  
آہ! تمہاری خاطر... تمہاری خاطر میں نے کیا نہیں کیا!



میں نے سنا۔

میری نظر گئی۔۔۔ جیٹ قدر مائی بیک۔۔۔ وہ۔۔۔

میں کم این ڈاکٹر فیسنے سدا سے کھڑے دیکھے  
ہوئے گا۔

سدا سے کھلا اور ایک لڑکی بے حد شادان و فرماں  
کرسے میں داخل ہوا اس نے سٹال کا ایک ڈبہ لاکھڑی  
جانب بڑھادیا۔

بیٹا مارا ک ہوا ڈاکٹر فیسنے نے زو جان سے کہا۔  
دنگرے؟

آپ کی بیم تو بیٹے کی خبر سن کر رونے لگیں وہ ڈاکٹر فیسنے  
نے زو جان کو سکراتے ہوئے بتایا۔

ڈاکٹر ایہ ہارا پلا بچہ ہے زو جان جناباتی بیسے  
میں بولا۔

میرا دل گیا کسی نے مٹی میں لے لیا۔

آہ! میں اس ڈبے سے محروم ہونے جا رہا ہوں۔  
زو جان کے جاننے کے بعد ڈاکٹر فیسنے ہماری طرف  
متوجہ ہوئیں۔

وہ صاحب! انھوں نے سنی خیر سکر ایٹ کے ساتھ  
خیراز کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر! انھیں آپ کج ہی ایڈیٹ کر لیں؟  
مراثی؟

میرے بیٹا مٹھرنے کی عزت تو نہیں؟ خیراز  
نے پوچھا۔

دیکھیں آپ کا جانا ضروری ہے کیا؟  
وہی ہل؟

وہ بانی دی وے ٹکاپ انھیں جنرل طور میں دکھانے کریں  
گے یا پرائیویٹ دوم میں؟

پرائیویٹ دوم میں خیراز نے بولب جیہ پھر سکر کر  
بولے۔ اٹ ٹھنڈا لہریں ویری پرائیویٹ سنی از تو پراہم  
قاری؟

”او کے میں ان کی ایڈیشن سلیپ بتائے دیتی ہوں۔  
دوم نمبر آپ کو کاؤنٹر سے ملے گا۔ ڈاکٹر فیسنے نے اپنے  
سائے رکھے تھما ان میں سے ظلم نکالتے ہوئے کہا۔

خیراز ان کے سائے جا بیٹھے۔  
”نام؟“

مذرت! اجازت؟

میں نے چونک کر خیراز کی طرف دیکھا  
ڈاکٹر فیسنے نے بچے بعد دیکھو سے دو پر جوں پر کچھ لکھا  
اور انھیں شیراز کی طرف بلدی باری بڑھانے ہوئے کہا۔ یہ

پھر لہے۔

میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

تو کہہ دیا ڈاکٹر فیسنے سے کہ تمہیں ایڈیٹ کر لیں؟  
مگر ستر ہمالی میرے گھر نہ پہنچنے پر کیا وہ نہیں گی؟

جتنی میں ڈاکٹر ستر ہمالی کو۔۔۔ انھیں ہمارے معاملات  
میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔۔۔ مٹی ہیز تو ڈاکٹر تو کہو۔

ڈاکٹر ایک شادی شدہ عورت ہوا اور اپنے معاملات میں تھما  
خود لکھا۔

مگر مجھے وہاں رہنا ہے؟

مگر مت کرو۔ میں تمہاری مدد میں ہر شے کا کیں اور بندوبست  
کیسے ہوں کہو تو کوئی غیٹ کرانے پر لے لیں؟

میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہارا تہانہ نہ مکنوں گی؟  
وہ میرا آپ کے ساتھ تو رہ سکتی۔ میں انہیں اجازت دے کر  
سدا کی بات سنا دیا گا۔

خیراز کی زبانی سے میرا آپ کا نام سن کر مجھے پرانے دل  
پورا گئے۔

پرنسپل کا نامنا

جب اڑکی بے ریشی کا دکھ تھا، اس دکھ کی کوکھ سے ہم  
لینے والے بہت سے ہم اور اس میں تھیں مگر میں تھی بے بس  
اور بے اختیار نہ تھی۔

بولو ان کے ساتھ تو رہ لو گی؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اچھا دیکھو نہیں تمہیں ایڈیٹ کر دیا نہ کے بعد چلا  
جانا گا۔ آج ایک جی بزنس ڈیل کے سلسلے میں ایک سینٹ  
سے وقت ملے ہے۔ اس سے قانع ہوتے ہی یہاں آؤں  
گا۔۔۔ سمجھیں؟

میں تیزی سے چک پھر ہال کھاتے پنکھے کا انتظار  
اپنے دل کی دھڑکنوں میں سرایت کرنا محسوس کر رہی تھی۔ مکہ  
اس لیے ہی کا احساس کہ وہ بڑھتا جا رہا تھا۔

خیراز نے میرا ہاتھ تقاض کر لیا کہ وہ سے اٹھے میں  
مددی پھر ہم کسٹنگ دوم کا مگزی دیوار کے ساتھ پٹے  
صوفے پر بیٹھے۔

ڈاکٹر فیسنے کو واپس آنے میں کچھ دیر لگا اور ابھی وہ پوسے  
طور ہماری جانب متوجہ بھی نہ ہو پائی تھیں کہ سدا نے پوسٹنگ  
سٹائی دی۔

ایڈیشن سلب ہے۔ آپ کا ڈنٹر پر دیں گے تو روم لبرک  
کو مل جائے گا اور فائل بھی بن جائے گی... یہ بڈ ٹسٹ کا  
سلب ہے۔ یہ بھی کا ڈنٹر پر دے دیجیے گا۔

ڈاکٹر! آئی ایم این ہری... ایک اہم اپائنٹمنٹ ہے  
میری... کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ آپ اسپتال کے کسی ملازم کو اس  
تمام کارروائی پر مامور فرمادیں... آئی ویل پیس فلارٹ...  
یہ کہتے ہوئے شیراز نے اپنی جیب سے سترغ شروع نوٹوں  
کی ایک گڈی نکالی کہ اس کی فراخ دلانہ ناشی کی اور اپنی کلائی  
پر بندھی گڈی میں وقت دیکھتے ہوئے بولے: آئی ایم سو ری۔  
میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں... اصل میں بہت اہم  
میٹنگ ہے۔

”دیش آل ماسٹ... میں کسی سے کروائے یعنی  
ہوں یہ کام۔“

”ڈاکٹر صاحب! ایڈیشن فیس وغیرہ“  
”نوٹوں کی گڈی ہنوز ان کے ہاتھ میں تھی۔“  
”کوئی بات نہیں آپ شام کو بے کر دیجیے گا۔“  
میمنٹ تو میری ستر کر دیں گی۔ بس آپ ان کی ہمدرد  
کے لیے کسی کو ان کے ساتھ کر دیں۔“

شیراز پٹے اور میرے نزدیک آکر سترغ کوار سے  
نوٹوں کی وہ گڈی میری آنکھوں میں رکھے جگ کی زپ کھول کر  
اس میں دیکھنے اور رپ دو بارہ بند کیلے کے بعد بیگ میرے سپرد کرتے ہوئے  
بولے: ”دس ہزار ہیں۔ پیسوں کی بالکل پروا مت کرنا جتنے  
طلب کریں دے دینا باتی میں خود آکر دیکھ لوں گا اور اگر مجھے  
تجھ دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔“

میں۔ نمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام لیا اور دیر سے  
بٹنے بولی: ”ستر جمدانی کو فون کر دینا کہ میں تمہارے  
ساتھ ہوں۔“

”جتنی ڈالو انھیں... انھوں نے بے زاری سے  
پھر بولے: ”کسی کی پروا مت کرو۔“

میرے بولنے کے گوشے دھیرے دھیرے پھٹنے لگے۔  
”لو کے ڈارنگ!“ انھوں نے جب کہ میرے سر کو  
بوس دیا اور دروازے کی سمت پیش قدمی کی۔ ابھی وہ دروازے  
تک پہنچے نہ تھے کہ ڈاکٹر ایکس کے کنسلٹنگ روم کا دروازہ  
کھلا اور پینسل ہیل کورٹ شوز پر کھٹ پٹ کرتی شوخ تاریخی  
... میں بوس، سفید ہاف کورٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ  
ڈالے... میانہ عمر کی ایک ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے  
ہوئے کہا۔

”ہیوئی کٹر!“

”ہیوئی کٹر! ڈارنگ... یہ ہاؤ آر یو؟“ ڈاکٹر ٹیسے  
کھل اٹھیں۔

”آئی ایم ویری فائن! نو وارو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے  
کہا تا انھوں نے ایک اچھٹی ہوئی نظر شیراز پر ڈالی۔ وہ ٹھٹک  
سی گئیں اور ان کی آن میں تلخی دکھائی دی تھی۔ یہ بیان کی لہریں  
اُبھرتے دیکھیں شیراز جو خود بھی ٹھٹک کر خیمے کے تختہ منزی  
سے مددازے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ انھوں نے گردن موڑ کر  
میری طرف دیکھا۔ مجھ کو کچھ خائف سے نظر آئے پھر وہ مدداز  
کھول کر باہر نکل گئے۔

نو وارو ڈاکٹر گردن موڑے مدداز سے کی جانب دیکھ  
رہی تھیں۔

”نیو فر... آؤ میٹو نا! ڈاکٹر ٹیسے نے کسی کی جانب  
اشارہ کرتے ہوئے نو وارو ڈاکٹر کو پیچھے کی دعوت دی۔  
وہ ڈاکٹر ٹیسے کے دو برو آ بیٹھیں اور اپنے ہاتھ  
ہاتھ کے انگوٹھے کو شانہ پر موڑ کر مدداز سے کی جانب  
اشارہ کرتے ہوئے بولیں: ”یہ صاحب آپ سے بھی کچھ گڑ بڑ  
کرانے آئے تھے کیا؟“

اگرچہ انھوں نے یہ بات مدداز میں پوچھی تھی مگر  
ان کی آواز مجھ تک پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹر ٹیسے نے اپنا برو کی معنی خیز جنبش سے انھیں  
کمرے میں میری موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ انھوں  
نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھا اور پھر اپنی کسی کچھ ایلے  
رُخ پر موڑ لی کہ میں ان کی دائیں کعبیٹی اور رخسار کا کچھ حصہ دیکھنے  
کے سماج سے کا بقیہ حصہ دیکھنے سے قاصر تھی۔

ڈاکٹر ٹیسے نے اسٹرکام کے ذریعے سسٹر جمیلہ نامی  
ایک لڑکی کو بلوایا اور مجھے اس کے سپرد کرتے ہوئے بولیں: ”  
سسٹر! انھیں پرائیویٹ روم میں ایڈمٹ کرنا ہے اور فوری  
طی پر بلڈ ٹیسٹ کنفرم کرانا ہے۔“

”جی ہنر!“ سسٹر جمیلہ نے تابعدارانہ انداز میں  
سر ہلایا۔

سسٹر جمیلہ مجھے کا ڈنٹر چمکے گئی۔ میری فائل بنوائی  
کا ڈنٹر چمکے گا بھی کروائی اور مجھے نرسنگ ہوم کی بالائی منزل پر  
واقع کرہ نمبر بارہ تک پہنچانے کے بعد بولی: ”میں آپ کے لیے  
اسپتال کے کپڑے لے آؤں پھر بلڈ ٹیسٹ ہوں۔“

”سسٹر! کس لیے نہیں کی آپ؟“ میں نے پوچھا۔  
”بلڈ گروپ چیک کرانے کے لیے تاکہ خدا خواست کوئی

پھر مضمیٰ ہونو....

پھر سسٹرمیڈیکل گئی اور میں ڈوبنے والی کو سہارا دینی کرے گا جائزہ لینے لگی۔ خاصا کشادہ، صاف ستھرا اور گلابی گہرہ تھا۔ کمرے میں دو بیڈ تھے غالباً ایک بیباک کے لیے اور دوسرا تیار عمار کے لیے۔ ایک سوڈہ سیٹ پر اتھا اور دو کرسیاں دونوں بیڈوں کے بیچ میں ایک آسنی نعمت خانہ تھا جس پر پانی کی بوتل گلاس سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی خاصی سولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں تب ہی تو داخلہ فیس بھی لگزی لی تھی۔

سسٹرمیڈیکل کا فراہم کردہ اسپتال کا ڈیویڈڈ حالہ سا بگڑا اور بیٹی کو رٹ پین کر میں نیم جان سی بستر پر ڈال گئی۔ کچھ دیر بعد سسٹرمیڈیکل ایک میل نرس کے ہمراہ آئی جس نے میرے مائیں بازو کی رگ سے کچھ خون لیا۔ میل نرس کے جانے کے بعد سسٹرمیڈیکل نے کہا: ایک کیس ڈیپورٹی کے لیے تیار ہے اس سے تلف ہو کر ڈاکٹر صاحب آپ کی طرف آئیں گی۔ پھر سسٹرمیڈیکل کمرے کے ایک گوشے میں ایستادہ ایک اینڈ میئر سے ہنگ کے نزدیک کھینچ لائی اور خود کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سسٹرمیڈیکل نے گلو کوڑکی ایک بوٹی لاکر اس مشین پر لٹکا دی۔

سسٹرمیڈیکل کا ڈپ گئے گی مجھے؟  
ہجی ہ سسٹرمیڈیکل نے بہت مختصر سا جواب دیا۔  
ڈاکٹر کب تک آئیں گی؟  
کیس سے فارغ ہو کر۔  
سسٹرمیڈیکل کمرے سے چلی گئی اور میں لمحوں کا اذتاب سنے لگی۔

ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر رئیسہ سسٹرمیڈیکل اور ایک دوسری نرس کے ساتھ جس نے بیڈ پر لیٹر تاپنے والا آلہ اٹھا رکھا تھا کمرے کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ڈاکٹر رئیسہ نے میرا بیڈ پر لیٹر دیکھا پھر سسٹرمیڈیکل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "بہتر گوب کنفرم کروالیا؟"

ہجی ڈاکٹر صاحب سلیم بیڈ ٹولے گیا تھا ایب سے پورٹ ابھی نہیں کائی ہے۔

وہ دوسری نرس آلہ لے کر چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر رئیسہ نے گردن کو ایک ہلکی سی جھیش دیتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے سسٹرمیڈیکل کو دیکھا۔ سسٹرمیڈیکل روٹ کی مانند مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رئیسہ نے پیٹھ اسٹینڈ پر آویزاں گلو کوڑکی بوتل کی طرف دیکھا پھر میری جانب۔

"ڈاکٹر بھگ ڈپ کیوں گئے گی؟" میں نے پوچھا۔

ہجی.... اسی میں ہم اجنشن ٹال کر دیں گے۔"

"پھر؟" میری آواز گھٹٹ کے رہ گئی۔

"پھر وہی ہو گا جو آپ کے شوہر چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر رئیسہ نے مسکاتے ہوئے کہا۔

نہ جاننے کہاں سے آنسو میری آنکھوں میں اُٹھ آئے۔

"آپ کو آنسوں ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر رئیسہ میری پیشانی پر ہاتھ دھرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

میں نے ڈب ڈبائی، دن آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ مجھے دھندلا یا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے لبوں کے گوشے پھٹکنے لگے۔

"ڈاکٹر... یہ... میرا... پہلا... بچہ... تھا... میں نے لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

مجھے آپ کے شوہر اس کے اس دنیا میں آنے سے پہلے اس لیے ختم کروا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے باپ نہیں ہیں؟

میں نے چونک کر ڈاکٹر رئیسہ کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر رئیسہ نے ایک گہری سانس لی پھر بولیں: "بی بی! ہمارا اصول یہی ہے کہ ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اپنی خدمات سے بہت سے شریف اور معزز لوگوں کو رسولی اور ذلت سے بچا لیتے ہیں.... لیکن.... تمہارے معاملے میں میں اپنے اس اصول سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ ماں بننا عورت کا فطری حق ہے، میں تمہاری نفسیاتی کیفیت کو بھی کسی اور کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں۔"

انہوں نے ہل بھر کو توقف کیا پھر بولیں: "شاید اس لیے کہ میں خود بھی اس نعمت سے محروم ہوں.... لیکن بی بی! اخلاقی قدریں کو پامال کر کے ماں بننے کی کوشش مانتا کے جذبے کی تدلیل اور رسوائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی غیرت مند مرد یہ برائت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کی اولاد کو جنم دے۔"

میں نے پچھلی پچھلی نگاہوں سے ڈاکٹر رئیسہ کی طرف دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں کہا: "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر؟"

شاید اس سے میری آنکھوں میں جہان بھر کی حیرانیاں سمٹ آئی تھیں۔

ڈاکٹر رئیسہ نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولیں: "گو تمہارے شوہر نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے اور نہ ہی میں نے کچھ پوچھا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا تاہم اپنے کام سے کام رکھنے میں تمہارے زندگی میں کبھی کسی بڑی ڈرامائی سپوزیشنز آ جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بچہ تمہارے

شوہر کا ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز اسے لہانہ جم نہ کرنا چھوڑتے۔ وہ ایک بار پھر تھیں اور چند لمحوں کے توقف سے بولیں۔  
 "مجیب اتفاق سے ہے کہ میری ایک پتی جو جیٹ دست ڈاکٹر نیو فرماتی جو غضب کی یادداشت رکھتی ہیں آج میں اس وقت مجھ سے ملنے کے لیے آئیں ہیں جب تمہارے شوہر نہیں میرے کمرے میں چھوڑ کر جا رہے تھے، ڈاکٹر نیو فرم نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ صاحب تو ڈیڑھ دو برس قبل اپنے اند اپنی اہلیہ کے ان مخصوص لیبڈ پٹری ڈیسٹ کے تلخ میں گڑ بڑ کر جانے کے لیے رشوت کی پیش کش کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے جو فریقین کی تولیدی صلاحیت کا اعجازہ کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نیو فرم کے مطابق یہ صاحب خود تولیدی صلاحیت سے یکسر محروم تھے جب کہ اہلیہ کی ڈیسٹ رپورٹ قطعاً نارمل تھی..."

"پھر؟" مجھ سے ڈاکٹر رئیسہ کا لحظہ بھر کا توقف بھی برداشت نہ ہو سکا۔

"بجول ڈاکٹر نیو فرم کے انہوں نے ان صاحب کی اس پیش کش کو نہ صرف ٹھکرا دیا تھا بلکہ خوب اچھی طرح انہیں پتہ بھی چلا تھا۔... میں نے تو غیر نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر نیو فرم بتا رہی تھیں کہ آج وہ خالص شرمندہ سے ہو گئے تھے انہیں دیکھ کر"

ڈاکٹر نیو فرم نے فطرتاً کہا تھا۔  
 شیراز کو دیکھ کر ڈاکٹر نیو فرم کے ٹھٹھک جانے اور خیراز کے کئی کتر اس کے نکل جانے کا وہ منظر میرے ذہن میں محفوظ تھا اور میں ذہن کے پردے پر دوبارہ اسے سحرک دیکھ سکتی تھی۔

جب ہی میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور سسٹر جمیلہ انجکشن، سرنگ، روٹی، پلاسٹریک اور دیگر ضروری اشیاء سے کاماتہ ٹرائی ڈیکلیٹیو اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے ایک میل زس تھا۔ ان کی آمد نے ہم دونوں کو خاموشی ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

سسٹر جمیلہ اور ان کے ہمراہ آنے والا میل زس مجھے ڈرپ لگنے لگا تھا کیوں کہ وہ میرے ذہن میں جاری جھلکی سی کیفیت تھی اور کہہ بہ کہہ دل پر بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے کانوں میں سنسنائی نہیں تیر رہی تھیں اور ذہن جواب دیتا محسوس ہو رہا تھا۔

سسٹر جمیلہ اور ان کا معاملہ کار میرے بائیں ہاتھ کی پشت کو دھیرے دھیرے سلاک اس دنگ کو تلاش کرنے لگا

اوشن کر رہے تھے میں کے پاس سے وہ زہر میرے جسم میں اتارا جا سکتا تھا جو کچھ میرے لیے میری زندگی کا سب سے بڑی خوشی سے محروم کرنے جا رہا تھا۔  
 میرا دم لگنے لگا اور سانسیں بہ تڑپ ہو گئیں۔  
 کیا تم سے پاس اس بھی کوئی حجازہ گیا ہے اس بلبلہ؟  
 تو وہ مسکاتے دفا بازا اور عالم شخص سے محبت کرنے کو یہ میں نے اپنے دل سے پوچھا۔  
 دل بدویا۔

اور میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر سوئی کی چھوٹے محسوس کی۔  
 ڈاکٹر... میں چلا اٹھی۔  
 ڈاکٹر رئیسہ نے جو سرنگ میں دو ابھر رہی تھیں اڑ کر میری طرف دیکھا۔  
 میں ٹکاپ نہیں لگواؤں گی۔ میں نے اپنا ہاتھ پٹختے پٹختے کہا۔

"پتیرا ہاتھ دہلاؤں سوئی ٹوٹ جائے گی۔" سسٹر جمیلہ نے گہرا کر کہا۔  
 "میں نہیں لگواؤں گی؟" میں ہندی بچے کی طرح پھل گئی۔

"جنت اسے منٹ... ڈاکٹر رئیسہ نے کہا اور میرا ہاتھ تھامتے پٹختے پٹختے کیوں نہیں لگواؤں گی؟"  
 وہ بس نہیں لگوائیں گی... میں اپنے بچے کو قتل نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے تڑپ کر کہا پھر میں نے سسٹر جمیلہ کو کھور کر دیکھا اور نہ پائی انداز میں چلائی، سوئی نکالو اور نہ میں خود نکال دوں گی؟

"آل برائنٹ... آل برائنٹ... بھلا لے دیتے ہیں سوئی... تم اہلینان رکھو؟ ڈاکٹر رئیسہ نے کہا۔  
 پھر سوئی میرے ہاتھ کی پشت سے نکال دی گئی اور ڈاکٹر رئیسہ کا اشارہ ہا کر سسٹر جمیلہ اور اس کا ساتھی کمرے سے باہر چلے گئے۔

کیا بات ہے کیوں نہیں گھومنا جا نہیں تم ڈرپ... میں جانتی ہوں تمہیں ماں فنس کی آرزو ہوئی تم اس بچے کے دنیا میں آنے سے تم پر اور تمہارے ظہر پر ذلت و رسوائی کے درد کھل جائیں گے۔ ڈاکٹر نیو فرم کی طرح کوئی اور بھی اس حقیقت سے باخبر ہو سکتا ہے کہ تمہارا شوہر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔  
 ڈاکٹر... کبھی ہوا کرتا تھا وہ میرا شوہر تھا اب نہیں

ہے.... اب تو اس بچے کا باپ میرا شوہر ہے۔ میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔  
ڈاکٹر رئیسہ نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے انھیں میری صیغہ الہامی پر شبہ ہو۔  
میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بھوٹ بھوٹ کے روئی۔

بچہ اپنے بچے کو اس زہر سے بچانے کے لیے مجھے ڈاکٹر رئیسہ کو سب کچھ بتانا پڑا۔ وہ تصورِ حیرت بنی سنتی رہیں اور سب کچھ سننے کے بعد انھوں نے میرا کٹا تھپتھپاتا ہونے کہا۔

”گھبراؤ مت.... خدا نے جاہل تو اب کوئی تمہارے بچے کا ہاں بھی بیگانہ نہیں کر سکے گا۔ بس ایک چھوٹا سا ڈراما کرنا ہو گا تمہیں میرے اور ڈاکٹر نیو فرسٹر کے ساتھ مل کر.... آؤ میرے کمرے میں چلو میں نیو فر کو ابھی فون کر سکے۔ جلدی ہوں!“

شام کو جب شیراز ڈاکٹر رئیسہ کی معیت میں میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں بستر پر لیٹی تھی اور مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی مگر اس میں کوئی ایسا زہر شامل نہیں تھا جو میرے بچے کے لیے ستم قاتل ثابت ہو سکتا۔

”کیسے ہو کلینٹی؟“ شیراز نے پوچھا۔  
”ٹھیک ہوں... مگر مجھے آپ ٹھیک نہیں لگتے۔“  
”میں.....! وہ نہیں دینے۔“ آئی ایم پریسی کئی کل ماٹ۔  
”نو.... یو آر ناٹ۔“ میں نے اصرار کیا۔

نہری ہیں سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح وجہ نظر آئے تھے اور ان کے سر پر اسے اٹھتی ”ارمانی“ کی منگ کرے میں پھیل گئی تھی۔

”مازی! تمہاری خاطر میں اس منزل سے بھی گزر گئی۔ اب میری خاطر تمہیں بھی ایک کام کرنا ہو گا۔“

”مزود.... تم کو تو سہی....“  
”ڈاکٹر....! میں نے ڈاکٹر رئیسہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا آپ کے فرسٹ ہوم میں ایک ایسا بیٹری بھی تو ہے۔“  
”جی ہاں ہے۔“

”آپ کے ہاں ایسے ٹسٹ بھی ہوتے ہوں گے جن سے پتا چلا یا جائے کہ عورت اور مرد میں سے کون تولیدی

صلابت سے محروم ہے؟“  
”جی ہاں کیے جاتے ہیں ہمارے ہاں ایسے ٹسٹ بھی؟“  
ڈاکٹر رئیسہ بولیں۔

”میں تو اپنے کمرے ہونے کا ثبوت دے چکی ہوں۔ آپ ان ٹسٹ کرنا دیجیے۔“  
”کیا بکواس ہے؟“ شیراز دبا شہ۔

”چلاؤ مت مازی.... میں تم سے زیادہ اونچی آواز میں جلا سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو۔“  
”ہو گئی تھی مگر اب میں اس دیوانگی کے حصار سے نکل آئی ہوں۔“

”اپنا ٹک کرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر نیو فر مانی کمرے میں داخل ہوئیں۔“

”ہیلو ایوری بڈی۔“ انھوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔  
ان پر نظر پڑنے ہی شیراز کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”فان! انھیں تو تم ضرور پہچانتے ہو گے؟ میں نے کہا۔  
”یہ پہچانیں یا نہ پہچانیں میں انھیں ضرور پہچانتی ہوں۔“  
ڈاکٹر نیو فر ہنس رہیں سنڈلز پر کھٹ پٹ کرتی رازی کے مدبرو جا کھڑی ہوئیں۔  
شیراز نے منہ موڑ لیا۔

”جہاں تک میرا تعلق کام کرتا ہے شیراز صاحب میری جانب سے مایوس ہونے کے بعد آپ نے ہماری لیبار میٹری کے کسی اور شخص کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنا مطلب نکلوا یا ہو گا۔“ ڈاکٹر نیو فر نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔  
”کیا مذاق ہے؟“ شیراز بڑبڑائے۔

”مذاق نہیں یہ حقیقت ہے ایسی حقیقت جس کا آپ سامنا نہیں کر پارہے ہیں ورنہ یوں منہ موڑ کر نہ کھڑے ہوتے؟“ ڈاکٹر نیو فر بولیں۔

شیراز کا جھکا ہوا سر، چہرے پر بکھری شرمندگی اور تشتمی کیفیت گواہ تھی کہ ڈاکٹر نیو فر نے فطرتاً ہی اس کا تعلق میں نے دیکھا شیراز نے اضطراب کے عالم میں دونوں مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ ڈاکٹر رئیسہ نے میرے ہاتھ کی پشت سے سوتی نکال دی تھی۔ میں اسٹی بیٹنگ سے نیچے اُترتی اور شیراز کے مدبرو جا کھڑی ہوتی۔ جس شخص کی محبت میں میں اب بے پناہ ہو چکی تھی اسے نفرت سے دیکھنا بھی کچھ کم بڑی آزمائش نہ تھی۔

”مازی....“ میں نے شیراز کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا: آج دوپہر تک مجھے تم سے محبت تھی اور تمہارے عشق میں میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم ہونے کو آمادہ ہو گئی تھی مگر اب مجھے تم سے نفرت ہو چکی ہے.... شاید یہ نفرت مازی.... اتنی نفرت نہ میں نے کبھی تجھی سے کی تھی نہ کرباؤں کی اپنی سوتیلی ماں سے بھی نہیں... مجھے تم سے نفرت ہو چکی ہے اور ہمیشہ تم سے نفرت کرتی رہوں گی.... آئی ہیٹ یو مازی.... آئی ہیٹ یو!“

شیراز نے زہر خندنگا ہوں سے مجھے دیکھا اور دوڑنے کا رخ کرتے ہوئے دھمکی دی: ”آئی دل سی یو!“

”نو....“ نو مسٹر شیراز یو دل نور ہا ایل ٹوسی ہر اگین!“ ڈاکٹر رئیسہ نے غصے سے منہ کیا۔

”ورنہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے“ ڈاکٹر نیلو فر کی اس بات پر شیراز نے یوں بھلا کر ان کی جانب دیکھا جیسے انھوں نے شیراز کی پیٹھ گرم سلاخ سے وارے دی ہو۔

”جھنلا کر پاؤں پھٹتے، مجھے بڑی طرح گھورتے شیراز دونوں کی طرف بڑھے۔

”یہ لیتے جائیے مسٹر شیراز اور یاد رکھیے کہ جیسے کبھی دھوکا بھی دے جاتا ہے: یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر رئیسہ نے شروع کر اسے نوٹوں کی ٹڈی شیراز کی طرف اچھال دی جو ان کے قدموں میں جا گری۔ ربر بینڈ کے حصار میں جکڑی اس گڈی میں وہ رقم بھی شامل تھی جو بیس میں نے نرسنگ ہوم کے کاؤنٹر پر ادا کی تھی۔

سنز ہمدانی کے گھرتک مجھے ڈاکٹر نیلو فر نے چھوڑا۔ شام ڈھل چکی تھی اور سنز ہمدانی قدرے برا فرختہ تھیں بچے دیکھ کر ان کے چہرے کے ناگوار تاثرات مزید گہرے پڑ گئے۔

”بی بی! آگ پانی کا جو کھیل تم کھیل رہی ہو اس کا تماشا دیکھنا اب میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے!“ انھوں نے غصے سے ترش لہجے میں مجھ سے بات کی۔

”آپا....!“ میں نے سر جھکا کر کہا: یہ کھیل اب ختم ہو چکا ہے.... آگ کے جس سندر سے میں گزر کر آئی ہوں اس نے میری روح کو بھی داغ داغ کر دیا ہے، میرے دل پر شیراز کی اندھی محبت کے فریب نے جو زخم لگائے ہیں انھیں بھرنے میں بہت وقت لگے گا مگر اس ایک امید کے سہارے

مجھے میں بڑی مشکل سے ایک دفا ہاز اور فریبی شخص سے بھاگی ہوں میں اس کڑی منزل سے بھی گزر جاؤں گی!“ سنز ہمدانی نے نظر میں شیر بھی کر کے مجھے دیکھا اور بولیا: ”میں نے نور کو ٹھیک کال کر کے سب کچھ بتا دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ حالات کے مزید ابتر ہونے سے قبل سے یہاں پہنچ جائے!“

”اوہ آپا! یہ آپ نے کیا کیا.... اب یہاں کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی!“

”خواہ دیر سے سہی میں نے اپنا فرض پورا کیا!“

”کاش! کاش! اکب ٹھوڑی دیر اور انتظار کر لیتیں میرا!“

”پھر کوئی نیا سٹنڈ ساتھ لے کر آئی ہو گی۔ سنز ہمدانی نے کھٹ جالنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے نگارائی سے کہا۔

”نہیں آپا کوئی نیا سٹنڈ نہیں بلکہ سارے مسائل اپنے دامن سے جھٹک کر ایک امید کی کرن بچا کر لائی ہوں: میں بل بھر کر رنگی پھر میں نے ان سے کہا: آپا! کچھ ہفتے میں نے اخبار میں ”الفا ایڈورٹائزنگ“ کی جانب سے ایک اشتہار دیکھا تھا، انھیں اپنی لائبریری کے میڈیا ایڈیٹرز کے لیے ایک خاتون اسٹنٹ کی ضرورت ہے، میں خود دھمکی صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتی کیا آپ سفارش کر دیں گی؟“

سنز ہمدانی نے متذہب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میری آنکھوں کے کنارے سے ہنسی گئی۔

”پھر سنز ہمدانی میرے فریب آئیں اور میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے ہمدانہ لہجے میں پوچھا: بات کیا ہے آخر؟“

اس وقت مجھے ہمدانی اور اپنا نیت ہی کی ضرورت تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ ساری گفتگو سننے کے بعد انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کہا: ”عجیب اتفاق ہے بی بی کہ تمہاری خوش قسمت تھیں ایک ایسی سیمہ کے پاس لے گئی جس کے پاس سے میں نے سنا ہے کہ وہ خود بھی ایسے ہی ایک ایسے کی شکایت ہے!“

میں نے سوالیہ نظروں سے سنز ہمدانی کی طرف دیکھا: ”ڈاکٹر رئیسہ میری ایک کولیگ کی ننکا جٹھال ہوتی ہیں۔ فدا نے ہر نعمت سے نوازا ہے انھیں سوائے اولاد کے، سنا ہے کہ ان کی شادی کے کئی برس بعد بھی جب ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو ان کی ساس نندوں نے انھیں بانجھ

سمجھنا شروع کر دیا اور ان کے میاں کو دوسری شادی پر لگانا شروع کر دیا۔ اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑتی دیکھ کر ڈاکٹر رئیس نے مخصوص لیبارٹری سسٹم کے ذریعے میاں اور ساس نندوں پر اپنی سرخروئی ثابت کرنے کا لوشل کی ٹر میاں نے ان کی اجازت لیے بغیر دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو ماں بہنوں نے ڈاکٹر رئیس کے میاں کی تیسری شادی کر والی۔ لیکن خدا کا نام تیسری شادی بھی بے ثمر رہی۔ پھر دوسری اور تیسری بیوی تو میاں سے طلاق لے کر بیکھد ہو گئیں۔ ڈاکٹر رئیس ساتھ میں اب آج بھی ساتھ ہیں۔

واقعی کیسا عجیب اتفاق تھا یہ کہ میری میاں ایسا ان کے دکھ کی شکار تھیں!

آپا! عورت کے مقدمے میں خدانے کتنی آزمائشیں لکھ دی ہیں! میں نے بوجھل آواز میں کہا۔  
ہاں بی بی.... اور میرے مولا کا شکر ہے کہ اس نے عورت کو ان آزمائشوں سے گزر جانے کا حوصلہ ہی دیا ہے۔ مسز بہدانی نے تائید کی۔

میرے تصور میں ڈاکٹر رئیس کا چہرہ چٹھنے ہانڈ کی طرح ابھرا تھا۔

آٹھ دس روز کے اندر اندر بھیا کنیڈا سے پاکستان پہنچ گئیں۔ بیٹے کو وہ ہمراہ نہ لائی تھیں۔ دولہا بھائی بھی اپنی مصروفیات کے سبب نہ آسکے تھے۔

بھیا کے آنے سے مجھے بڑی ڈھارس پہنچی۔ ان کے سینے سے لگ کر میں جس قدر رو سکتی تھی روئی۔ اپنے ماں جاپوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مسز بہدانی نے بھیا کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ داستان کے جن گوشوں سے وہ لاعلم تھیں میں نے خود بھیا کو ان سے آگاہ کیا۔ بھیا نے مسز بہدانی کی موجودگی میں مجھ سے کہا: یعنی بس مجھے بہت دکھ پہنچا ہے مگر میں خوش اور مطمئن ہوں کہ ایک خود غرض، دھوکے باز اور دروغ گو شخص سے تمہارا ناتا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ بلکل کو میں نے دیکھا نہیں، اس سے بات نہیں کی مگر تمہاری زبان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بنا پر میں دلوق سے تو نہیں اندازہ یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ وہ ان مردوں میں سے ہے جو اپنی بیویوں کو اپنی عزت اور وقار سمجھتے ہیں اور نہ وہ یہ ہرگز نہ کہتا کہ وہ تمہیں کسی قیمت پر طلاق نہیں دے گا۔ میں اس سے ملنا پسند کروں گی؟

پچھلے چند سالوں سے اردو زبان میں مشکل کتابوں کا قسط پڑ گیا تھا۔ اگر کوئی کتاب ملتی تھی تو بہت پرانی فلنگ پر ہوتی تھی جو آج کے دور میں کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ ہم اظہر حسین رہا ہی کے بے حد ممنون و مشکور ہیں جنہوں نے ہمارے اصرار پر موجودہ دور کی ضرورت کو پورا کرنے والی ٹیکسی کتابیں چھاپنے کا بیڑہ اٹھایا۔ خدا کے فضل اور کرم سے وہ اب تک ذیل کی کتابیں چھاپ چکے ہیں:

(۱) جدید الیکٹریک گائیڈ (۲) جدید الیکٹریک وارننگ (۳) جدید ریڈیو گائیڈ (۴) جدید موٹر وائٹنگ (۵) جدید الیکٹریک وٹس ویلنگ (۶) کمپیوٹر گائیڈ (۷) جدید صابن سازی (۸) پریکٹیکل ٹرانسفارمر گائیڈ (۹) جدید گٹری سازی (۱۰) پریکٹیکل ایمپلی فائر گائیڈ (۱۱) ڈیزل انجن گائیڈ (۱۲) پٹرول انجن گائیڈ (۱۳) T.V. ریفریجریٹر گائیڈ (۱۴) کلاز T.V. گائیڈ (۱۵) موم بتی دکھانے بانا (۱۶) آئینہ سازی (۱۷) V.C.R. سروس گائیڈ اور (۱۸) ٹیپ ریکارڈر گائیڈ۔

یہ تمام کتابیں قابل اور سہیافتہ حفرات نے لکھی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے ۱۰۰۰ کو درس کرنے والے اور کم پڑھے لکھے بیروزگار نوجوان پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہر لحاظ سے مکمل، انتہائی آسانی سے سمجھائے گئے طریقے، فوٹو آفیسٹ پر چھاپی گئی ہیں۔ ہم ان نوجوانوں سے اپیل کریں گے جو بے روزگار ہیں کہ ادھر ادھر وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ کتابوں کی مدد سے کسی بھی ہنر کو اپنا کر روزی پیدا کریں۔

(محمد تقی، ہارون رشید، واجد علی خاں، محمد اعظم خاں)

مگر آج کل کے خلاف تو میں نے غلطی کا دعویٰ کر لیا ہے۔ وقت میں۔ چودہ تاریخ کو پیشی بھی ہے۔  
 وہ شکر ہے کہ اس میں فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ بیانیہ کا  
 اور مسز بھائی نے تائید میں گرفت پلائی۔  
 فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ آج کل ایک بات طے ہے کہ  
 جس اختلاف سے میں اس کی زندگی سے نقل ہوں اس نے  
 جل کھل میں میرے لیے نفرت کے سما اور کچھ نہیں چھوڑا  
 ہو گا۔  
 مویختہ میں بیانیہ نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

تیرہ تاریخ کی رات کا ذکر ہے۔ بیانشام سے مسز بھائی  
 کے ہمراہ اپنی ایک دیرینہ دوست سے ملنے گئی ہوتی تھیں۔  
 اور میں انکیسی میں تنہا پڑی اپنے مقدر کی سختیوں پر رنجور  
 ہو رہی تھی۔ فقہ انکیسی کا دروازہ کھلنے کی آواز میری سماعت  
 سے نکلا۔ ان آنسوؤں کو بیانیہ سے چھپانے کے لیے جو میری  
 آنکھوں میں اٹھ سے ہوئے تھے میں نے کڑھٹ بدل کر  
 دھان سے کھانسی دیکھنے کی ہمت نہیں کی اور یہ تاثر دینے  
 کی کوشش کی گویا میں سوچتی تھی۔

دھیرے دھیرے چلتا کوئی میرے نزدیک آ بیٹھا۔  
 اور مجھے اپنے دائیں بازو پر ایک ہاتھ کاٹس محسوس ہوا میں  
 نے دونوں لب باہم بھیجے لیے مایا اسکی شکل جانے۔  
 مجھے محسوس ہے کہ وہ تصویر جس کے دو پیشہ نگاروں  
 کو باہم جٹ لے کر مارا تھا آپ نے مجھ سے کی تھی وہ میں نہیں  
 جڑ سکا۔ وہ میرا جوڑی نہیں سکتا تھا۔

میں نے اپنا چہرہ جو میں بازوؤں کے بیچ دھکائے پڑی  
 تھیں کھینک کر بازوؤں کے درمیان سے نکالا۔ جو آواز میں  
 نے سنی تھی وہ جل کی تھی اور جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ  
 بلبل کا تھا۔

میں حواس باختہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔  
 "تم... اتم... یہاں... کیسے... آئے؟ میں  
 نے بوقت تمام پوچھا۔  
 "اپنی اس کوڑھیر یہ وہ مسکرایا۔  
 "کیوں؟" میں نے اس کے جواب پر جربز ہونے  
 کہنے کہا۔

مفتی کے فیصلہ سننے سے  
 میں شرمندہ سی ہو گئی۔  
 "آپ کا بیانیہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ صحت پر وقار،

مجھ دلا اور آپ سے انتہائی محبت کرنے والی۔  
 "تو تم بیانیہ سے مل چکے ہو؟"  
 "جی ہاں، وہ اپنی دوست مسز بھائی کے ساتھ کسی ہی  
 میرے غریب خانے پر آئی تھیں اور میں ان کی "بڑی کے  
 پیچھے پیچھے اپنی اس کوڑھیر دھانا لایا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں  
 تک پہنچا ہوں۔"  
 اور!

مجھ سے تو بھلا کئی تھیں کہ وہ مسز بھائی کے ساتھ  
 اپنی کسی دیرینہ دوست سے ملنے جا رہی ہیں۔  
 میں نے سنا ہے ایک تصویر چوری چوری آپ بھی  
 بنا رہی ہیں جو ہنسی مسکراتی اور جیتی جاگتی ہوئی؟  
 میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں  
 پر شہری مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں وہ مالدارانہ نقل  
 جو عدت کو مرد کی محبت کا یقین دلاتا ہے۔  
 اس نے میرے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ بلبل  
 "آئی لو لو... آئی لو لو کھینی!"

میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مرد جس سے میرے  
 تعلق کا بنیاد میری خود غرضی پر مبنی تھی اس مالدار کی سے مجھے  
 محبت کا اظہار کرے گا۔

"آپ نے خواہ کچھ بھی جانا تو میں نے آپ کا ہاتھ  
 پورے غلوں، محبت اور نیک جیتی سے تھامنا تھا میں  
 آپ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔"  
 میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ میری بد فہمی کو درگزر کر  
 لے گا۔

میری آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے  
 میں اپنی تیرو بختی پر بہت رو چکی تھی۔  
 یہ آخری آنسو تھے۔

بھول بھولتیں اور فریب کے حصار سے نکل کر باہر  
 میں ایک میدان سے، صاف ستھرے اور بے پناہ  
 پر نکل آئی تھی۔

جلل میرے بہت نزدیک آچکا تھا اور میرے تصور  
 میں نہ تھا۔ چوں چہ وہ، ستارہ آنکھوں والا ایک گلی گولڈن  
 سا بچہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ہیو تو!  
 ہٹے پتا!  
 آئی ڈش یو جیسٹ آف سک!!







## شبگیرہ

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی زندگی میں کچھ اس طور درآمد کرتا ہے  
 نظر آتا ہے۔ یہ گانگت اور بیگانگت کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا یہ جذبہ  
 اپنے اندر ایثار کے ساتھ ساتھ خود غرضی اور مصلحت کا عنصر بھی رکھتا ہے۔ ایک  
 بچہ اور حقیقی عاشق کے لیے بڑے دل ہی کی نہیں، بڑے دماغ کی ضرورت بھی  
 ہوتی ہے اور وہ عشق جو محض دل کی حلاقت کے سہارے کے چلتے ہیں کہیں  
 بڑے عشق قرار نہیں دیے جاتے۔ کامیاب عشق کے لیے دل اور دماغ کے مشترکہ  
 صلاحیتوں کا ہونا از بس ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان آخری صفحات میں شامل  
 ہونے والی اس کہانی کی مرکزی کردار ایک ایسی دو شیزہ عشق ہیں جو جوہر  
 کے طویل انتظار سے تھک گئی تھی۔ اس کی تھکن اتنی جان لیوا تھی کہ وہ سناٹے  
 کے لیے کسی دوسرے شج کی چھاؤں میں پناہ لینے کو تیار ہو گئی اور یہی اس  
 کہانی کا کلیدی موڑ ہے مگر پھر اس کے بعد محبت کے بچنے والے چراغوں میں روشنی لگتی

عشق و محبت کے لیے ایک لمحہ بھی پس ہرگز نہیں کر سکتے

جائے گا سے کافی دور تھا غامض لالہالی انداز میں دونوں ہاتھ اپنی  
 پتلون کی جیبوں میں اڑے، محمد رفیع کے ایک مشہور گیت کی دھن  
 سیٹی پر بجا تانے ساری کی ساری دنیا میری جیب میں کی تفسیر بنا  
 لپی دھن میں مگن مجھوتا جھامتا کہیں سر پر سایہ فگن تاروں بھر سے  
 آسمان کو اور کہیں دور سمندر میں نظر آتی جہازوں کی رنگسہ رنگی ٹیکڑی

چند عویں کے چاند اور تاروں  
 سے بھی موکم بہار کی ایک دلخوب  
 اور پھر رات تھی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ کا عمل تھا۔ میں دوسری  
 شفٹ میں اپنی آخری ہفتے وار ڈیوٹی سے فراغت پانے کے بعد  
 ساحل سمندر پر واقع ایسی جگہ سے کار سے بس اسٹاپ کی طرف جوڑی



میں نے میری ہی کی نہیں تھی اس کی۔

وہ میرے دل کی تھی اس کوئی اور میری سوجوں سے بے نیاز  
ہر سترہ سمندر کا رخ کیے کھڑی تھی اور لی سوجوں میں اس قدر مستغرق  
تھی کہ اس کے عقب میں میری موجودگی بھی اس کے استغراق میں  
غلط نظر نہ آتی۔

پہلے سے اضافہ ہمت کر کے اس کے قریب پہنچا اور پھر پوچھو  
سہی کہ وہ کوئی ہے اور بات کے اس سنے تنہا سا کل پر کھڑی کیا کر  
رہی ہے؟ میرے دل نے سرگوشی کی۔

لیکن براہ میری انہی کم تھی کا جس نے ہمیشہ کی طرح مجھے  
اس وقت بھی ڈانٹا اور سہانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنا حلق خشک  
عکس ہونے لگا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے سے ٹھنڈے گئے۔ اپنی بزدلی  
اور کم ہمتی کو کستا میں آگے بڑھ جانے کو تھا کہ دفعتاً وہ بیوی سی  
سکیلی نے میری سماعت کے راستے میرے قدم تک لیے۔

میں ایک بار پھر خشک کر کھڑا ہو گیا اور میں نے کان پوری توجہ  
سے اس کی سمت لگا دیے۔ ذرا سی توجہ سے چند ہی لمحوں میں یہ  
بات عیاں ہو گئی کہ سکھیاں سمندر کے رخ کھڑی اسی تنہا عورت  
ہی کی تھیں۔ ایک ایک میرے دل میں خلا جانے کہاں سے اس  
کے لیے ڈھیروں ہمدردی ٹھٹھکی آئی۔ باوجود یہ میں عورت ذات  
کی جانب پیش قدمی کے سلسلے میں نہایت ڈپرک اور ذول واقع  
ہوا تھا میں نے اس موقع کو کسی عورت سے ہم کلام ہونے اور اس  
کا قریب حاصل کرنے کا سنہری موقع جانا ناظر ہمدردی کر کے لیا  
میں بہت ساری اس سے بے تکلف ہونے کا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

لیکن براہ میری بد قسمتی کا جو اس بار آڑ سے آگئی۔ ابھی میں اس  
اجنبی خاتون سے اس کی گریہ و زاری کا سبب دریافت کرنے اور  
اظہار ہمدردی کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی رہا تھا کہ اس  
نے دائیں جانب اپنی گردن کو ساٹھ درجے کے زاویے پر گھما کر  
میرے جانب دیکھا اور مجھے کوئی ایسا دلیرا آدمی جان کھلا تو وقف  
پہنچتے تفصیل کے ساتھ ساتھ ساحل پر چلنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس  
کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس سے ہم کلام ہونے کے لیے منہمک  
ترین الفاظ کی تلاش میں اپنا ذہن دوڑانے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے  
کرنے کے بعد وہ تھم گئی۔ میں نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا  
اور مجھے اپنے پیچھے آ کر دیکھتے ہوئے ایک ایک اپنا رخ بدل لیا۔

سمندر کے پہلو میں ایسا تارہ پنچتے تفصیل کے متوازی چلنے کے  
بجائے اس نے ساحل کے پہلو میں دراز پنچتے سڑک کا رخ کیا۔  
ریت پر سے چلتی وہ سڑک تک پہنچی ایک بار پھر اپنے عقب میں  
دیکھا۔ مجھے پھر اپنے پیچھے دیکھ کر اس نے لمبے لمبے ڈنگ بھرتے  
ہوئے سڑک چھوڑی اور سڑک کے آس پاس پانچ پانچ پر ہوئی میں

میں نے میری ہی کی نہیں تھی اس کی۔

وہ میرے دل کی تھی اس کوئی اور میری سوجوں سے بے نیاز  
ہر سترہ سمندر کا رخ کیے کھڑی تھی اور لی سوجوں میں اس قدر مستغرق  
تھی کہ اس کے عقب میں میری موجودگی بھی اس کے استغراق میں  
غلط نظر نہ آتی۔

پہلے سے اضافہ ہمت کر کے اس کے قریب پہنچا اور پھر پوچھو  
سہی کہ وہ کوئی ہے اور بات کے اس سنے تنہا سا کل پر کھڑی کیا کر  
رہی ہے؟ میرے دل نے سرگوشی کی۔

لیکن براہ میری انہی کم تھی کا جس نے ہمیشہ کی طرح مجھے  
اس وقت بھی ڈانٹا اور سہانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنا حلق خشک  
عکس ہونے لگا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے سے ٹھنڈے گئے۔ اپنی بزدلی  
اور کم ہمتی کو کستا میں آگے بڑھ جانے کو تھا کہ دفعتاً وہ بیوی سی  
سکیلی نے میری سماعت کے راستے میرے قدم تک لیے۔

کوئی کتا ہی میری ہی میں اس کو ابھی پر حیران ہوتا آگے بڑھتا چلا ہوا  
ہا تھا کہ چاند تاروں سے مرصع یہ خوب صورت آسمان کس فریضے کے  
ساتھ اچھے اور بڑے ہر دو قسم کے لوگوں کو اپنے منہ سے دیکھتا ہوا  
میں اس وقت ساحل کے لیے جتنے سے گزر رہا تھا جہاں بات کے  
ساتھ گیا۔ نہ کہ تو خدا دن میں بھی میری طرف رخ کی فریضے سے آنے  
والا کوئی فرد شازہ ہی نظر آتا تھا البتہ ہم جیسوں کی جھونکی تھی کہ یہی  
اپنی ہانے کا رنگ آنے جانے کے وہاں ساحل کے اس جتنے  
سے لگا لگا کر نا پڑتا تھا۔ سمندر کے رخ سے آنے والی جھونکی جھونکی  
ہول کے حیران پر چھوٹے مجھے بے خود کیے وہ رہے تھے میں اس  
وقت خدا کو اس غل سے باہر نکال رہا تھا جس میں دل کے ٹھکانوں  
اور لوگوں کی موجودگی میں محصور رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہفتے دہری تھیل  
تھی اور بس تان کر سونے کا تصور مجھے ایک عیب طمانیت اور سرت  
بخش رہا تھا۔ دفعتاً میری نظر ایک عورت پر پڑی اور میں خشک  
کر رہ گیا۔

وہ سمندر کے ساتھ ساتھ ساحل پر ایسا تارہ پنچتے تفصیل پر  
اپنی جھیلیاں ٹھکانے سمندر کا رخ کیے کھڑی تھی۔ پوسے چاند کی روشنی  
میں اس کا سر پانچا صاف واضح تھا۔ وہ ستر پانچ سیاہ لباس میں ملبوس  
تھی۔ درپٹ اس کے شانوں پر پڑا تھا ستر ہر ہر ہر تھا اور دروازے بغیر پشت  
پر لہرا رہی تھیں۔ میں فقط اس کی پشت دیکھ سکتا تھا مگر وہ پشت  
سے بھی ستر پانچ رکھائی دے رہی تھی۔ وہ ذیلا مانیا سے قطعاً  
بے نیازی کھڑی تھی۔ رات کے اس پہر دریاں ساحل سمندر پر ایک  
عورت کو تنہا کھڑا دیکھ کر سب راول بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ یہ کوئی  
نئی بات نہ تھی۔ عام زندگی میں میں خاصا شرمیلا، بھینپو، قدر سے  
بزدل اور عورت سے اُد دور ہونے والا تو جوانی واقع ہوا تھا۔ خود کو  
کسی عورت کے سامنے پار میرے دل کی یہی کیفیت ہو جایا کرتی  
تھی بلکہ ہاتھ پاؤں بھی کچھ ٹھنڈے سے بڑھایا کرتے تھے۔ اس کا سبب  
سمجھنے سے میں قاصر تھا۔... تاہم حلقہ کشا یہ تھا کہ عام زندگی میں

عورت ذات سے مخالف ہونے کے باوجود میرے خواب،  
میرے آرزوئیں ایک عورت ہی کے تصور سے ہی تھیں۔... اس  
عورت کے تصور سے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بس۔... میں  
حقیقی زندگی میں کبھی ملا نہیں تھا۔ مگر جو میری آنکھ لگتے ہی ہر روز  
ایک نئے روپ میں میرے خوابوں میں دریا کرتی تھی۔

ساحل سمندر پر کھڑی گریہ ستر پانچ والی اس تنہا عورت کو دیکھ  
کر میرے دل نے چپکے سے کہا: کہیں یہ وہی تیرے خوابوں والی  
عورت تو نہیں؟

شاید وہی ہو۔ میں نے اپنے دل سے کہا اور میرے دل پہلے  
سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ تو جوان دکھائی دیتی ہوتی

83

مگر عبور کر کے اس کے پیچھے جانے کی جرات نہ کر سکا۔ تاہم میرا دل اس کے لیے مضطرب ہو رہا تھا اور میں اپنی کم ہمتی پر خود کو مات کرتے ہوئے ہمدردی سے راتھا کہ کاش میں اس کے پاس سے اس کی گریہ و زاری کا سبب تو پوچھ لیا ہوتا! مگر کے کندھے ایسا وہ بجلی کے کھمبوں کی روشنی میں نہیں اسے لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھ رہا تھا اور آخری حسرت بھری نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد اپنے راستے پر چلنا ہی چاہتا تھا کہ غیر متوقع طور پر میرے حق میں ایک ٹیلی اٹلا آپ بھی!

اچانک فٹ پاتھ پر اس نوجوان عورت کی مخالف سمت سے ایک نوجوان لڑکھڑاتا، بل کھاتا، اس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ یا تو وہ نشے میں دھت تھا یا پھر وہ مجبوظاً محو اس تھا۔ عورت اپنے ساتھی سے ذرا ہٹ کر قدرے سستے ہوئے چلنے لگی۔ جو نہی وہ نوجوان کے قریب سے گزری اس نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی کے منہ سے ایک کھٹی کھٹی سی چیخ نکلی اور وہ لپٹا ہوا تھا اس شہدے کی گرفت سے پھٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے ان کی آن زقند لگائی، مگر پار کی اور دوڑتا ہوا موقع وارنا پر جا پہنچا۔ مذکورہ نوجوان میرے انداز سے کے مطابق زاقی نشے میں تھا اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی اور وہ اس نوجوان خاتون سے دست درازی کی کوشش کرتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہ رہا تھا: "میری جان اکیلی کہاں جا رہی ہو آؤ ہمارے ساتھ چلو" میں جو نا زندگی میں لڑائی جھگڑے اور دکھانا سے ہزار کوس دور رہنے کا عادی تھا، پک جھکتے نہ جانے کس جذبے اور کس قوت کے تحت ہر کولیس بن بیٹھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ میں نے فلمی اداکاروں کے سے انداز میں اس بد قماش پر گھونسوں کی باز پرس کر دی۔ اپنے ہوش میں تو وہ تھا ہی نہیں زور دیر میں چاروں شانے چست ہو گیا پھر میں نے لائقوں سے اس کی تواضع شروع کرتے ہوئے مذکورہ خاتون کی جانب دیکھا تو وہ ایک پڑشباب دو شینہ نظر آئی۔

"عجیب! شرم نہیں آتی گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟ میں نے فانت پیسے ہوئے غصے اور حقارت سے کہا۔

"ابے ماں بہنیں تو ہیں گھر والی نہیں ہے" وہ بد بخت فٹ پاتھ سے اٹھ کر اپنا شانہ سہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک زوردار مٹکا اس کے رخسار پر پڑا پھر لڑکی کی جانب توجہ کی۔ وہ پانچو اور ستارہ آنکھوں والی دو شینہ تھی۔ میرے تصور پر میرے خوابوں کی حسینہ سے حسین تر! آسمان پر دکھنے پانچ تاروں اور مگر کے دور دراز ایستادہ بجلی کے کھمبوں کی روشنی میں اس کا خوب صورت چہرہ بدر بکامل دکھائی دے رہا تھا۔ اس

سبوں اور لاریوں کے کھٹوں پر چلے روڑوں، ناقابل اتعالی نکھا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہر سبب اختیار سے آتی گزرتی ضرور ہے کہ وہ صرف کھٹوں کے سلسلے ہی میں، ناقابل اتعالی، والی گاڑی نہ دیں جگہ اس فرسٹ میں بے چارے مسافروں کو بھی شامل کر لیں جو سفر کے دوران ناقابل اتعالی، موالا کھٹ چیب میں رکنے کے باوجود اتعالی کر جاتے ہیں۔

حوا حق قاسمی کی کتاب "مذہب دیوار سے کھپکا" اہم باب چٹری کی خوشحالی

کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ اور اس کے گلاب کی پگھلے لپوں کے سے لبوں پر لگی لڑکھٹیں ملاری تھی۔ شاید اس کا لہرا سرا اپنی زندہ ہاتھا۔ چہرے کے سے وہ زیادہ سے زیادہ۔ میں بائیس برس کے لگ بھگ نظر آئی تھی۔ "خاتون! آپ گھر آئیں نہیں، میں آپ کی مدد اور دفاع کو یہاں ہوں" میں نے بڑی رسالت سے کہا۔

اتنے میں اس بد بخت نوجوان کی شامت اسے ایک مرتبہ پھر میرے روبرو کھینچ لالی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا: "ابے! نوکرہ صرے آگیا رنگ میں بھگ ڈالنے" پھر اپنا سینہ کھڑکتے ہوئے اس نے کہا: "ابے! یہ ہماری محبوبہ ہے کیا سمجھا" اور ستارہ آنکھوں والی اس دلہرا حسینہ کی جانب پیش قدمی کرنا چاہی۔

وہ گھبرا کر لڑنے قدموں پیچھے آئی، اچھلی اور لپک کر میرے قریب آکھڑی ہوئی پھر اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھما لیا۔ یہ ایک بھٹکا سا لنگا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی عورت اور وہ بھی ایسی دلکش اور دلہرا میرے اتنے نزدیک کھڑی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت نے میرا ہاتھ تھما تھا۔ مجھے اپنی روح میں امرت سا گھٹنا محسوس ہونے لگا۔ اس بد مست نوجوانی کا سارا نشہ گویا میری رگوں میں مسریت کر گیا۔ میں نے اسے غمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جی ہی جی میں کہا: "اسے میرے بد مست حریف! کس زبان سے میں تیرا شکریہ ادا کروں کہ تیرے نفیل... ہاں تیری خوشحالی کے نفیل اس ناز میں نے میرا ہاتھ تھلا ہے۔ کاش! تو ساری زندگی یہیں کھڑا رہے تاکہ یہ ہاتھ میری روح میں یونہی امرت گھولتا ہے اور میں ساری زندگی یونہی مسخا اور غمور کھڑا رہوں... کاشش...! اسے کاشش!"

مگر اس بد بخت نے میرے من کی اس بے صدا التجا پر کلن دھرنے کے بجائے اپنی شامت کو ایک بار پھر آواز دیتے ہوئے

میرے منہ کو آنے کی کوشش کی اور بولا "مردود! دوسرے کی چیز پر ہاتھ ڈالتا ہے"

گو میری تو نہیں ہاتھ لگا تھا کہ اس دلربا حسینہ کی گرفت سے لپٹا ہاتھ چھڑا لی مگر اس پر لہتی جو لہری کی دھانک بھاننے کی خاطر ایسا کرنا ضروری سمجھا اور میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا پھر پوری قوت سے تھمے پار کئے اس خانکاح خراب کے اس طوطا جملے کہ اس کا منہ پھر کر رہ گیا اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے نہ کی ایسا کئی لی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "میرے بھائی! میرے باپ! جا میں نے تجھے معاف کیا... تو ہی لے جا لے۔" میں نے پھر ایک مرتبہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ جیلا اٹھا اور اپنا منہ سہلانا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

اس کے بھاگ نکلنے کے بعد میں نے فحش انداز نگاہوں سے اس نازنین کی جانب توجہ کی تو وہ نگاہیں جھٹکا کر منوں لہجے میں بولی تاکہ دست بہت شکریہ۔

مگر وہ بات نہیں اس وقت آپ کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر آپ نے اس وقت میری مدد نہ کی ہوتی تو خدا جلنے کیا ہوتا؟ وہ بھڑکھڑی لیتے ہوئے بولی۔

"مختر! ہونا تو بہر حال کسی تھا کیوں کہ منظور خدا ہی تھا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ پھر قدیمے شاکی لہجے میں بولا "اگر آپ ایک شریف آدمی سے خواہ مخواہ خائف ہو کر تقرباً دوڑتے ہوئے ساحل سے سڑک کا رخ دیکھیں اور پھر تقرباً دوڑتے ہوئے ہی سڑک پار کرنے کے بعد سڑک ہاتھ پر ہر سال اور رہتا نہ جا رہی ہو تو میں تو شاید خدا کو یہ سب کچھ منظور ہوتا۔"

"میں آپ کو جانتی جو نہ تھی۔ وہ سب کچھ کاگر خجالت سے بولی۔ دراصل میں یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ بھی..."

مجانمی تو خیر اب بھی نہیں ہیں آپ مجھے "میں نے کہا۔

"نہیں" اب تو خیر کسی حد تک جان چکی ہوں۔ اس نے شوق سے کہا۔

"کس حد تک؟" میں نے برجستہ پوچھا۔

"کس حد تک کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں؟"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ شرارت کی کوئی ٹہر تو مگی نہیں ہے میری پیشانی پر۔"

"زور مگی ہو یا نہ مگی ہو لیکن پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں۔"

"یہی تو میں جانتا چاہتا ہوں کہ آخر آپ یہ بات کیوں کہہ سکتی ہیں؟"

وہ دھیرے سے مسکرائی پھر بولی "ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ بد معاش یہاں تھا اور میں نے اس سے خوف زدہ ہو کر آپ کا ہاتھ بے اختیار اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا تو آپ کا ہاتھ بڑی طرح کاپنے لگا تھا اور کچھ غصہ ابھی پڑ گیا تھا۔"

"اور اتنا آپ نے بوجھ لیا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے مگر ہی مگر میں اس حسینہ و شیزہ کی ذہانت کا اعتراف کرنے کے بعد مزید کہا۔ آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ ہاں واقعی یہ سچ ہے کہ میں خواتین سے انتہائی شرمناک ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ اس وقت بھی ایک خاتون کو اپنے روبرو یا کمرے سے دل کی حالت دگرگوں ہے۔ مجھ پر ایک نامعلوم سا اضطراب طاری ہے۔ شاید اس وقت بھی کچھ اسی طرح خود کو آپ سے خائف پارا ہوں جیسا کہ کچھ دیر قبل آپ... خود خائف دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے سب کچھ ایک خواب سا محسوس ہو رہا ہے۔ باہر اس کے کہ شاید میں خواب میں ہی ایک خاتون سے ہم کلام ہونے کی توقع کر سکتا تھا نہ جسارت؟"

"حیرت ہے! اس نے تعجب سے کہا! میں یقین نہیں کر سکتی کہ ایک بد معاش مرد سے ٹٹ لینے والا آپ جیسا بہادر مرد صورت ذات سے اس قدر خائف ہو سکتا ہے کہ میں آپ پر سب کچھ مذاق میں تو نہیں کہہ رہے؟"

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حرف بھرف درست ہے۔ دیکھیے اگر اس وقت آپ نے میرا ہاتھ لپی گرفت میں لینے پر اسے کپکپاتا ہوا محسوس کیا تو اس کا کلبب فقط یہی تھا کہ آپ کے دست نازک سے پہلے میرا ہاتھ ایسے کسی نسوانی ہاتھ نے نہیں تھاما تھا۔ میں خواتین سے بہت شرمناک ہوں مجھے ان سے بات کہتے ہوئے انتہائی بھٹک محسوس ہوتی ہے بلکہ بھٹک کیا محسوس ہوتی ہے، آپ یہ سمجھے کہ میں کسی خاتون سے بات کر ہی نہیں سکتا۔ آپ پہلی خاتون ہیں اس دنیا کی جن سے میں اس قدر بے تکلفی کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ مجھے یہ خدشہ خواتین سے ہم کلام ہونے سے ڈرانا کرتا ہے کہ شاید مجھے خواتین سے ہم کلام ہونے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ یقین کیجیے اس وقت بھی میرا دل اس خیال سے کانپے جا رہا ہے کہ کہیں میں آپ سے کوئی غلط یا معیوب بات تو نہیں کر رہا ہوں... دیکھیے اگر کوئی ایسی بات نکل گئی ہو میری زبان سے یا آئندہ نکل جائے تو مجھے فوراً ٹوٹ دیجیے گا۔ کیا کوئی ایسی بات کہی ہے جس نے جو آپ کو ناگوار گزری ہو؟"

"ہرگز نہیں" وہ مسکرا کر بولی پھر اس نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ ایک بات بتاؤں میں آپ کو کہہ بیٹھتا ہوں۔

شرعیلے مردوں کو ہی پسند کرتی ہیں اور مجھے یہاں تک شرف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ خود مجھے بھی آپ جیسے شریفیے اور مذہب مرد ہی آپھے لگتے ہیں۔

میرا دل دیوانہ وارنا چتے لگا۔

”آئیے چلتے جائیں اور باتیں کرتے جائیں۔“

”کہاں چلتے جائیں؟“

”میرے گھر تک۔“

”کیا آپ یہیں کہیں رہتی ہیں؟“

”جی ہاں۔ وہ جو سامنے گھر نے نظر آ رہا ہے میں آپ کو نہیں

انہی میں سے ایک گھر میں رہتی ہوں۔“ اس نے کچھ دور روشن دروازے

والے گھروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو گویا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو آپس کے گھر تک

پہنچا دوں اور آپ پر سزا میرا شکر یہ ادا کر کے خدا حافظ کہتی اپنے

گھر میں چلی جائیں۔“

”کیا یہ کافی نہ ہوگا؟“

”نہیں۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”بلکہ یہاں پوچھیے تو یہ ظلم

ہوگا مجھ پر اور گناہ ہوگا آپ پر۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے اور مجھے

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

”دیکھیے! میں خدا کو حاضر و ناظر جاننا نہ کہتا ہوں کہ میری

پچیس سالہ زندگی میں آپ پہلی خاتون ہیں جس سے میں اس طرح

بات کر رہا ہوں۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ آپ سے پہلے میں کسی

خاتون سے ہم کلام نہیں ہوا ہوں۔ بے شک چند خواتین کا میری

زندگی میں کہہ کہہ کچھ نسل نسل رہا ہے۔ مثلاً بوڑھی جو ابائی جس کے

مکان کے ایک کمرے میں ہیں پے آنگ۔ کیسٹ کے طور پر

رہتا ہوں۔ مگر ان خواتین کی حیثیت میرے نزدیک خاصی بزرگ

اور محترم رہی ہے۔ لیکن مجھے کہ مادہ اور خواہا نہ سی۔ شاید آپ یقین

نہ کریں مگر یہ سچ ہے کہ آپ سے مل کر مجھے یوں محسوس ہوا ہے

جیسے میں برسوں سے اپنے خوابوں میں رہنے والی اس لڑکی سے مل

رہا ہوں جو میری آئیڈیل ہے۔“

”خوب! تو گویا آپ آئیڈیل پر یقین رکھتے ہیں؟“

”ہاں میں آئیڈیل کیسٹ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور مجھے یقین

تھا کہ ایک نہ ایک دن میں خوابوں سے باہر حقیقی دنیا میں بھی

اپنی آئیڈیل کو پاؤں گا اور اس کے سامنے رہنا دل اپنے جذبات

یونہی بھول کر رکھ دوں گا جیسے کہ میں خوابوں میں کیا کرتا ہوں۔“

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ خوابوں میں اپنی آئیڈیل سے

کیا باتیں کیا کرتے ہیں؟“

”کچھ تو پوچھیے۔“

”پھر بھی۔“

”آپ خطوں اور آئیڈیل کی بات چھوڑیے میرے دل کی

بات پوچھیے۔“

”چلیے دل ہی کی بات بتا دیجیے۔“

”دل کی بات تو سب سے۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس

کھینچتے ہوئے کہا۔ ”کہ میں بلکہ سیکڑوں مرتبہ میرا دل چاہتا ہے کہ

کسی نوجوان اور عورت کو دیکھنے سے ہمکامی کا شرف حاصل کر سکوں

تہائی میں اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ اسے بتاؤں

کہ میں کس قدر تنہا اور دل گرفتہ ہوں۔ اس بھری پری دنیا میں

ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے مجھے بھی قابلِ اعتنا سمجھا ہو۔ میرے

تنہا اور الم رسیدہ دل پر محبت بھرے دو غفلت کے پھانے رکھے ہوں

اور اسے یہ سب کچھ بتانے کے بعد مدت بستر اس سے گزارش کروں

کہ محبت ہونے کے لئے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ مجھ جیسے تنہا

اور اس شخص کو اوروں کی طرح ناقابلِ التفات کرانے کے بجائے لائق

محبت جانے سے بتاؤں کہ میں اس سے فقط آشنا چاہتا ہوں کہ وہ

میرے دل کی بات پوری ہمدردی کے ساتھ سنے اور میرے غم کو پو

ہنسا چاہتی ہے تو ضرور ہنسنے کا مختلف میرا مسکرا کر لے کر محبت اور

ہمدردی کے دبول مجھ سے ضرور لے۔ میرے مایوس اور تنہا دل

میں امید کی جوت ضرور جگا دے چاہے اس کے بعد وہ دوبارہ مجھے

خود سے ملنے کی اجازت سے یاد دے۔“

میں نے دیکھا وہ میرے اس جذباتی مکالمے پر نہ ٹھہرا کر

ہنسنے لگی تھی۔

”آپ سن رہی ہیں! خیر کوئی بات نہیں اگر آپ میرا مسکرا

اڑا کر خوش ہونا چاہتی ہیں تو میں بڑا کو میں مناؤں گا۔“ میں نے

قدر سے دل گرفتگی سے کہا۔

”غلط مت سمجھیے۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میں

آپ کا مسکرا نہیں اڑا رہی ہوں بلکہ میں تو آپ کی سادگی پر ہنس رہی

ہوں۔“ وہ مل بھر کر غنمی پھر بولی۔ ”آپ نے کسی خاتون سے یہ سب

یکو کہنے کی کوشش تو کی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی جس کو دل

اور زبان خاتون بشرطیکہ وہ احمق نہ ہوئی یا اس وقت کسی اور سبب

سے برا فرد خستگی کے عالم میں نہ ہوئی آپ کی خواہش کا ضرور بالخصوص

اشتراک کرتی اور آپ سے محبت اور ہمدردی کے دبول نہ در بولتی۔“

اس کے ردبانہ توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”مگر میرا یہ خیال غلط نہیں ہو سکتا

ہے۔ میں ممکن ہے کہ اس خاتون نے آپ کو دیوانہ ہی گمانا ہوتا۔

کیوں کہ پہلے میں نے جس خیال کا اظہار کیا وہ سراسر میری اپنی سوز

کے مطابق تھا۔“

میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔

میرا مطلب ہے میں چونکہ ایک نرم دل لاکھ ہوں اس لیے اگر آپ جیسے کسی دل گرفتہ شخص سے مجھ سے ایسی ہی دل گزشتگی اور لجاجت سے جس کا اظہار آپ کر رہے ہیں ہمدردی اور محبت کے دویوں کی طلب گاری ظاہر کی ہوتی تو میں یقیناً اسے بالکل سہنے کی ہمت نہ کرتا۔

”اوہ! ممکنہ... بہت شکریہ... ہزار شکریہ“ میں نے انتہائی غمی سے مطلب سمجھنے سے کہا: آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آپ کے حق الفاظ نے مجھے میری زندگی کی کتنی بڑی مسرت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

”اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھی جس کی بنا پر آپ نے مجھے ان خواتین سے جدا کر دیا ہے؟“ اللہ جل جلالہ آپ کے آپ کی زندگی میں مدخل ضروری نہیں مگر زندگی اور مقدر حقیقت میں میرا مطلب ہے وہ ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو میری جانب متوجہ کر ڈالا؟

”یہ بھی جلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بسنی آپ تنہا تھیں اور وہ نامقول شخص آپ کو تنگ کرنے کے واسطے تھا۔ آپ کی مدد کرنا میری اخلاقی فتنے دہری تھی۔“

”نہیں نہیں! میں اس سے پہلے کی بات کہہ رہی ہوں۔“

”پہلے کی؟“ میں نے استنہامیہ لہجے میں کہا۔ ”ہاں جب میں وہاں سمندر کنارے فیصل کے ساتھ کھڑی تھی اور آپ مجھے دیکھ کر اچانک تھم گئے تھے اور جب میں آپ کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے ہی تو آپ نے میرا تعاقب کرنے کی کوشش بھی کی مگر یہ پتہ چلنے کیوں نہ لگتی تھی۔“

”اور تب؟“ میں نے غلج ہو گیا پھر میں نے کہا۔ ”دراصل آج پہلی تاریخ ہے اور میری جیب بھاری ہے۔ ہر تنخواہ دار آدمی کی طرح میں بھی جیب بھاری ہونے کے احساس سے سرشار و مسرور و خوش خوش ہوتا ہوں۔ آج پتہ چلا کہ آپ تنہا کھڑی نظر آئیں میں آپ کو دیکھ کر گرا گیا مگر پھر آگے بڑھ جانے کو بھی تھا کہ آپ کی دہلی سکیوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔“

”مساف کیجیے گا میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ واقعی روبرو ہیں۔ ایک نیا ٹون کورٹا گئے سمندر کنارے تنہا کھڑے اور دستے دیکھ کر میں آگے بڑھ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے آپ سے آپ کی گریہ نزاری کا سبب پوچھنا اپنا اخلاقی فریضہ جانا اور بھانسنے آگے بڑھ جانے کے کھم بر گیا۔ مگر آپ نے مجھے غلط قسم کا آدمی سمجھتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی نیپ چاپ آپ کے پیچھے چلتے ہوئے آپ سے ہم کلام ہونے کے لیے مناسب الفاظ

ڈھونڈنے لگا مگر ایسی میں آپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر پایا تھا کہ آپ نے رخ بدلا اور سرگرم ہو کر لی اور مجھے دیکھ کر نکل گئیں۔ آپ نے مجھے غلط آدمی سمجھا جب کہ میں تو آپ سے آپ کے رونے کا سبب فقط اس خیال سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔“ میں نے محظوم بھر کو توقف کرنے کے بعد کہا: ”امید ہے اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ کی جانب کیوں متوجہ ہوا تھا۔ اگر اس وضاحت کے باوجود بھی آپ کے دل میں میری بابت کوئی بدگمانی ہو تو اسے رفع کر ڈالیے۔“

”بس اب اور کچھ مت کہیے اس سلسلے میں۔“ وہ سر کھجکا کر بحالت سے بولی۔ پھر اس نے مزید کہا: ”مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں آپ کو کوئی ایسا ویسا آدمی ہی سمجھتی تھی تاہم میری رائے یکسر بدل چکی ہے۔“ وہ چلتے چلتے تھم گئی اور اس نے کہا: ”اچھا اب میرا گھر تو آ پہنچا۔ وہ دیکھیے میں اس سانسے دل لے گھر میں رہتی ہوں۔ اس نے اعلیٰ سے ایک بڑے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس کی تمام جتیاں ماسوا صدر دروازے کے تنوں پر نصب برقی لمپوں کے گل تھیں۔“ میں آپ کی بہت ممنون ہوں اور اب اجازت چاہتی ہوں۔“

”کیا ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے؟“ اس نے میری جانب دیکھا پھر اسے چاند کی نظر کی روشنی میں سکھانے ہوئے بولی: ”آپ کے تو محبت اور ہمدردی کے فقط دویوں کی طلب گاری ظاہر کی تھی اور اب آپ... بہر حال اگرچہ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں مگر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔“

میرا دل نامعلوم سی خواہش سے بے ستم شاد ہو گئے لگا۔ ”خاکون معظمہ! اگرچہ آج میری آخری ناشٹ ڈیوٹی تھی۔ اور اب دو ہفتوں بعد ہی ناشٹ ڈیوٹی شروع ہوگی مگر میں کل ات بھر یہاں آؤں گا اور فیصل کے پاس آپ کی راہ دیکھوں گا۔ مساف کیجیے گا آپ بھی سوچیں گی کہ یہ نامقول آدمی تو پھیلے ہی پلا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں آپ کہہ رہے ہیں خاصی سے تابی کا اظہار کر رہے ہیں نا، بلکہ سچ پوچھیے سزا پکڑتے پکڑتے کلائی دو پٹے کی دستکش کر رہے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سچ بتاؤں آپ کو۔“ میں نے جذبات کی شدت سے بوجھل آواز میں کہا: ”میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والا آدمی ہوں۔ جیسی مسرت مجھے آج کی ہے جتنی زندگی میں ایسی بانگزارت سے میں کبھی دوچار نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خوابوں میں بھی میں نے ایسی مسرت کا مزہ شاید کبھی نہیں چکھا۔ وہ شاید اس لیے

”بہت اچھی طرح“ وہ ہنس کر بولی۔ اور اسی واقفیت کی بنا پر میں آپ کو کل رات یہاں آنے اور طے کی اجازت بھی دے رہی ہوں مگر واضح رہے کہ یہ اجازت مشروط ہوگی۔“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہوگی۔“ میں نے سہے تانا باز کہا۔  
”اچھا تو سنیے شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غلط توقع منسوب نہیں کریں گے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس بات کو میں یوں کہنا چاہوں گی کہ آپ اپنے دل کو میری محبت میں گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔“

”کیوں؟“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”کیوں کہ اس کا فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ میرے لیے یہ امر قطعاً بعید از امکان ہے کہ میں کسی اجنبی کی محبت کو اپنے دامن میں سمیٹ سکوں۔ میں آپ کی دوست بننے کو تیار ہوں بلکہ تیار کیا ہوں، بن ہی چکی ہوں مگر آپ مجھ سے محبت کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کریں گے۔“

”میں... میں قسم کھاتا ہوں کہ...“ اس سے آگے میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”ارے نہیں، مجھ آپ سے کوئی قسمیہ وعدہ نہیں چاہیے۔ سچ پوچھیے تو آپ کو یہاں دوبارہ بلانے میں کچھ میری اپنی غرض نہیں ہے۔ مجھے ایک اہم معاملے میں مشورہ دینا ہے اور ہر قسمیہ سے میرا کوئی دوست نہیں جو مجھے مشورہ دے سکے کیوں کہ میں کسی بلا چلتے سے تو مشورے کی طلبگار ہوں نہیں سکتی تانا ہم آپ مجھے ذرا مختلف قسم کے آدمی سمجھتے ہیں۔ شاید کسی کی بیس سالہ شناخت بھی اسے میرے لائق اعتماد نہ بنائی جتنا کہ میں اس قصور و درانیے کی ملاقات کے بعد آپ کو سمجھ رہی ہوں۔ میرا دل تو اب ہی دسے ہا ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔“

”آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کل رات کا انتظار میں بھلا کیوں کر کر سکوں گا کیسے تیری گئے آئندہ بائیس گھنٹے؟“

”گھر جا کر گہری نیند سو جائیں اور نیند میں بھی اس خیال کو ذہن سے محو نہ ہونے دیں کہ میں نے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے اہم ترین معاملے میں آپ سے مشاورت کی جانی ہے۔“

”کیا آپ میرے صبر کا امتحان لینے کے بجائے مجھے اس معاملے سے آج اور بھی آگاہ نہیں کر سکتیں؟“

”آئی بے تابی مت دکھائیے۔ فی الحال اسے راز ہی رہنے دیجیے۔“

”آپ کا مطلب ہے کل رات تک؟“

کہ جس نالائق سے آدمی حقیقی زندگی میں کسی ایشمان نہ ہوا ہوا اس کا مزوہ عذاب میں بھلا کیوں کر چک سکتا ہے مگر اب جب کہ میں آپ جیسی نوجوان اور خود مختار خاتون سے نہ صرف ہم کلامی کا شرف حاصل کر چکا ہوں بلکہ آپ کی زبان سے اپنے لیے ہمدردی اور محبت کے رس بھرے کلمات بھی سن چکا ہوں، یہ تجربہ مجھے اپنی زندگی کا حاصل محسوس ہوا ہے۔ آج ساری رات آپ میرے خوالوں کا محور بنی رہیں گی۔ بلکہ شاید پورا ہفتہ میں آپ ہی کو اپنے خوالوں کا محور بننے دیکھتا رہوں گا۔۔۔ بلکہ پورا برس... نہیں تمام زندگی میں اپنے خوالوں میں آپ ہی کو دیکھتا رہوں گا۔ دیکھیے آپ دوبارہ طے اور کل میاں آنے کا وعدہ کریں یا نہ کریں کل شب پھر اسی وقت سمندر کنارے آؤں گا۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ کھڑی تھیں اور وہاں کھڑے ہو کر سمندر کی موجوں کا دل گداز شور مچاتے ہوئے میں آج کے تصور سے کل کو رکشون کروں گا۔ یقین کیجیے کہ اس مقام کو میں اب ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا میں بلکہ یہاں آؤں گا اور کبھی سمندر کو اور کبھی چاند کو دیکھتے ہوئے آپ کے تصور سے اپنی تالیق راتوں کو روشن کرنے کی کوشش کروں گا اور کیا عجیب کہ آج کے دن کی یاد مجھے بھی اسی طرح گریہ و زاری پر مجبور کرے جیسا کہ کچھ دیر قبل میں نے آپ کو کرتے دیکھا تھا۔ وہ میرے اس طویل جذباتی مکالمے سے خاصی متاثر نظر آنے لگی۔

”میرا خیال ہے کل رات دس بجے میں پھر وہاں آؤں گی۔“

میرا مطلب ہے سمندر کنارے فصیل کے پاس آپ اگر چاہیں تو وہاں آسکتے ہیں۔ اس نے کہا۔ پھر ہنسی سی تنبیہ کے ساتھ بولی مگر دیکھیے آپ یہ نہ کیجیے کہ میں بطور خاص آپ سے کوئی وعدہ وید کر رہی ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے ہی کسی کام سے رات دس بجے وہاں آنا ہے اگر آپ آنا چاہیں تو آجائے گا مجھے آپ سے ہمدردی اور محبت کے دو بول بول کر مسرت ہوگی۔ مگر آپ اپنے دل میں میری جانب سے کوئی غلط خیال مت آنے دیجیے گا۔ خدا نخواستہ یہ نہ سمجھ بیٹھیے گا کہ شاید میں اجنبی مردوں پر ہمیشہ یونہی ایک بھکتے لہر بان ہو جایا کرتی ہوں۔ میں آپ پر اپنی لہر بان نہ ہوتی اگر... مگر خیر اس امر کو آپ میرا ہی راز رہنے دیجیے۔ اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”اوہ! آپ حکم کیجیے۔ میں آپ کے ہر حکم کے سامنے سسر تسلیم کر دوں گا۔ آپ فقط وعدہ کرنے کی بات کرتی ہیں جان بھی مانگیں گی تو آپ ہر شمار کرینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں آپ کا فرماں بردار اور تابعدار رہوں گا... اب تو آپ مجھ سے واقف بروی چکی ہیں آپ کو میری طبیعت کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا۔“



”ہو سکتا ہے کل بکھار دینے بھی ممکن ہے کہ پوسل یا پھر اس کے بعد۔ دراصل میں وہ اہم معاملہ آپ کے گوش گزار کر کے آپ سے مشورہ لینے سے قبل آپ کے تفصیلی تعارف حاصل کر لینا چاہتی ہوں“

”مگر آپ ابھی میری جانب سے تذبذب میں ہیں؟“  
”نہیں یہ بات نہیں بلکہ میں بے دخلی اور دوستی کی فضا میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں تفصیل سے اور کھل کر میں چاہتی ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے میں آپ کے بارے میں جتنا بھی جان سکتی ہوں جان لوں“

”ٹھیک ہے میں کل رات آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ میرے خدا! مجھے تو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا ہے یا شاید یہ کوئی معجزہ ہے۔ اس مختصر سی ملاقات میں آپ کے مجھے بے اندازہ خوشی دی ہے... ٹھیک ہے کل رات میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا“

”میں آپ کی منتظر رہوں گی“  
”وہیں تفصیل کے نزدیک؟“  
”ہاں وہیں“

”اچھا تو میں آپ کو آپ کے گھر کے دروازے تک پہنچا دوں“

”نہیں نہیں میں آپ ہی پیل جاؤں گی دو قدم کا تو فاصلہ ہے“

”جیسے آپ کی مرضی... تو مجھے اجازت ہے؟“  
”ہاں بالکل اجازت ہے“

”خدا حافظ!“  
”خدا حافظ!“

اس رات میں خوشی کے مارے تمام اوت جاگتا ہوا۔ آنے والی کل کا تصور میرے دل کے سماں خانوں میں چین زار مہکائے دے رہا تھا!

☆  
اصلی رات جب میں وقت مقررہ سے قبل مقام مقررہ پر پہنچا تو اس کا درد زور تک پتا نہ تھا۔ مجھے کھڑکیا دو گھنٹے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ آئی تو میں نے بے تابانہ کہا! دو گھنٹے میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ کاش! تم جان سکتیں کہ میں نے کل کی رات اور آج کا دن کتنی مشکل سے گزارا ہے۔

”بہر حال گزارا تو لیانا! وہ سکر آکر بولی۔  
”کیا خیال ہے ذرا آگے نہ پل کر بیٹھیں قدر سے تاریکی میں تاکہ لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں؟“

”جیسے آپ کی مرضی“  
”آؤ تو پھر آگے چلتے ہیں“  
”ہم ساحل کے تمام ریشم جھنڈے سے قدم سے تارکی میں جا بیٹھے۔“

”یہاں ہم لوگوں کی نگاہوں کی پروا کیے بغیر اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں“ میں نے کہا۔

”اور آج ہم اونچی بونگی باتیں کرنے کے بجائے ڈھنگ کی باتیں کریں گے۔ خدا معلوم میں کل کیا کچھ کہہ گئی اور آپ نے نہ جانے کیا بھلا ہوا کیا؟ وہ بولی پھر اس نے مزید کہا! ”کل رات میں بھی تادیر جاگتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ آنے والی کل یعنی آج جب ہم ملیں گے تو ذرا سنجیدگی سے باتیں کریں گے اور پہلے میں آپ کے بارے میں ساری تفصیل معلوم کروں گی...“

”کیا مطلب؟ کیسی تفصیل؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے آپ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ وغیرہ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھے کہ میں آپ کی کہانی سننا چاہتی ہوں یعنی آپ کی داستانِ حیات“

”کیا تمھارے خیال میں میری کوئی کہانی ہو سکتی ہے؟“  
”کیوں نہیں؟ ہر شخص اپنے ساتھ ایک کہانی لیے پھر رہا ہے... اپنی کہانی اور بھی کہانی“

”میں نہیں سمجھتا کہ میری بھی کوئی کہانی ہے۔“  
”میں مان ہی نہیں سکتی“

”کیوں؟“  
”کیونکہ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔“

”یقین کرؤ میری کوئی کہانی نہیں ہے میں تو خوالوں کی دنیا میں رہنے والا ایک انسان ہوں جو حقیقی زندگی میں بہت کم لوگوں سے ملتا ہے، بہت کم لوگوں سے بات کرتا ہے اور وہ بھی ضرور تھلا ایک شریلے اور ڈرپوک آدمی کی بھلا کیا کہانی ہو سکتی ہے؟“

”نہیں ایسا تو نہیں کہ میری دلوی جان کی طرح آپ کی بھی کوئی نابینا مگر سخت گیر دادی ہوں جو آپ کو باہر نکلنے، لوگوں سے ملنے اور ان سے بات کرنے کی اجازت نہ دیتی ہوں؟“

”نہیں میری کوئی دلوی یا نابینا نہیں مگر کیا واقعی تمھاری دادی جان اسی قدر سخت ہیں؟“  
”جی تو یہ کیجیے اسی ویسی سخت گیر اور ہلاکی ٹھکی پتلہ ہے یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے مجھ سے کچھ گستاخی سرزد ہوئی وہ دن ہے اور آج کا دن مجھے دن بھر دادی جان کے گھٹنے سے

مشکریہ

”اچھا تو اب میں اپنی کہانی شروع کرتا ہوں۔ خدا سونو کہ  
کیسی عجیب و غریب داستان ہے یہ۔“  
”آپ شروع کیجئے میں ہمیں گوش ہوں۔“  
میں نے ایک لمبی سی کھسار کے ساتھ گلا صاف کیا اور  
اپنی کہانی کچھ یوں شروع کی۔

”میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والا آدمی ہوں۔ زندگی کی  
کڑوی حقیقتوں سے مجھے غول آتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ  
ہو کہ والدین کے انتقال کے بعد میرا بچپن اور لڑکپن انھی تلخ حقیقتوں  
کے بیچ گزارا جس کا سبب تلخی کو کم کرنے کی خاطر میں نے خوابوں میں  
پناہ لی اور ایک غول میں محصور ہو گیا اور اب حلقہ ہے کہ میں اس  
غول ہی کو گل کائنات سمجھتا ہوں اور اس سے نکلنا پسند نہیں کرتا جس  
وسیع و عریض دنیا میں میرا کوئی ٹونس و رفیق نہیں۔ لوگوں سے مجھے  
ایک ناسلوم سا خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان سے ہٹے ہوئے  
ہیچا ہوتا ہوں اور اگر مجھ سے بھی میرے غریب خانے پر کوئی ہمان  
آہلئے تو میں جی کس اس نپتے کی طرح سمجھتا ہوں جسے شرارتی  
بچوں نے اپنی حرکتوں سے اس قدر تک کیا ہو کہ معمولی سی آہٹ  
پر بھی اس کے رونے کھڑے ہو جائیں اور وہ خوف زدہ نہا ہوں سے  
ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سمٹ کر چھوکتا ہو جائے۔ میری اس بچکاہٹ  
کو دوسرے لوگ بھی محسوس کیے بنا نہیں رہتے چنانچہ جو ایک  
مترہ مجھ سے ملتا ہے وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش نہیں کرتا۔  
شاید لوگ مجھے اکل کھا سمجھتے ہوں۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو میں  
تھیں پہلے تاج کا ہوں کہ میرے بچپن اور لڑکپن کے حالات نے  
مجھے ایک غول میں محصور کر دیا ہے۔ یہ غول میری بنا ہوا گاہ سے جہا  
تلخ حقیقتوں کے سہانے میٹھے اور شہانے سپوں کا راج ہے اور  
میں ان سپوں کو سینے سے لگا کر زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے فرار  
حاصل کیا کرتا ہوں۔“

”مسنو صاحب اس وقت تو آپ خوابوں کی دنیا سے  
نکل آئیں اور آگے چلیں میں بے تابانہ آپ کی کہانی سننے کی  
منتظر ہوں۔“

”الفت! میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ یہ میں تمہیں اپنی  
کہانی نہیں سناتا ہوں تو اور کیا ہے، بلکہ خدا اب مجھے نہ لوگنا تم  
نہیں جانتیں کہ اس وقت میں کتنا جذباتی ہوا ہوں۔ اس  
وقت مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے بیوں پر لگی خاموشی  
کی ہر ایک بک ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے  
میں جنر جنم سے تم سے واقف ہوں اور صدیوں تمہاری تلاش میں  
کسی سوداگی کی طرح بھٹکنے کے بعد آج ہی تم سے ملا ہوں تمہیں کونجے

لگ کر بیٹھتا ہے۔ وہ جس ہوتے ہی میری قمیص کا راس  
اپنی قمیص کے راس سے ہاندھ لیتی ہیں۔ دن بھر مجھے ان کے  
ساتھ یوں ہی ہاندھے بندھے رہنا پڑتا ہے۔ وہ کہہ دیا یا سلف  
پر بنائی کیا کرتی ہیں اور میں یا تو سلائی کڑھائی کرتی رہتی ہوں یا  
انہیں کوئی کتاب پڑھ کر سنایا کرتی ہوں۔ کسی اشد منہوت کے  
تحت ہی گرہ کھول کر اٹھ پاتی ہوں ورنہ تو داری جان کے ساتھ بندھے  
رہنا پڑتا ہے۔ اب آپ خود سوچیے کہ کیا یہ محکمہ خیر صورت حال  
نہیں کہ تقریباً دو برس سے میں اپنی بورسی اور تاجینا داری جہاں  
کے ساتھ صبح سے شام تک بندگی بیٹھی رہتی ہوں جب رات  
ہونے لگتی ہے تب داری جان خود گرہ کھول کر میری قمیص کا راس  
پننے راس سے بندھا کیا کرتی ہیں۔“

”حیرت کی بات ہے! خدا کا شکر ہے کہ میری ایسی کوئی  
دلوی نہیں! میں سننے لگا۔“

”تو پھر آپ لوگوں سے کیوں نہیں ہٹتے؟  
”بس مجھے اچھا نہیں لگتا یا یہ سمجھو کہ مجھے اپنے غول میں  
بہنا پسند ہے۔“

”کمال ہے! آپ خدا جانے کیسے آدمی ہیں۔ پر میرا  
تو اتنا ہی چاہتا ہے باہر نکلنے، لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں  
کرنے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی! میں تو داری جان کے پہلو  
سے لگ کر بیٹھتی ہوں بھی تصور ہی تصور میں ایک شاہزادے  
سے شادی بھی کر لیتی ہوں۔“

”مسنو! تو گویا میری طرح تم بھی خرابوں کی دنیا میں  
رہا کرتی ہو؟“

”شاید... مگر میں مردوں سے اس درجہ خائف نہیں ہوں  
جیسے کہ آپ بقول آپ کے عورت ذات سے اس خیر پر بحث  
چھوڑیں آپ اپنی کہانی سنائیے مجھے۔“

”کیا سناؤں بہت مختصر اور بظاہر بڑی عجیب سی ہے  
میرا کہانی تو؟“

”جیسی بھی ہے اور جو کچھ سمجھیں۔ ہے آپ سنائیں تو؟“  
”ابھی بات ہے کوشش کرتا ہوں مگر کیا یہ بہتر نہ ہوگا  
کہ پہلے ہم ایک دوسرے کا نام تو جان لیں۔“  
”میں بھی کتنی بے وقوف ہوں مجھے تو اب تک اس کا  
دھیان ہی نہیں آیا۔“

”کوئی بات نہیں مجھے خیال آ گیا ہے سو بتائے دیتے  
ہیں ایک دوسرے کو اپنا نام... میرا نام مسنوس ہے۔“  
”اور مجھے الفت کہتے ہیں۔“  
”پھو! مسنوس! یعنی ناک ہے۔“



داس میں صفر کے سوا اور بھلا کیا ہوتا۔

”بس کیجیے اب اندازہ چلائی مت، ہوں وہ شاید آپ کی باتیں مجھے لادیں گی۔ جو ہوا سو ہوا۔ گزرا وقت تو اب وہیں نہیں آسکا مگر یہ ہے کہ اب ہماری دوستی سوا قائم رہے گی تو وہ حالات کیسے ہی کبوں نہ ہوں۔ ویسے آپ یہ جان لیں کہ میں بالکل معمولی سی لڑکی ہوں۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ دو ماہ میرے والدین کے کپڑے میں انتقال کر جانے کے بعد حالات کچھ ایسے رہے کہ میں انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھ پر غصے میں بہت کچھ بتا دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنہائی کا جیسا کہ احساس آپ کو ہے کہ ویسا ہی مجھے بھی ہے۔ آپ کو آپ کے خالوں نے دنیا سے الگ تھلا کر دیا جب کہ مجھے دل ہی جان نے۔ ویسے آپ کے انداز گفت گوار آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بہت ہنس مکھ آدمی ہیں۔۔۔ میرا اندازہ درست ہے نا؟“

”نہیں کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ بی اسے پاس ہوں اور بس۔“

”یہ سچ ہے بی اسے بھی کچھ کم ہوتا ہے کیا! پوری چودہ جماعتیں! یہ بتائیے آپ کرتے کیا ہیں؟“

”ایک نجی انٹنل میجر کا ملازم ہوں۔“

”اب میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔ اس لئے ہل بھر کو توقف کیا پھر لولی۔ یہ بتائیے کہ اگر میں آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو لہائی کمانی سناؤں تو کیا آپ مجھے کچھ مشورہ دے سکیں گے؟“

”کیسا مشورہ؟“

”وہ تو اب کو میری کہانی سننے پر ہی پہنچے گا۔ فی الحال تو آپ وعدہ کیجیے کہ مجھے مشورہ دیں گے۔“

”دیو۔۔۔ میں نے کہا میں معمولی سمجھ لوجھ کا آدمی ہوں اور مجھے آج تک کسی مشورہ دینے کا اتفاق نہیں ہوا ہے مگر تمہارے طرز عمل نے مجھے ایسی ان کسی سترت بخشی ہے کہ میں تمہارے ایسے ہی جان تک دے سکتا ہوں۔“

”نہیں مجھے جان نہیں چاہیے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”نقطہ مشورہ چاہیے۔“

”اچھی بات ہے۔ اس کی ہنسی نے مجھے حققت سے دوچار کر دیا۔“

”راز داری شرط ہوگی۔“

”میں بھلا کس سے کہنے جاؤں گا۔“

”وعدہ؟“

”پکا وعدہ؟“

”اچھا تو اب میں اپنی داستان شروع کرتی ہوں۔“

★

”مسنوس صاحبہ میری آدمی کمانی تو آپ نے ہی چکے ہیں۔ یعنی میری ایک ضعیف اور ناپختہ دلوی جان ہیں۔ اب میں آپ کو اپنی بقیہ داستان بتاتی ہوں۔ اس نے مدد مہم شروع میں کیا۔ میں بے ساختہ ہنس پڑا اور اس سے کہا: ”خاک تو پختہ ہے! اگر آپ کی بقیہ آدمی داستان بھی اسی قدر مختصر ہے تو اللہ شکر! اختصاراً ایک عالمی ریکارڈ ہو گا۔“

”اچھا اب یوں چمکے نہ اڑائیے میرا۔“ وہ بولی پچھلے چپ چپ۔ ”جیسے بلکہ پہلے تو وعدہ کیجیے کہ آپ درمیان میں نہیں بولیں گے۔“

”چپ چاپ نہیں گئے۔“

”سب بڑا کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”یہی سمجھ لیجیے۔“

”اچھی بات ہے چپ چپ بیٹھوں گا۔“

”وعدہ؟“

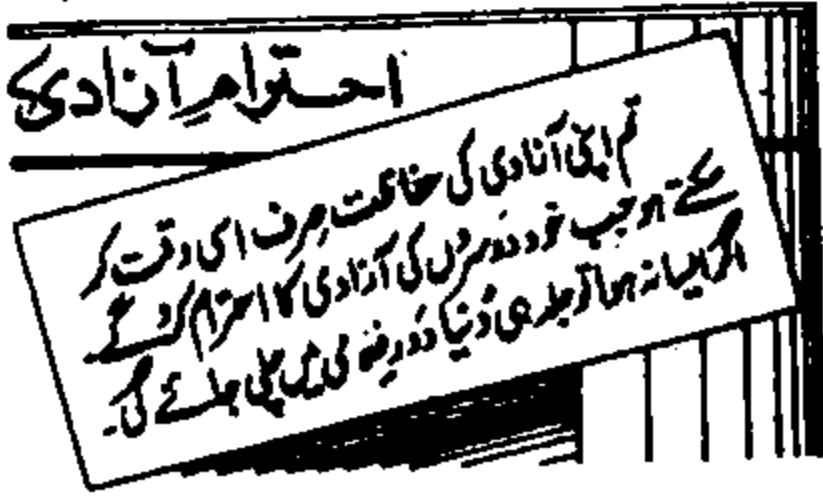
”جی بالکل پکا وعدہ جناب۔“

”اچھا تو سنئے۔۔۔ میں چھوٹی سی تھی کہ میرے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد میں دادی جان کی سرپرستی میں آئی۔ دادی جان کے پاس ولدا مرحوم کا چھوڑا ہوا بہت کچھ تھا۔ میرے ڈیڑھی کے تر کے نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ دادی جان اس وقت تھی جب کہ میں ان کی سرپرستی میں آئی۔ سا جمل سمندر پر واقع ای ٹی سے سے گھر میں رہا کرتی تھیں جہاں کہ ہم اب بھی رہتے ہیں۔ دادی جان نے مجھے بہت پیار دیا۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ مجھے اچھے اسکول میں داخل کر دیا۔ میرے لیے ٹیوٹر رکھا اور مجھے والدین کی کمی کا احساس نہ ہونے دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میری بد قسمتی کہ جن دنوں میں نوبل جماعت میں تھی دادی جان کی دونوں آنکھوں میں موتیا بند آتے آتے آپریشن کر دیا جو کامیاب رہا مگر پھر نہ جانے کیسے دادی جان کی آنکھوں کے جراثیم بیک بچھ گئے اور ماہر ہون چشم نے صاف جواب دے دیا۔ تب تک میں کالج میں پہنچ چکی تھی۔ اٹھ کے سال اداس تانات کے بعد کا ذکر ہے ایک روز میں نے اپنی عزیز ترین دوست کی سالگرہ میں جانے کے لیے دادی جان کی اجازت چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا۔ میں ان کے انکار کو نظر انداز کر کے تعزیت میں چلی گئی۔ جب بات مجھے میری سہیلی کا ڈرنڈور مجھے گھر پہنچا کر گیا تو دادی جان جگ رہی تھیں اور ہماری گھر پر ملازمہ سدا بچہ سخت پریشان اور سہمی ہوئی تھی۔ دادی جان نے مجھ پر خاصی برہمی کا اظہار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ میری اس حکم مدد ملی اور سرکشی کی سزا وہ مجھے اس صحت میں دینا تھی کہ

خوش ہوئی۔ نہ ملنے کا شکوہ بھی کیا تعلیم جاری نہ رکھنے کا سبب بھی پوچھا مگر میں نے اسے دادی جان کی ذی لہری منزا کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ مبادا وہ یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ اس کے جنم دن میں میری شرکت کے سبب ہوا۔ ویسے بھی میں اپنی ذاتیات میں دوسروں کو شامل کر لینے کی مسلح قائل نہیں ہوں۔ اپنی دوست سے ملنے کے بعد گھر واپس لوٹتے ہوئے میں بہت خوش تھی۔ ہاں میں آپ کو یہ بتانا کو بھول ہی گئی کہ دادی جان کے تائینا ہونے سے پہلے ہمارے پاس گاڑی بھی تھی اور ڈرائیور بھی مگر جب دادی جان تائینا ہوئیں تو انھوں نے گاڑی بیچ دی ڈرائیور اور مالی کو حجاب سے دیا۔ قہر رابعہ کو رکھا جو یہ وہ اور تنہا تھی اور لا ولد بھی۔ خیر قصہ مختصر اس روز میں اس خیال کے ساتھ گھر لوٹی کہ بس اس ہفتے سے چوتھے دن یہی کیا کروں گی کہ رابعہ کو لپی جگہ دادی جان کے دامن سے باندھ کر بٹھایا اور خود میرے سپاٹوں کو نکل لی مگر براہوس قسمت کا جب میں گھر واپس لوٹی تو تپا چلا کہ میری عدم موجودگی میں دادی جان کے جاگنے پر انھیں کوئی ایسی ضرورت درپیش آئی کہ رابعہ کے پاس سولٹے اس کے کوئی اور چارہ نہ رہا کہ لالو بول اٹھے یا پھر دم دبا کر بھاگ لے کیونکہ دادی جان حسب عادت میری طرح اسے بھی جھنجھور جھنجھور کر لینی ضرورت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور وہ انھیں اس گمان میں بھی نہ رکھ سکتی تھی کہ وہ یعنی میں سو رہی ہوں۔ چنانچہ کوئی دوسرا ستہ نہ پاتے ہوئے اپنی بچیت کی خاطر اس نے چپ چاپ دادی جان کے دامن سے بندھا اپنا دامن کھولا اور بھاگ لی۔ جب میں گھر واپس لوٹی تو دادی جان مجھے پکارتے ہوئے ٹھول ٹھول کر گھر میں پھانگی پھر رہی تھیں اور اس گمان میں تھیں کہ میں گھر ہی کے کسی کونے کھدے میں ڈبکی ہوئی ہوں۔ رابعہ کی بابت تو ان کے ایتقان نے انھیں یہی بتایا ہو گا کہ وہ حسب عادت کدھے کھوڑے نیچے سرورٹ کوارٹر میں سو رہی ہوگی۔ خیر حسب میں گھر لوٹی تو رابعہ کو بے تابانہ اپنا منظر پایا۔ وہ خاصی متوشش تھی اور اس نے دادی جان کے دامن سے اپنا دامن کھول کر بھاگ اٹھنے کا جو منظر الفاظ میں بیان کیا اس سے میں خاصی محفوظ ہوئی۔۔۔

اس کے ساتھ ہی وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور میں بھی اپنی

مجھے آگے نہ بڑھنے دیں گی۔ مزید آں یہ صحت نام ان کے قریب ہی بیٹھنا پڑے گا۔ میں نے یہ سوچا کہ وقتی وقتہ ہے اگلی صبح تک دادی جان ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔ لیکن اگلی صبح انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر میری قیص کا دامن اپنے کونے کے دامن سے باندھ لیا اور کہا کہ اب رات تک مجھے ان کے ساتھ اسی طرف بندھے رہنا پڑے گا۔ میں نے جی ہی جی میں سکر لائے ہوئے اسے وقتی منزا کھ کر قبول کر لیا لیکن میری بد قسمتی کہ یہ منزا مستقل طور پر میرا مقدر بن گئی اور دادی جان اس جواز کے ساتھ کہ جو تکہ میں کھا لیا تھی کی ذمہ داری ہوں اور ایک ہالان کی حکم مدد کی کر چکی ہوں چنانچہ اپنے نابینا پن کے سبب وہ آئندہ کے لیے مجھے ناقابل استہار سمجھ چکی ہیں اور اسی باعث دن بھر میری گزالی کرنا چاہتی ہیں، یہ منزا مستقل لالو کر دی اور میرے نتیجہ شکل آئے ہر میرے پاس ہونے کے باوجود مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں دن بھر دادی جان کے ساتھ بندھی رہتی رہتی۔ ہماری خادمہ رابعہ جو بہری تھی بے چاری دن بھر گھر کے کام دھندے نمٹاتی اور وقت کھانے پینے کا سامان ہمارے سامنے لا دھرتی۔ میں دادی جان کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی اور انھیں کتابیں پڑھ کر سنا سنے جاتی یا پھر سلائی کڑھائی کیے جاتی۔ سوانح ضروری کے لیے بھی دادی جان مجھے بمشکل اٹھنے دیتیں۔ دن میں نیند آتی تو ہم باہم ایک دوسرے کے دامن سے بندھے بندھے سو جاتے۔ مجھے اپنی دوستوں کے ہاں جانے کی اجازت ملنا تو درکنار ان کے فون سننے یا ان کے اپنے ہاں آنے پر انھیں گھر کے اندر جانے کی اجازت بھی نہ ملتی۔ دادی جان کے حکم رابعہ باہر سے باہر انھیں ٹال دیتی۔ رات کو عشاء کی اذان کے بعد دادی جان اپنے اور میرے دامن کی گرہیں کھولتیں تب کہیں جا کر میں اٹھ جاتی۔ ایک روز جب میں بہت ماجرا چکی تو میں نے اپنی اس عزیز بہت سے جس کے جنم دن کی تقریب میں دادی جان کی اجازت سے بغیر جاننے کے بھی اتنی بڑی منزا ملنی تھی، ملنے کی خاطر ایک منسوبہ بنایا۔ رابعہ کی منت سماجت کے بعد میں نے کسی نہ کسی طرح اسے آراہ کر لیا کہ دوپہر کو جب کھانے کے بعد دادی جان پر حسب معمول نوز گلہاری ہوگی اور وہ سو جائیں گی تو میں چپکے سے ان کے اور اپنے دامن کی گرہ کھول کر اپنی جگہ رابعہ کا دامن دادی جان کے دامن سے باندھ دوں گی اور اپنی دوست سے ملنے چلی جاؤں گی۔ میری واپسی تک رابعہ جو دوپہر کو سرورٹ کوارٹر میں بیٹی ہایا کرتی تھی میری جگہ دادی جان کے کونے سے بیٹھی رہے گی اور اپنی زبان پھیرا لگائے رکھے گی۔ میں نے رابعہ کو کھایا کہ میں ڈنڈہ دو ٹھنڈے میں واپس آ جاؤں گی۔ میری دوست ایک عرصہ بعد مجھے دیکھ کر بہت



ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ جونہی میں نے اس کی ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی وہ ایک بیک خاموش ہو گئی۔

”دیکھیے۔۔۔ موٹن صاحب!“ وہ بھیسی لہجے میں بولی بیٹپ کو میری دادی جان پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ مجھے اس تمام مہفتی کے باوجود جھانپوں نے گزشتہ دو ڈوہائی برس سے میرے ساتھ ردارکھی ہوئی ہے، بے مد عزیز ہیں۔ مجھے ان سے پیار ہے بلکہ کبھی کبھی تو بہت ترس بھی آتا ہے مجھے ان پر۔“

”سوری!“ میں نے معذرت کا اظہار کیا۔  
”قصہ مختصر اس روز تو کسی نہ کسی طرح میں نے بات بنالی لیکن آئندہ کے لیے رالہہ نے مجھیں اس سلسلے میں میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور دادی جان نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آئندہ میں نے ان کی اجازت کے بغیر ان کے دامن سے اپنا دامن کھول لینے کی جسارت کی تو وہ مجھے اس کی سخت ترین سزا دیں گی۔۔۔ خیر اس قصے کو زیادہ دن نہیں گزرتے تھے کہ ایک نیا کارہا ہمارے گھر کی انیسویں میں آسا۔۔۔“

”یعنی کوئی بڑا کارہا یا وار بھی تھا؟“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس سے پہلے ایک دوسرا کارہا یہ وار تھا جو آپ کی طرح موقع بے موقع دوسرے کی بات نہ کاٹتا تھا۔ وہ کئی برس دادی جان کا کارہا وار رہا۔ بہت ہی خشک مزاج کا آدمی تھا بشاؤنی بات کرتا میں مہینے کے مہینے دادی جان کو کارہا ادا کرنے کے لیے آتا یا پھر کوئی اشد ضرورت ہی اسے ان کے پاس کھینچ کر لاتی تھی وہ بالکل تہا تھا اور دادی جان کو اس نے اپنے بارے میں فقط اتنا بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور ایک بیٹا اس سے علیحدگی کے بعد کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ وہ شخص کسی دفتر میں افسر تھا اور سگریٹ پر سگریٹ چھوگے جانا اس کے نزدیک فائنا مقصد جیات تھا۔ ایک روز اس کے دفتر کے دوسرے شخص دادی جان کے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دفتر میں کاا کے دوران اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ پھر کوئی مہینے بھر بعد خبر ملی کہ وہ ضر گیا تھا اس کی تکفین و تدفین اس کے دوستوں ہی نے کی اور دادی جان کی درخواست پر انھی میں سے ایک دو دوستوں نے اس کا سامان ہماری انیسویں سے اٹھا کر ایک رفاہی ادارے میں پہنچایا۔ اس کے بعد جو نیا کارہا دارا انیسویں میں آیا وہ ایک نوجوان آدمی تھا جو بقول اس کے رہنے والا تو سکتھ کا تھا مگر اپنی ملازمت کے سلسلے میں کر لگی میں رہا کرتا تھا۔ اسے ہماری انیسویں کے کرائے کے لیے خالی ہونے کی خبر ہمارے سابقہ کارہا دار کے کسی دفتر کے رفیق کار سے ملی تھی اور وہ دادی جان کا کارہا دار بننے چلا آیا تھا۔ دادی جان کو اس نے اپنے

بارے میں یہی بتایا اس کے اہل خانہ سگھر میں رہا کرتے تھے اور وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھا۔ چو نکا اس نے دادی جان کو بلا لیا کرایہ ادا کرنے میں کوئی تردد نہ کیا اس لیے دادی جان کیلئے انیسویں کرائے پر رہنے میں اصولاً تو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے تھا مگر انہوں نے اسے غوری طور پر انیسویں کی چابی دینے کی بجائے اگلے دن بلا یا جب وہ چلا گیا تو دادی جان نے مجھ سے کہا: الفت جان! ایک بات بتاؤ۔

”جی دادی جان پوچھیے۔ میں نے کہا۔  
”یہ جو شخص ہماری انیسویں کرائے پر لینا چاہا۔ اسے کیسا ہے؟ کیا مطلب دادی جان؟  
”میرا مطلب ہے میری جان کہ پہلے واسے کرایہ دار کی طرح عہدہ سہ ہے یا نوجوان؟  
”چونکہ میں دادی جان سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی اس لیے میں نے کہا۔ دادی جان نہ تو وہ بہت بوڑھا ہے اور نہ تو عمر بڑھکا ہے۔  
”فریختے میں کیسا ہے؟ دادی جان نے کہا۔  
”بڑا نہیں ہے۔“

”اوہ!“ دادی جان متوجس ہو کر بولیں: یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ میں نابینا، نمنا سچو اور متوجس کرایہ دار جوان بھی ہے اور دیکھنے میں بھی بڑا نہیں۔ بہر حال چونکہ وہ گفت گو سے معقول آدمی محسوس ہوا ہے مجھے اور کرایہ دار رکھنا اس لیے اہم ہے کہ سگی بندھی رقم ملنا بھی ضروری ہے اس لیے میں اسے انیسویں کرائے پر رہنے پر مجبور ہوں۔ مگر دیکھو تمہیں سمجھائے دیتی ہوں کہ ابھی بچپنوں کی طرح محتاط بننا۔ جوان اور خوب رو مرد بننا بہتے دل کش نظر آتے ہیں بسا اوقات اندر سے اتنے ہی گڑ بڑ قسم کے ہوتے ہیں۔ سیدھی سادھی اور اچھی لڑکیوں پر مجال پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو میں اندھی ہوں مگر تمہاری بھولنے کے لیے تمہیں اپنے تجربہ حیات کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتی ہوں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ زمانہ بھی کتنی تیزی سے بڑھتا ہے آہ کیسا اچھا تھا وہ پلانا زمانہ۔۔۔“

”میں جی جی میں مسکرا دی۔ دادی جان کو تو ہر وقت پڑانے زلنے اور گئے دنوں کی یاد ستاتی رہتی تھی کیوں کہ تب وہ جوان ہو کرتی تھیں اور جیسے بھی شوری کی روشنی میں زیادہ چمک اور زیادہ حدت ہو کرتی تھی۔ چاند کی روشنی موجود ہونے کے مقابلے میں زیادہ چھائی ہو کر آتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں زیادہ خالص ہو آتی تھیں اور لوگ بھی آج کل کی طرح بیہودہ ولایات۔۔۔ غیر مذہب اور بے ایمان نہ ہو کرتے تھے۔ دادی جان کے خیال میں پڑانے زمانے میں سب ہی کچھ

آج کی نسبت بد چہرہ ستر ہو کر رہا تھا! خیر صوبہ وادی جان نے مجھے اس نوجوان کی بابت جو بقول ان کے ہمارا کراہیہ دار بننے والا تھا متنبہ کیا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا: دن بھر تو میں وادی جان کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی ہوں۔ اس وقت بھی جب کہ وہ کراہیہ داری کی استدعا لے کر ان کے پاس آیا تو میں ان کے ساتھ ہی بندھی بیٹھی تھی پھر انھیں مجھے متنبہ کرنے یا خود فکر مند ہونے کی بجلا کی ضرورت تھی؟ اور دل ہی دل میں اس امر پر غور کرتی ہوتی تھی کہ سلائی کڑھائی میں مشغول ہو گئی۔ اگلے دن وادی جان نے اس شخص کو ایسی کسی کر لے کر دیتے ہوئے اس سے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ اور زر ضمانت وصول کر لیا۔

”مہینہ ختم ہونے کے بعد جب وہ حسب شرائط اگلے ماہ کا کرایہ پیشگی دینے آیا تو میں وادی جان کو ایک ناول ”سارہی تھی۔ وہ گزشتہ ماہ اور اس ماہ کے کرائے کی باضابطہ رسیدیں بھی بنا کر لایا تھا اور ان پر وادی جان کے دستخط لینا چاہتا تھا۔ وادی جان چونکہ دیکھ نہ سکتی تھیں اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا کہ رسید کے مندرجات پر دستخط نہیں سناؤں اور ان کی جانب سے دستخط کروں۔ مندرجات سے وہیں جان کو آگاہ کرنے کے بعد دستخط کرنے کے لیے میں نے اس شخص سے قلم طلب کیا تو پتا چلا کہ قلم وہ نہ لایا تھا۔ وادی جان نے مجھ سے اپنا قلم لے آئے کو کہا۔ میں بے ساختہ اٹھی تو اپنے ساتھ میں نے وادی جان کو بھی کھینچ لیا اور سب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو کر شخص سے پہلے میں نے وادی جان کے دامن سے اپنا دامن رکھوا لیا۔ سخت کے ماہ سے میرا چہرہ تپا تھا۔ میرا جی پاپا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ خدا یا! کیا سوچا ہو گا اس نے مجھے وادی جان کے ساتھ بندھا اور میرے بے ساختہ اٹھنے پر وادی جان کو میرے ساتھ کھینچتا دیکھ کر غم زخم اور سخت کے احساس سے میری آنکھیں بھر گئیں ابھی میں رنج و ملال غصہ اور ندامت کے اس سمندر میں غلطال تھی کہ وادی جان نے گرج کر کہا: الفت کیا کر رہی ہے یہاں کھڑی جا کر قلم کیوں نہیں لے آتی؟ وادی جان کی اس پشیمانی نے مجھے اس کے سامنے اور بھی شرمسدا کر دیا اور باوجودیکہ اس دوران وادی جان میرا دامن اپنے دامن سے منہ نہ کھینچتے تھے میں شرمندگی کے احساس سے زمین میں گڑی ہاری تھی۔ وہ میری کیفیت کو بجا تپ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا اور وادی جان سے بولنے میں اپنا قلم لے کر آتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد وادی جان مجھ پر وہ برسیں کہ الاماں اور میرا یہ حال کہ آنسوؤں کی جھریاں تھی تھیں کچھ دیر بعد وہ قلم لے آیا اور رسیدوں پر دستخط کر دیے گئے۔

”اس دن کے بعد تو میرا یہ حال ہو گیا کہ جو کسی اعلیٰ گھنٹی بجتی تھی چسپ چاپ اپنے اور وادی جان کے دامنوں کے بیچ بیٹھی گڑھ ڈھیلی کر کے اس خیال کے تحت لے کر پورے طور کھولنے کو چوکنا ہوتی کہ شاید وہی

آیا ہو۔ وہ کسی دن درگاہ التماس کے دفتر میں وادی جان کے ذریعے وادی جان کو بیٹھا بھولا کر اس کے پاس کتابوں کا بہت عمدہ ذخیرہ تھا۔ چونکہ وہ بیٹھے بیٹھے کتاب جاتی ہوں گی اس لیے اگر وادی جان مناسب سمجھیں تو وہ انھیں کتابیں بھیج سکتا ہے وادی جان اس کے بیٹھا پر پہلی تو خامی ہو چکی تھی لیکن پھر انھوں نے وادی جان کے ہاتھوں اس سے چند کتابیں منگوا لیں۔

شاید اسے آزمانے کو اس نے جو کتابیں بھیجوائیں وادی جان نے پہلے خود نہیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھا اپنے دامن میں انھیں خوب ابھی طرح ایک کے بعد ایک کو جھاڑا، اُن اُن پر پڑھا پھر مجھ سے بولیں: ”اگر کوئی ایسی سیر کی کتاب بھیجوائی ہو اس نے تو مجھے بتانے میں تردد نہ کرنا۔ میں نے وادی جان سے ان کی اس بات کی وضاحت نہ کی تو وہ بولیں: ”زمانہ بڑا خوب ہے بیٹا! میں اندھی بنم نہ سمجھ اور کراہیہ دار نوجوان کسی کا کیا اعتبار کر سکتا ہے کہ وہ تمہیں وہ غلامی کو کوئی ایسی دہی کتاب بھیج دے۔

آپ اطمینان رکھیے وادی جان میں آپ کو یہ ساری کتابیں یکے بعد دیگرے سناؤں گی۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اچھے کتابیں ہیں یا بڑی۔

”اچھا! بھجورہیے تو میں نے انھیں بھاڑ بھٹک کر دیکھ لیا ہے۔ امتیازاً تم بھی دیکھ لو کہ کہیں اس نے کسی کتاب میں کوئی خدا دو تو نہیں رکھ بھیجا ہے۔

کیا خط وادی جان؟  
 ”میری بھولی بھالی پوتی کو ہر کانے کے لیے کوئی نام نہ نہجت! میرا اور کا سانس اور اور نیچے کانپے رہ گیا۔

”ایک ایک ورک الٹ پلٹ کر دیکھو گرو پش آمد کر دیکھو بعض دفعہ یہ بدذات مرد نوجوان اور معصوم لڑکیوں کو ہر کانے کے لیے کتاب کی جلد اور گرو پش کے درمیان محبت نامہ رکھ کے بھیجا کرتے ہیں۔ وادی جان نے کہا۔

”مجھے حجاب آنے لگا کہ وادی جان کسی عجیب و غریب باتیں کر رہی تھیں۔ تاہم ان کے اطمینان کی خاطر میں نے نوجوان کراہیہ دار کی بھولی بھولی پوتیوں کتابوں کا خوب اچھی طرح پوسٹا کر ڈالا مگر وہاں محبت نامہ تو جانا نالی لغافہ بھی برآمد نہ ہوا۔ البتہ ہر کتاب پر اس کا نام ”علی نواز“ ملی حروف میں درج تھا۔

”اگلے ماہ جب وہ کراہیہ ادا کرے وادی جان کے پاس آیا تو میرے وادی جان کو اس کی بھولی بھولی پوتیوں کتابوں میں سے چار بڑھ کر سنا چکی تھی جو وادی جان کو سب کی سب پسند آئی تھیں اور اس کے آنے پر وادی جان نے ان کتابوں کی بابت اپنی پسندیدگی کا اس پر اظہار بھی کیا۔

”اگر آپ کو یہ کتابیں پسند آئی ہوں تو میں مزید کتابیں بھیج دوں؟ اس کے لیے میں استفسار یہ کیفیت تھی۔

ہوں۔ تمہارے چہرے پر بوجھ ہے اور اسی اور ایسی کسی کے سامنے مجھے  
رنجیدہ کرتے ہیں۔ کیا تمہاری کوئی سبیلی نہیں جسے تم اپنے ہاں بلا سکو یا  
خود اس کے ہاں بلا سکو؟

”اس کے ہمدردانہ انداز کا طلبہ پر میرا بھی بھرا گیا اور میں نے  
بوجھل آواز میں کہا: ہاں ایک سبیلی ہے تو سہی گورداری جان نہ اس  
کا یہاں آتا پسند کرتی ہیں نہ میرا اس کے ہاں جانا۔“

”کیسے کبھا گھڑنے پھرنے ہی کو باہر نکل جایا کرو۔ دن بھر گھر  
میں بند رہنا کسی طور بھی اچھا نہیں۔ اس نے کسی اور مند دوست  
کی طرح کہا۔“

”دادی جان اس کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔“

”میرے ساتھ کچھ دیکھنے چلو گی؟“

میں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا اور بڑبڑاتی بچکر  
’ہاں بڑی اچھی بچکر ہوئی ہے قریبی سنیما ہاؤس میں۔ وہ  
لحظہ بھر کو تمہا پھر بولا۔“ چلو گی؟“

”نہیں۔ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ دادی جان اجازت نہیں دیں گی۔“

’دادی جان کو بتائے گا کون۔ آخری شوی میں چلیں گے۔ تو سب  
تک تو تمہاری جان بخشی ہو ہی جاتی ہے۔ وہ سکرلتے ہوئے کہا۔  
’آپ کو کیسے پتا؟‘

’تمہارے گھر سے کی جی جوبل اٹھتی ہے عشاء کے بعد۔‘

’اوہ! تو کیا آپ...؟‘

’ہاں میں روزانہ یہ بات نوٹ کرتا ہوں اور اسی لیے تمہیں فل  
کے آخری شوی میں چلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔“

’معاف کیجیے گا جناب! میں نے کزخت لہجے میں کہا: آپ  
کو غلط نہیں ہوئی ہے۔ میں ان رنگیوں میں سے نہیں ہوں جو آپ  
جیسے لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے بزرگوں کے اعتماد کو دو جو کا دیا کرتی ہیں  
مجھے اپنی دادی جان سے پیار چلا وہ میں کسی قیمت پر ان کے اعتماد کو  
دھوکا نہیں دوں گی۔ پھر میں نے زہر خند لگا ہوں سے اسے گھور لاور  
آگے بڑھ گئی۔ مجھے اس خیال نے خامسا دکھ پہنچا یا کہ میں تولے شریف  
اور ہمدرد نظرت کا انسان سمجھ رہی تھی مگر وہ تو کچھ دوسری قسم کا آدمی  
نکلا تھا۔“

”اس شام وہ دومی کتابیں لے کر دادی جان سے ملنے آیا اور تازہ  
دادی جان سے باتیں کرتا رہا اس نے دلوئی جان کو اپنی باتوں سے ایسا  
برمایا کہ دادی جان نے مجھ سے کہا: الفت! تو از صاحب کے لیے چائے  
تو بنا لا اور ہاں کچھ کھانے کو بھی لے آنا۔ اس نے منع کیا مگر میں جو  
چپکے سے اپنے اور دادی جان کے دامنوں کے بیچ بندھی گرہ کھول

اگر میں اور تم پڑھ چکے ہو تو رابعہ کے ساتھ بھجوا دینا۔ انیکسی کی  
صغائی تو وہ کرتی ہے نا باقاعدگی سے؟  
’جی ہاں باقاعدگی سے ساتھ کتابیں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو  
میں خود پہنچا دوں؟‘

’نہیں! تم تکلیف نہ کرنا رابعہ سے بھجوا دینا۔‘

’جی بہتر! وہ دادی جان کے تردد کو تازہ کیا۔‘

”کرتے کی ادائیگی کے بعد جب وصولی کی رسید پر دستخط لینے  
کا مرحلہ آیا تو اس نے اپنا قلم پیش کیا اور میں جو رابعہ کی زبانی اس کی  
آمد کی اطلاع سنتے ہی اپنا دامن دلوئی جان کے دامن سے کھول چسکی  
تھی اس کے ہاتھ سے قلم لیتے ہوئے گزشتہ ماہ پیش آنے والے واقعے  
کو یاد کر کے خفقت کے مارے سُرخ پڑ گئی جب وہ جانے کو اٹھا تو  
دلوئی جان نے وہ چاروں کتابیں جو میں انھیں بڑھ کر سنبھالی تھی اس  
کے ساتھ کر دیں۔ اس کے چلتے ہی میں نے جلدی سے اپنا دامن  
دادی جان کے دامن کے ساتھ باندھ لیا۔ اگلے ہی دن اس نے رابعہ  
کے ہاتھ مزید کتابیں بھیج دیں۔“

”کوئی ہفتہ بھر بعد کی بات ہے رابعہ باری کے بیٹا میں مبتلا  
اپنے کوارٹر میں بڑی تھی اور میں اپنی رقم دل اور خلاتر س دادی جان کی  
ہدایت پر رابعہ کو گرم دودھ کا پیالہ اور باری کے سٹار کی گولی پہنچانے  
کے بعد اس کے کوارٹر سے لوٹ رہی تھی کہ وہ انیکسی کی جانب  
بیش قدمی کرنا نظر آیا۔“

’سلام علیکم! اس نے کہا۔‘

’سلام علیکم! میں نے ہڑبڑا کر کہا اور وہ میری اس  
ہڑبڑاہٹ پر دھیرے سے مسکرا دیا۔“

”میں نے آگے بڑھ جانا چاہا مگر اس کی آواز نے میرے قدم پکڑ  
لیے۔ نیبے! اس نے آہستگی سے کہا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی  
جانب دیکھا تو وہ بولا: آپ تمام دن اپنی دادی کے پاس بیٹھے بیٹھے لکنا  
نہیں جاتیں؟“

’آپ... آپ سے کس نے کہا کہ میں تمام دن ان کے پاس  
بیٹھی رہتی ہوں! میں نے اس کی اس دخل در معقولات کا بڑا منڈنے  
کی کوشش کی۔“

’مجھے اندازہ ہے اور اسی باعث آپ سے ہمدردی بھی ہے۔  
’اس کے اس جواب نے مجھے خفقت سے دوچار کر دیا۔ مجھے  
اس خیال نے آزار پہنچا یا کہ میرے ساتھ دلوئی جان کے ناروا طرز عمل  
کے باعث اب غیر بھی مجھ پر ترس کھانے لگے تھے۔ میں نے ایک با پھر  
قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز نے پھر میرے قدم  
پکڑ لیے۔“

’تم بہت اچھی لڑکی ہو اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا



## سائرس اعظم

ایران کا شہنشاہ سائرس اعظم میں نے ۵۵۸ قبل مسیح سے ۵۲۹ قبل مسیح تک حکومت کی تھی، اس میں کسی نہ کسی شکل میں ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہے۔ مثلاً اسی کی وجہ سے ہندو مت کو بارہ بارہ گھنٹوں کے دو دفعوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایشیا کی گنتی درجن کے حساب کرتے ہیں۔ فن تعمیر میں ستون استعمال کرتے ہیں اور تیلون یا لاجپتے بنتے ہیں۔ یہ تمام اختراعات سائرس اعظم ہی سے منسوب کی جاتی ہیں۔

بھی تھی، مرتے غصت جان کر اٹھیں میدی کرنے کو آٹھ گھڑی ہوئی۔ بس پائے لے کر ہائی تو وہ دلوئی جان سے کچھ کہہ سکا تھا۔ کال گیا کبھی کسی آپ گھر سے پھرنے کو باہر بھی نکلا کریں۔ گھر میں بیٹھے تھے تو آپ کو یہاریاں آگھریں گی اور آپ کی سمحت خواب ہو جائے گی تازہ ہوا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔

”خدا جانے اس نے میری مدد کی ہے میں دلوئی جان پر کیا جاؤ پڑھ لکھو نہ کتا تھا کہ میں نے دلوئی جان کو اس سے کتے سنا بیٹھے! میں بوڑھی اور نا پینا عورت باہر بھلا کون نکل سکتی ہوں! الفت کو لے کر نکل جایا کریں اور کچھ نہیں تو ساحل پر کچھ در کو چہل قدمی کر آیا کریں! اس نے کہا۔

’نماز خواب ہے بیٹا۔ الفت خیر سے جوان ہوگی ہے میں اسے لے کر نکلوں اور خزانہ کرے کوئی پیچھے لگ جائے یا کوئی اور بچ ہو جائے تو میں بوڑھی اور نا پینا عورت بھلا کیا کریں گی۔ کوئی مرد ساتھ ہو تو گھر سے باہر نکلنے کی ہمت بھی کر لوں مگر جوان ہوگی کے ساتھ نہیں! اگر آپ میرے ہمراہ چلنا پسند کریں تو میری خدمات عافیت نہ نہیں بیٹا تمہیں تکلیف ہوگی ویسے بھی آج تو رات کو بار بار کا سنا چڑھا ہوا ہے۔

’کوئی بات نہیں کل سہی! اس نے کہا! آپ کو جب بھی دکھتا ہوں نہ جانے کیوں مجھ پر ہنی والدہ کا خیال آتا ہے۔ آپ بھی مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں!‘

’پتے رہو۔ دلوئی جان نے کہا۔ اور میں جی ہی دی میں سوچ رہی تھی کہ کتنا چرب باہی ہے یہ شخص کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دلوئی جان کو شیشے میں اتار لیا۔ ’اگلی شام وہ دلوئی جان کا ہاتھ تھا تمام گراٹھیں ساحل سمندر کی سیر کرانے لے گیا۔ میں بھی ہمراہ تھی۔ ساحل پر چہل قدمی کے دوران وہ دلوئی جان کا ہاتھ تھامے رہا اور کئی گھنٹوں سے گاہے گاہے مجھے دیکھتا رہا اس نے ہمیں آٹس کریم بھی کھلائی۔

’اور اس رات پہلی بار اس نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا کہ وہ شیشے کے اعتبار سے میری بہن انجینئر تھا اور ان دنوں اپنی ترقی کے امتحان کے سلسلے میں جہاز پر سوار تھا۔

’ہماری گھر واپسی اندھیل چھا جانے کے بعد ہوئی۔ اس رات میں دیر تک جاگتی اور تمام وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ سیر مل گیا ہی دے رہا تھا کہ دلوئی جان کو چہل قدمی کے لیے لے جانا تو ایک سہانہ تھا! اصل میں تو وہ مجھے میری عجیبوس ذیلیا سے کچھ دیر کو نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں سلسلے کے قاری پڑھی نہ آنے کی تھی۔ زندگی کل غلامتہ میں سلسلے کی پکڑ چلنے کی دعوت کو قبول کر لیا ہوتا تو یقیناً ساحل پر داری جان کے ہمراہ چہل قدمی کرنے

ہوئے اس کی نگاہوں میں میرے لیے وہ احترام نہ ہوتا جو کہ میں نے اس شام اس کی ڈر ویدہ نگاہوں میں دیکھا تھا۔

’اگلے ٹھکانے میں ماہ کے دوران وہ مجھے اور داری جان کو باہر باہر باہر لے گیا۔ وہ دلوئی جان سے باتیں کیے جاتا مگر مجھ سے ہم کلام ہونے سے گریز کرتا تھا ہم کن انجیلوں سے مجھے دیکھے جاتا۔ اس کی نظروں میں مجھے اپنے لیے ہمدردی اور رحم کے تاثرات، ہکور سے لیتے دکھائی دیتے۔

’پھر جب موسم کے موافق رہنے لگے اور خشک ہوا میں چلنے لگنے تو دلوئی جان کے چہرے کے درد کے باعث یہ سلسلہ بیکر منقطع ہو گیا اور میں دوبارہ اسی محبوس ماحول میں مقید ہوئی۔ پھر ریاست کے دورے ہونے لگے کبھی میں بیٹھے بیٹھے رونے لگتی کبھی زور زور سے چلانے لگتی اور کبھی محض دلوئی جان کو تنگ کرنے کو بلا سبب تھمتے لگانے لگتی۔ مجھے دلوئی جان کے ساتھ بند کر بیٹھنا گراں مگنے لگا۔ نہ میرا کھانا، نہ ہنسنے میں دل لگتا نہ سلامتی کڑھائی میں۔ دلوئی جان لاکھتیں کوئی کتاب بڑھ کر سناؤ مگر میں ایک لفظ نہ بھول کر رہتی۔ میں اپنی پدوسی بری ہی جی میں گڑھے جاتی، کھانا بھی فقط زندہ رہنے کو کھاتی نہ تھی میرا جسم گھٹنے اور رنگ روپ ماند پڑنے لگا۔ وہ کبھی کبھی داری جان کے پاس آتا پھر میرا اور اس کا کبھی کبھار نہ پرتے جاتے سامنا ہو جاتا ایسے میں یکس طرف ہو جاتی، مگر جاتی مگر وہیں خاموشی سے گزر جاتا جیسے مجھ سے بات ہی نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں ہی جی میں حیران ہو کر سوچتی کہ اسے ایسی ہی بیگانگی کا مظاہرہ کرنا تھا تو پھر اس نے مجھے پکڑ چلنے کی دعوت کیوں دی تھی اور کیوں وہ مجھے اور دلوئی جان کو گھمانے پھرانے باہر لے جاتا تھا؟

’رات کو میں دیر تک اپنے اور داری جان کے مشترکہ گھر سے کی کھڑکی سے ایٹھسی کی طرف دیکھتی جاتی۔ رات گئے ٹھیک انیسویں ہی جلی رہی۔ یقیناً وہ اپنے امتحانات کے لیے پڑھ رہا ہوتا تھا۔

"پھر ایک روز وہ دلائی جان کے پاس آیا اور اس نے انھیں بتایا کہ وہ اپنے امتحانات سے فراغت پا چکا تھا اور کچھ عرصے کے لیے اپنے اہل خانہ کے پاس کھڑ جا رہا تھا اس نے ان سے مزید کہا کہ وہ ان سے واپس آنے کے بعد وہ تقریباً برس بھر کے سفر پر بلا ہائے گا چنانچہ اسے ہلکا کر دیار رہنے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ پرسوں تڑکے انکیسے خالی کی کے چلا جائے گا۔"

"میں یہ خبر سنی کہ ایک گھر سے صدمے سے دوچار ہوئی میری اس بھانجھائی کے سامنے رو پڑی۔ مدد شکر کہ دادی جان میرے تاثرات دیکھنے سے قائم تھیں۔"

"اس کے جانے کے بعد میں سخت اضطراب کے عالم میں تادیر یہی سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اور بالآخر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔"

"میں جانی تھی کہ در روز بعد وہ جا رہا ہے چنانچہ اگلی رات بھلے سپر جب دادی جان گہری نیند میں تھیں میں نے زبیر باؤل بستر سے اٹھ کر اپنے دو چار چمڑے کپڑے سے ایک گھڑی کی صورت بنا لی اور گھڑی سینے سے لگا لے انکیسے ٹمک جا پہنچی۔ میرے قدم دنگا ہے تھے سلا باز رہا تھا اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اچسی کے دروازے پر دستک ٹن کر رہا اس نے دروازہ کھولا اور مجھے کھڑے دیکھا تو گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تم...! اس نے حیرانی سے کہا۔ اور اس وقت؟"

"میں متوجس می انکیسے میں داخل ہوئی اور کپڑوں کی گھڑی بستر پر رکھ کر خود سہری کنگنہ لگتے ہوئے میرے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر دفنا شروع کر لیا۔ وہ جلا صورت حال سمجھنے کے لیے میرے نزدیک آکھڑا اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے اس قدر دل گزشتگی اور مایوسی سے دیکھتا نظر آیا کہ میرا دل بھی رونے لگا۔"

"دیکھو الفت: اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ نئی الحال تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا بہت فتنے داریاں ہیں بھر پر بہت عرصہ نہیں ہوا ہے مجھے نوکر ہوئے اور کتنی مشکلات سے گزرنے کے بعد میں نعتہ انجینئر کی حیثیت سے بھری جہاز پر اپنے کیمز کا آغاز کر سکا ہوں اس کا شاید تم انلازہ بھی نہ کر سکو۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے والدہ اور چھوٹے بھائی بہنوں کی کفالت میری ذمے آئی ہے یعنی ڈھائی تین برس کی ملازمت میں انھیں کچھ زیادہ راحت نہیں پہنچا سکا ہوں۔ حالات میں بہتری کی خاطر میں ایک غیر ملکی کمپنی کے جہاز پر ملازمت کے لیے معاہدہ کر کے تقریباً برس بھر کے سفر پر نکلنے والا ہوں۔ ہفتے بھر کی نسلت حتی سو میں نے سوچا طویل سفر جانے سے قبل والدہ اور بھائی بہنوں سے بھی ملنا جاؤں اس سفر سے واپسی پر ہی میں اپنے بارے میں سوچ سکوں گا اس سے پہلے نہیں۔"

"پھر وہ کافی دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا اس نے مجھ سے میری کہانی

سنی انھار السون کیا اور سمجھانا بھلا رہا۔ میں کھٹے صاف صاف بتا رہا کہ میں دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھے بیٹھے جا رہی تھی اور اب زیادہ عرصہ ایسے نہیں گزر سکتی تھی۔ میں کھٹے صاف صاف الفاظ میں بتا رہا کہ اب کی زندگی کے نہری دن دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھے کے بجائے میں اس کے ہمراہ فرار ہو جانے کو ترجیح دوں گی۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس کی چند روزہ کو سفر مانی تھے میرے دل میں ایسی جوت جنگاری تھی کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ خدا جانے کہاں سے مجھ میں اتنی ہمت آگئی تھی کہ میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنا دل کھول کر اس کے آگے دکھ دیا۔"

"جب میں دل کی ہر بات اس سے کہہ چکی تو وہ میرے نزدیک آ بیٹھا اور اس نے مجھ پر آواز میں کہا یہ دیکھو الفت! ابھی لڑکیاں گھروں سے غرار نہیں ہو کر تیں وہ حالات کا مقابلہ کرتی ہیں بہت نہیں ہار کر تیں۔ تم ایک شریف گھرانے کی اچھی لڑکی ہو یہ بات میں بہت وثوق سے کہہ رہا ہوں! اگر تم اچھی لڑکی نہ ہو میں تو اتنا عرصہ اپنی دادی جان کے ساتھ بندھ کر نہ بیٹھی رہتی۔ بے شک تمہارے حالات خاصے پیچیدہ ہیں مگر تمہاری دادی جان بے جا ہی کبھی نہیں زمانہ واقعی خراب ہے انھیں یقیناً تمہاری بہت فکر رہتی ہوگی بہر حال زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی۔ چلاؤ میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا میں اگر کسی لڑکی کا بھروسہ سب سے زیادہ حق ہے تو وہ تم اور صرف تم ہو باجی میوریوں کے سبب نئی الحال میں بھی تم سے شادی نہیں کر سکتا اور نہ ہی او باشوں کی طرح تمہیں بھگالے جا سکتا ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے تم سے کہ میں نے جب بھی شادی کا ارادہ کیا تو تم میرا پہلا انتخاب ہوگی جیسا کہ میں نے کچھ دیر پہلے تم سے کہا کہ میں اپنے معاشی حالات میں بہتری کی خاطر ایک غیر ملکی جہازوں کمپنی سے ملازمت کا معاہدہ کر چکا ہوں۔ کچھ میں اپنے اہل خانہ سے مل کر آنے کے بعد میں ایک طویل سفر پر بلا جانوں گا۔ میرا انلازہ ہے کہ میری واپسی میں تقریباً برس بھر لگ جائے گا اور اس دوران میں ابھی خاصی رقم کما لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ اس دوران میری ان دو بہنوں کی شادی ہو جائے جو معاشی شدہ ہیں مگر ہمیشہ ہونے کے سبب گھر پر بیٹھی ہیں۔ میری واپسی پر اگر تمہاری کہیں اور شادی نہ ہوئی اور تمہارے دل میں میری محبت بدستور رہی تو میں تمہارا ہاتھ تمام لوں گا مگر دیکھو اسے وعدہ محبت سے سمجھنا کیوں کہ اول تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں تمہیں وعدے کی کسی ذمہ داری میں بندھ کر جاؤں اور سہری بات یہ کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ سال بھر بعد بھی میرے حالات اتنے بہتر نہ ہو پائیں کہ میں خود کو شادی کرنے کا اہل پا سکوں لیکن اتنا یقین ضرور دلا سکتا ہوں تمہیں کہ برس بھر بعد یا جب بھی میں میرے حالات بہتر ہوتے اور میں نے شادی کا ارادہ کیا تو میری نظروں بنا تو وہ پہلے تمہاری طرف

## دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے ٹی ڈی خریدا، جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی جب بھی ٹی ڈی بگڑا محمد اعظم نے کپٹی کو فون کیا۔ مکیٹک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکیٹک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکیٹک نے تیس روپے فیس جمع کرائی۔ شام کو آیا ٹی ڈی دیکھا، اینٹینا نکھایا اور چلا گیا ٹی ڈی کام کرنے لگا۔ ہر پہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز اعظم نے ایک دوکان پر ٹی ڈی گائیڈ نامی کتاب رکھی دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جرہ، ٹی ڈی کی خرابی صرف اینٹینا کے خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والا کا چھاپا ہوا کلرٹی ڈی گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا، اعظم نے کلرٹی ڈی گائیڈ بھی نہیں روپے میں خرید لی اور اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں تو اعظم نے ہمت کر کے مرمت کا سامان جو ٹی ڈی کو چیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے ٹی ڈی پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے ٹی ڈی بھی درست کئے اور تین پہینے میں خود پر پھر دوسرے کرنے لگا۔ ایک دن دیکھا۔ اعظم کے گھر پر پورڈ لگا تھا۔

” کلر و بلیک اینڈ وہائٹ ٹی ڈی ری پیئر ہاؤس -  
 ملنے کا وقت: صبح ۹ تا ۶ بجے اور شام ۶ بجے کے بعد۔“

اس طرح محمد اعظم نے اپنے لئے پارٹ ٹائم ورک حاصل کر کے اپنی آمدنی بڑھائی اور اپنے ٹی ڈی کی مرمت فیس سے بھی بچ گیا۔ ہر وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو اور ٹی ڈی سے دل چسپی رکھتا ہو ”ٹی ڈی گائیڈ“ اور ”کلرٹی ڈی گائیڈ“ پڑھ کر اچھا مکیٹک بن سکتا ہے۔  
 رزم کرشن اگر وال

ہی انہیں جی بٹر نیک اس وقت بھی تمہارے دل میں بھرے لیے محبت کے کسی ہذات ہوئے اور تم نے کسی اور سے شادی کرنے کو مجھ سے شادی کرنے پر ترجیح نہ دی۔ یہ بات میں تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں ناحق کسی وعدے کی زنجیر میں پانڈھنا نہیں چاہتا تمہیں پوری آزادی ہوگی کہ اس دوران اگر تمہیں کوئی بہتر اور مخلص آدمی مل جائے تو تم اس کا ہاتھ تھام لو۔  
 میں نے دھیرے سے کہا: میں آپ کا انتظار کروں گی۔  
 ٹھیک ہے، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اس نے کہا  
 پھر بولا: ہاں مگر ایک بات کا خیال رکھنا:

’میرے سفر سے واپس لوٹ آنے اور حالات کے ہمارے حق میں سازگار ہونے تک تم اپنی دادی جان کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔‘  
 آپ کو یہ ہمت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بھلا دادی کو بتا کر مجھے اپنی اور زیادہ شامت کو دعوت دینا ہے یا بھی تو وہ رات کو میرا دامن اپنے دامن سے کھول کر مجھے اپنے کمرے میں سوتھنے کی اجازت دے بھی دتی ہیں پھر تو وہ رات کو بھی مجھے اپنے ساتھ

باندھ کر رکھتی گی۔  
 ’خاصی شکند لڑکی ہو تم؟‘  
 ’وہ تو میں ہوں۔ میں نے اتر کر کہا: خیر آپ یہ تو بتائیں کہ مجھے آپ کی رابسی کی اطلاع کیونکر ملے گی؟‘  
 ’بندر گاہ پر جہازوں کی آمد و رفت کا شیڈول انجیل میں دیکھتی رہنا۔ اس سے تمہیں میرے جہاز کی آمد کا علم ہو جائے گا۔‘  
 پھر؟

’پھر جیسے ہی جہاز کر لگی پہنچے گا میں تم سے ملنے آؤں گا۔ خواہ مجھے پنج سمندر میں کھڑے جہاز سے کشتی میں سوار ہو کر ہی آنا پڑے۔‘  
 ’مجھ سے ملنے؟ میں نے گھبرا کر کہا۔  
 ’گھبراؤ مت تمہارے گھر میں آؤں گا۔‘

’تو پھر؟‘  
 ’سمندر کنارے اس فکیل کے پاس جہاں بیڑہ کریم تم اور تمہاری دونوں جان آسن کر گیم کھایا کرتے تھے۔ اس نے توقف کیا پھر بولا: دیکھو میں جہاز کے کرائی بیٹھنے کے بعد پہلے ہی روز تم سے بات دس بجے ٹھیک اسی مقام پر ملنے آؤں گا تم میرا انتظار کرنا۔‘  
 اور اگر آپ نہ آئے؟

’کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟‘  
 ’آپ پر تو بھروسہ ہے تبھی تو آنکھیں بند کر کے آپ کے پاس مل آئی ہوں البتہ... وقت کا اعتبار نہیں۔‘

خدا نے ہا ہا تو وقت بھی ہمارا ساتھ ہے گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے رائٹنگ میبل پر ٹھک کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا پھر اس کاغذ کو دستے سے علیحدہ کر کے اسے دہر آکر کچھیرے نزدیک پہنچا اور اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ یہ میرے ایک قریبی دوست کا پتہ ہے احتیاطی اسے رکھ لو اپنے پاس اگر کبھی خط لکھنے کی ضرورت پڑ جائے تو تم ایک لفافے پر اس کا پتہ لکھ کر اس لفافے میں میرے نام اپنا سکرہ خط و الال کر اور سال کر دینا۔ میرا دوست مجھے یہ خط متوجع منزل پر بھجوا دے گا۔

اور اگر آپ کے دوست نے وہ خط لکھا ہمارے گھر ہی بھجوا دیا یا مجھے دیکھ میل کرنے کی کوشش کی تو میں نے تو شدہ کاغذ لیتے ہوئے کہا۔

”وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولنا میں میں بھی تم بلا کی دھوا ندیش ہو... خیر اول تو میرا یہ دوست اس فحاش کا ہے نہیں دوسرے تمہیں اپنے خط میں اپنا نام لکھنا پتہ لکھنے کی بھلا ضرورت ہی کیا پڑی ہے خط بھی اسی صورت میں لکھنا جب کہ خط لکھنا ضروری ہو جائے ورنہ مت لکھنا۔ تمہاری طرف سے کوئی خط نہ ملنے کو میں اپنی دانست میں سب ٹھیک ٹھاک ہے پر تعبیر کرتا ہوں گا۔“

”چاہے ابرہہ میں مر ہی جاؤں۔“  
 ”تمہاری عمر میرے کی نہیں۔“  
 اسے زندگی کا کیا پتا، میرے ڈیڈی اور تم بھی تو اپنی جوانی ہی میں چلے گئے۔“

بڑا بیدار بنا سیکھو۔ اس نے کہا پھر بولا۔ اچھا اب تم اپنی لڑکیوں کی طرح اٹھو اور یہ گھڑی اٹھا کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو برا ہو گا۔“

”دیکھنے والا ہے کون۔ رابعہ تو سروسٹ کو اور میں گھوڑے گدھے فروخت کیے سو رہی ہوگی اور دادی جان بے چاری بھلا دیکھ کہاں سکتی ہیں۔“

”اپنی دادی جان سے پیار ہے تمہیں؟“  
 بہت۔“  
 ”تو پھر دکھ کیوں دینے چلی تمہیں انہیں؟“  
 مجھے خجالت نے آیا۔

”دیکھو۔ اس نے مجھے سمجھایا۔ جن سے ہمیں پیار ہوا انہیں کبھی کوئی دکھ دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے... شاپاش اب اٹھ جاؤ۔“

”میں اپنی گھڑی سمجھاتے ہوئے اٹھ تو گھڑی ہوئی اور تب ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے اس کے جہاز کا نام تو پوچھا ہی نہ تھا آپ اپنے جہاز کا نام تو بتائیں؟“

”اس نے جہاز کا نام بتانے کے بعد کہا۔ تمہیں جو پتہ دیا ہے میں نے اس پر ایک جانب اپنے جہاز کا نام بھی لگا دیا ہے۔“

”پھر ہم نے الوداعی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں اٹھتی سے نکل آئی۔“  
 اور اس کے ساتھ ہی وہ چھپ ہو گئی۔ اس کی خاموشی بھئی انتہائی گڑاں محسوس ہوئی۔

”پھر؟“ میں نے بے تابانہ پوچھا۔  
 ”اگلی صبح وہ چلا گیا۔“ وہ زندگی ہوئی آواز میں بولی۔  
 ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر میں اس کے انتظار میں دن گزارنے لگی۔ دن، ہفتہ اور مہینوں میں بدلنے لگے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تقریباً ایک برس بعد واپس لوٹنے کو کہہ گیا تھا میں برس بھر ہونے سے بہت پہلے ہی اخبار میں بندرگاہ پر جہازوں کی آمد و رفت کا شیڈول دیکھنے لگی۔ صبح جیسے ہی اخبار آتا نہیں جلدی جلدی اس کے جہاز کے نام کی تلاش میں اخبار کے اوراق دیکھنے لگتی... طویل اور آہستہ آہستہ

انتظار کے بعد تقریباً دو ہفتے قبل بالآخر مجھے اخبار میں اس کے جہاز کا نام نظر آیا۔ پروگرام کے مطابق اس کے جہاز کو ہمیں بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا تھا اور وہاں کے مطابق اسے رسول نجات دکن کے سمندر کنارے اس فیصل کے نزدیک بھوکے سے مٹنے کے لیے آنا چاہیے تھا مگر میں رسول نجات بھی اس کا انتظار کرتی رہی اور کل بات بھی میں اسی کی ماہ دیکھ دیکھ کے مایوس ہونے کے بعد انتہائی دل گرفتگی کے حلقہ میں رہ رہی تھی کہ آپ کا یہاں سے گزر ہوا اور...“

”دل گرفتہ ہونے کی کیا بات تھی ہو سکتا ہے اس کا جہاز پہنچا ہی نہ ہو۔“

”نہیں جہاز تو خیر پہنچ چکا ہے۔“  
 ”تمہیں کیسے معلوم؟“

”کل کے اخبارات میں اس کے جہاز کا نام ان جہازوں کی فہرست میں شامل تھا جو بندرگاہ بھکڑے میں۔ وہ چاہتا تو پورا زمینی کل رات تو مجھ سے ملنے کے لیے آسکتا تھا مگر نہیں آیا۔“  
 ”تو تم خود اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔“

”میرے حالات بدلتے ہوئے کبھی ایسی بات کر رہی تھی۔ کیا آپ کو میں نے نہیں بتایا کہ صبح آدھ بجے دادی جان کے ساتھ بندرگاہ پر پہنچا ہوا ہے۔“

”تو پھر اس کے دوست کی معرفت خط لکھو ہر نام کا پتہ بتاؤ تمہیں جاتے وقت دے گیا تھا۔“

”یہ خیال مجھے بھی آیا تھا مگر پھر میں یہ سوچ کر رہ گئی کہ خط جانے

”اوہ! اس کے لہجے میں بے پناہ حسرت عود کر آئی ہے آپ نہیں جانتے کہ آپ نے میری عاقبت بد کا ہاتھ بڑھا کر مجھے کسی خوشی دی ہے۔ میں... میں آپ کو خط ضرور دوں گی۔“

”کل رات تم مجھے یہاں خط لادینا میں برسوں میں پہلا کا لہجہ کروں گا کہ کسی طرح تمہارا خط اس تک پہنچانے کی کوشش کروں۔“

”کیا آپ کل صبح یہ کام نہیں کر سکتے؟“

”اگر تم نے کل رات مجھے یہ قہقہہ سنا دیا ہوتا اور آج خط لے آتی ہوتی تو میں یقیناً کل صبح ہی یہ کام کر دیتا۔“

”وہ... خط...“ وہ ہنسی بھری نظر سے بولی۔ ”خط تو میں لائی ہوں لکھ کر۔“

”واقعی؟“

”ہاں! اس نے دھیرے سے کہا۔ ”نہ جاننے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ٹکی کی صورت لپٹا ہوا لفافہ اپنے گریبان سے نکال کر میرے ہاتھ میں دبا دیا۔

جوڑھی اس کے ہاتھ میرے ہاتھ سے ٹس ہوئے میرے سہم میں پھر ایک برقی زد کی دھڑکنی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس زبان سے آپ کا شکر ادا کروں۔“ اس نے کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”کام ہوا نہیں اور شکر ادا کرنے لگیں۔“

”کام ہوا نہ ہو اور میری قسمت... سبھی آپ کے اچھا ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ کیا مجھ کو مجھے بیک میل کرنے کی دہلی دیتا۔ اور کچھ نہیں تو اس ستانے اور تاریکی ہی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا مگر آپ... آپ واقعی فرشتہ صفت آدمی ہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے فلانے کسی فرشتے کو آپ کے دل میں میری مدد کرنے کے لیے بھیجا دیا ہو۔ اگرچہ ملی نواز کے بعد میں اپنے دل کا دروازہ بند کر چکی ہوں اور یہ طے ہے کہ اس حیثیت میں تو کبھی کوئی دوسرا آدمی میرے دل میں داخل نہ ہو سکے گا مگر ایک دوست کی حیثیت سے آپ میرے لیے ہمیشہ حاضر رہیں گے۔ میں آپ کی شرافت سے اس قدر متاثر ہو چکی ہوں کہ اس تک میرا خط پہنچے یا نہ پہنچے آپ کی اور میری دوستی ہمیشہ برقرار رہے گی۔“

میں نے سو ہوا اُجیلے میں اس کے چہرے پر ایسی نکلیں سے ٹھہرنے کی کوشش کی۔

وہ واقعی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

میرے خوابوں کی پری سے بڑھ کر حسین!

مگر اس خیال نے کہ وہ میرے لیے نہ تھی میری آنکھوں کے کنارے بھگوریا۔ دہنے ایسی بیاض میں محفوظ یہ نظم یاد آنے لگی۔

اس تک میرا خط پہنچ بھی پانے گا یا نہیں اور کچھ کا بھی تو کب تک۔“

”اوہ! بدشات اور اگر مگر کا شکر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ بابا اگر تم نے کل خط لکھ دیا ہوتا اور کل ہی پوسٹ بھی کر دیتیں تو ایک روز میں خط لے مل بھی جاتا۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے پر اکتفا کیا۔

”ہو سکتا ہے وہ ابھی جہاز سے اتر ہی نہ سکا ہو بہت ہی مصروف ہو۔“ میں نے کہا۔

”میرا دل یہ بات نہیں مانتا ہے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جہاز کو رتھ نہ بھی ملی تو وہ کشتی میں سوار ہو کر ساحل تک پہنچے گا اور پہلے ہی دن مجھ سے ملنے آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنے گھر ہی نہ چلا گیا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے تائید کی۔

”میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا ہوا وہ یوں فراموش کر دے گا۔“ وہ لڑپ کر بولی۔ پھر اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”گزشتہ ایک برس سے میں اس کی راہ تک رہی تھی۔ وہ وعدہ فراموش کیا جانے کہ میں نے ایک ایک لمحہ کس بے تابی سے گزارا ہے۔“

”مابوس مت ہو۔“ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”آپ کو یاد ہو گا میں نے برسوں رات آپ سے کہا تھا کہ مجھے ایک اہم معاملے میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ یہی تھا وہ معاملہ اب آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ایسا کرو۔“ میں نے سوچ بچار میں وقت ضائع کیے بغیر کہا۔

”تم اس کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دو۔ میں تمہارا خط اسے پہنچانے کی کوشش کروں گا۔“

”اس کے دوست کے توسط سے؟“ اس نے استغنا مایہ لہجے میں کہا۔

”ضروری نہیں ویسے احتیاطاً تم اس کے دوست کا پتا بھی دے دیتا۔“

”کیا کوئی اور راستہ بھی ہے اسے خط پہنچانے کا؟“

”بالکل ہے۔“ میں نے اس کا جہاز بندر گاہ پر لنگر انداز ہے تو اس تک پہنچنا مشکل تو ہو سکتا ہے ناممکن ہرگز نہیں تم خط لکھ کر مجھے دینا اگر وہ یہیں ہے میرا مطلب ہے اپنے جہاز پر اپنے اس دوست کے پاس جس کا پتا وہ تمہیں دے کر گیا تھا یا اپنے کسی اور دوست کے ہاں جس کا پتا مجھے اس کے مذکورہ دوست سے مل جانا ناممکن ہو تو میرا وعدہ ہے کہ تمہارا خط حفاظت اور رازداری کے ساتھ اس تک پہنچا دوں گا۔“

”کیا واقعی آپ یہ ساری زحمت اٹھانے کو تیار ہیں؟“

”اگر میں تمہارے کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی۔“

عجب لڑکی تھیں خیر ہے

میں کتنی صدیوں کی سڑکوں سے گزرنے کے پہنچا ہوں اس کو ایک  
بچا کے رستوں کے چھوڑنے سے میں خود کو لایا ہوں اس کو ایک  
کمال کمال سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمہارے در تک  
گزرے تم نے جتنا دیا ہے  
بڑی اداسے بتا دیا ہے

تمہارے دل تک پہنچنے والی تمہارا میں سہ سہتی ہیں  
ادھر یہ عالم کہ میرے اشکوں میں سدا کی آہیں سہتی ہیں  
حسین لڑکی! میں باتنا ہوں

تمہاری دنیا میں چاہتیں ہیں، سڑکوں کا سرد بھی ہے!  
تمہیں سزا الیہ ہے آنا کہ اس پر تم کو غمزد بھی ہے  
میں ایک سائل نمونوں سے کھال

کمال کمال سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمہارے در تک  
جو ہو سکے تو کر دو۔

تم اپنے لموں سے ایک لمحہ بچا کے اس میں میرے بھر دو!  
اس رات جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو اس  
دوسرے کے ساتھ کہ کل رات پھر اسی متاثر ملاقات ہوئی۔



اگلی صبح میں نے اپنے ایک رفیق کار کو سونے سے سوچے فون  
کیا کہ وہ باس کو یہ بتا دے کہ میں ناسازی طبع کے سبب گا پر نہ  
آسکوں گا اور اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔

علی نواز تک پہنچنے میں مجھے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا  
یہ ایک الگ داستان ہے بہر حال کسی کی منت سماجت اور کسی  
کی خوشامد کر کے میں بالآخر علی نواز تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب  
ہو ہی گیا۔

اور اس کے بعد وہ پہنچنے کے بعد مجھے اپنی بے وقفی کا اسکل  
بھی ہوا۔

وہ مردانہ وہا بہت کا شاہکار نہ سہی مگر لائق ستائش ضرور تھا۔  
الفت کا اس کی محبت میں گرفتار ہونا قطعاً نظری عمل تھا علی نواز  
جیسے غلظت والا قدر قامت، مضبوط کاٹھ، نیشل آنکھوں اور گھنی پونچھوں  
والے نوجوان ہر نوجوانی بھی لڑکی عاشق ہو سکتی تھی۔

میں نے اپنے تعارف کے بعد الفت کا خط لے لیا اور وہ خط  
پڑھنے کے بعد مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "آپ کو  
الفت کیوں مانتی ہے؟"

"محض ایک اتفاق بنا ہے درمیان شناسائی کا یہاں نہی گیا۔  
وہ آپ کے انتظار میں حاصل ہو گئی رو رہی تھی کہ میرا وہاں سے گزر  
ہو تب مجھ اس نے الفت اگر جاننے کی کوشش کی مگر میرا سہا پن ہی بڑھے

ہر لمحے ہی مجھ پر ہونا پڑا!

میرے کیونکر؟

میرے آپ کو الفت ہی بتائیں گی۔ فقیر فقیر چکا اس نے یہ خط  
آپ تک پہنچانے کے سلسلے میں میری مددگار ای سو میں آپ تک  
یہ امانت پہنچا کر جا رہا ہوں!"

"الفت سے آپ کی واقفیت کتنی بڑی ہے؟"

"پہلوں رات ہی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے علی نواز  
کی آنکھوں میں کھسی تجھ پر دیکھتے ہوئے کہا: علی نواز صاحب آپ  
میرے اور الفت کے بارے میں زیادہ آگہی میں دیکھیں۔ وہ لڑکی  
واقعی ہمدردی اور محبت کیے جانے کے لائق ہے۔ اس کی جو لڑکی  
اس کے ہاتھ میں تھا گئے تھے وہ اسی کو تھلے آپ کی منتظر ہے اسے  
ماریوں نہ کیجیے گا اور مجھے فقط ایک وسیلہ سمجھو، آپ کو آپ کا مدد یاد  
دلانے کا!"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں مولانا صاحب! اس نے کہا  
"مجھ پر یہ کی کوئی بات نہیں! انسان ہی انسان کی وہا ہے میں  
نے تو الفت کی چارہ گری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ اس سے  
لے لیں تو میں بسوں گا کہ میری کوشش دانگ نہیں مہنی!"

"میں ضرور ملوں گا اس سے۔ یہ اصل نوکری بنات خود ایک  
نجواری ہے۔ اپنی جتنی الامکان کوشش کے باوجود میں تمہارے  
سہیں اتر سکا ہوں اب تک۔ تاہم آج رات ہلوری امید ہے۔ کیا  
آپ ایک زحمت اور کریں گے؟"

"ارشاد!"

"الفت کو یہ پیغام پہنچانے کی رحمت کیجیے کہ میں آپ کو  
دس بجے اس سے ملنے کے لیے آؤں گا وہ میری منتظر ہے۔"  
"آپ اطمینان رکھیے! اسے پیغام پہنچا دیا جائے گا۔"  
"بہت شکریہ!"

"اب مجھے اعازت دیجیے!"

"اور میں نے آپ سے چائے کافی وغیرہ کا تو پوچھا ہی نہیں  
"جب آدمی کسی کوشک کی نظر سے لنگھ رہا ہو تو اسے طبع  
بانوں کا کمال خیال رہتا ہے؟"

میری اس جھٹ سے وہ نکل نظر آنے لگا اور میرے ہزار نظر  
کے باوجود اس نے کالی پیچے بنا اٹھنے کی امانت نہ دی



اس شب میں جب ساحل سمندر پہنچا تو وہ میری منتظر  
تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے انتہائی بے تابی سے پوچھا: "کیا ہوا؟"  
"یادم تو لینے دو۔ میں نے کہا اور مجھے علی نواز پر رشک  
آنے لگا۔"

## جانور

ایک گھنے جنگل میں شکار کھلتے ہوئے کسی قدر ہانڑی شکاری نے اپنے لٹام سے پوچھا: اس جانور کا کیا نام ہے جس پر میں نے اسے بھی جھاڑیوں میں گولی چلائی تھی؟  
 لازم نے جھاڑیوں میں جا کر شکار کو دیکھنے کے بعد اطلاع دی: وہ کتا ہے کہ اس کا نام جھانڈ ہے۔

میں دم کو جھکا ہوتا۔ وہ اس وقت دنیا کا مظلوم ترین انسان دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ آپ واقعی مغیر ہیں۔  
 اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی: "کتے اچھے ہیں آپ۔"

وہ میری آنکھوں میں اتر آئے۔ مانی نمی کو نہ دیکھ سکی اور ہنس دی۔ میا دل چکے چکے کہنے لگا۔  
 "آپ نے میری مدد نہ کی ہوئی تو میں کیا کرتی؟ اس نے گھڑی بھر کے توقف کے بعد کہا۔

"آپ کتنے غصے میں اور کتنے بے غرض ہیں! اب آپ کی اور میری دوستی تا عمر برقرار رہے گی اور میں اپنی شادی کے بعد اسے بھی پابند کر دوں گی کہ وہ آپ کی اسی قدر عزت کرے جتنی کہ میں کرتی ہوں۔"

میرے دل میں الفت کی بے پناہ مستور تازہ ملی نواز کے وجود کے خلاف ایک جارحانہ لہر ابھری۔ ملی نواز کے مقدر پر شاک کے احساس کے حد کی جون لے لی اور میں نے کہا: "غرض کروڑہ نہ آیا تو پھر تم کیا کرو گی؟"

اس نے تڑپ کر میری جانب دیکھا پھر بولی: "خدا کے واسطے، زبان سلسی بد قال نہ نکالیں؟ پھر اس نے تمہیں تیروں کے ساتھ کہا: دیکھیے! اس وقت میں اتنی خوش نہ ہوتی تو آپ کی اس بات پر خواہ یہ ایک خیال آرائی یا قد شرہ ہی کیوں نہ سہی... اس بڑی طرح بولنے لگتی کہ آپ کو مجھے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ آپ نے تو اپنی راست میں ایک خدوٹے کا اظہار کیا ہے لیکن میں آج اتنی خوش ہوں کہ کسی بہ گمانی یا قد شرے کو اپنے دل میں تل بھر جگہ بھی نہیں دینا چاہتی ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں آج اتنی خوش ہوں کہ مجھے آسمان پر سبھا نہ ستارے بھی اپنے رنگ قہقہے لگاتے محسوس ہونے لگے ہیں۔"

تب ہی ہمیں اپنے محبت میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ہم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص تاریکی میں ہمیں پانی پاتا آہاد دکھائی دیا۔

پھر میں نے اپنے دھیرے دھیرے ملی نواز تک اپنی سائی اور اس سے ملاقات کا احوال سنا لیا۔ انتہائی جنت سے اور اشتیاق کے ساتھ سنتی رہی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ملی نواز آج اس سے ملنے کہ ہاتھ وہ خوشی کے ساتھ اٹھل پڑی۔  
 "بچے نہیں تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔"

میرا جی ہا ہا کہنے لگا وہ تمام واقعات اور خدشات یاد دلاؤں گی گا اس نے ملی نواز کی بات کل میرے سامنے لہا کر لیا تھا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا۔

ملی نواز کے کسے کسے غیر کیا اس کی چون ہی بدل دی تھی۔ وہ بات ہے بات بھلی بڑی تھی۔ اور کھڑے بھلی کے کھبوں کے مہروم اچھا ہے میں اس کا میں چہرہ حسین تر لگا رہا تھا۔ اور بھلی جی ہی جی میں سو رہا تھا کہ لوگ جب خوش ہوتے ہیں تو کس قدر خوب صورت دکھائی دیتے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے دل کی خوشی رو بہ دل کے دل میں بھی اٹھل پڑنے کے درپہ لہ لہا۔ وہ چاہتے ہیں پوری دنیا میں کہ رنگ مسکرائے جب وہ قہقہے لگائیں تو ساری دنیا بھی ان کے ساتھ کھلا کھلا کر ہنس پڑے۔ اس رات وہ کھلا کھلا ہر بان ہوئی جاری تھی۔ یہ سنا کر اس کے ذہن میں ایک عجیب سی ملازمت غنی ہنس کی مستراہٹ اس کا انتہائی اس کی آنکھوں میں ہنور سے لیتی تھی مجھ پر گمان کیے دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ...

تھلا! میں بھی کس قدر احمق تھا۔ سب کچھ ہنسنے بوجھنے میں خوش فہمی میں مبتلا کیوں ہوئے ہمارا تھا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی مسکراہٹ اس کا انتہائی اس کا اضطراب اس کی آنکھوں میں ہونے لیتا تھا اس مستور کے سر ہونے منت تھے جہاں سے اپنے محبوب سے ملنے کے خیال سے ہر ہی تھی میں کیوں اس خوش فہمی کا اس جھاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید وہ...

"کیا آپ جانتے ہیں کہ میں اتنی خوش کیوں ہوں؟ اس نے کہا پھر بولی: "کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو دیکھ کر میرا دل ایک ناکال پیا حسرت سے کیوں محسوس ہونے لگا ہے؟ کیوں آپ مجھے آج اسنے اچھے لگ رہے ہیں؟"

میرا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔  
 "کیوں؟ میں نے پوچھا۔"

"کیوں کہ آپ کی تہہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اب تک ہمنوں کا وہاں دھا چکا ہوتا۔ وہ میری اس طور مدد کرنے کے بجائے جیسی کہ آپ نے کی ہے، مجھے مزید پریشانی میں مبتلا کر چکا ہوتا اور اس وقت آپ کی طرح انتہائی شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ساتھ بیٹھ کر ملی نواز کا انتظار کرنے کے بجائے اس کا قریب بنا تلوار لے بیٹھا ہوتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں مٹا رہی ہیں بھر کر ہر تانک

”اوہ! وہاں گیلپے“ الفت نے خوشی سے مہم جوں میں کہا۔  
 میری بد قسمتی! میں نے جی بی بی میں سوچا۔ ایک انجیلا  
 لڑکھ ایک گہری مایوسی میرے دل کو لپیٹتی تھی میں دوپہلے رہی تھی  
 لیکن تیری سے ہم تارنگی میں آئے والا شخص علی نواز نہ تھا۔  
 جب وہ شخص ہمارے نزدیک سے ہوتا نظیب کی جانب  
 بڑھ گیا تو وہ بولی: ”انتظار کی کیفیت میں کسی صبر آنا ہوا کرتی ہے  
 آج کا دن بھی اتنی مشکل سے کٹا کرتا نہیں سکتی۔“  
 میں ایک دلی دلی سرفراہ سمجھ کر رہ گیا۔  
 ”کیا تم جانتی ہو الفت کہ میں نے دن کیونکر گزارا؟“ میں نے  
 گھائل نبھیں کہا۔  
 ”کیونکر بھلا؟“

میں وقت دیکھتے ہوئے جتا ہوا میرا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ  
 اسے وقت جتا کر ایک ایک سا دم چکا تو پتہ چلا کہ اب رات اتنی ہو  
 چکی تھی کہ اس کے مجھ سے کا کا مشکل ہی نظر آتا تھا۔  
 میرا وار خالی نہ گیا۔  
 ”اچھا! اس کی آواز کا ترجمہ جلد ہوا ہے کی شرمی ایک بیک  
 نامہ پڑھی۔ اپنی کلانی پر بندھی گھڑی کو لپیٹتی آنکھوں کے لیے مدد نزدیک  
 کرتے ہوئے اس نے بغور گھڑی میں دیکھا پھر پوچھل آواز میں بولی  
 ”وہ تھی سہاگیاں بچ گئے اس کا ڈھ ڈھک... آواز زندہ جانے  
 کے باعث اس نے اپنا جسم اٹھوڑا پھوڑا دیا۔  
 اس کے لہجے کی مایوسی سے مجھ اپنی سفاکی پر حشر مند گے  
 عکس ہوئی۔  
 کتنی خوش تھی وہ چند لمبے پہلے!  
 بھلا کیا ضرورت تھی مجھ سے جتنانے کی کہ سواگیاں نہ کی چکے  
 ہیں۔ کتا بے رحم ہو گیا تھا میں بندہ سسہ سے مغلوب ہو کر۔  
 اپنی اس بے رحمی کے انٹالہ اور غلطی کی تلافی کی میرے نزدیک  
 بس ایک ہی صورت تھی کہ اسے تسی دینا اس کی آس بندھانے کی  
 کوشش کروں سو میں نے کی۔  
 ”ہو سکتا ہے آج اسے کوئی کا پڑ گیا ہو... کوئی ایسا کام کہ اسے  
 یہاں آنے کی سہولت نہ مل پائی ہو۔ میں جہاز پر گیا تھا اور میں نے دیکھا  
 تھا کہ وہ خاصا مصروف رہتا ہے وہاں یقیناً کچھ ایسی مصروفیت  
 ہوئی کہ وہ اب تک نہیں آسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر سے آئے۔“  
 ”میں اس کے انتظار میں پوری رات تو یہاں نہیں بیٹھی تھی  
 سکتی بقول آپ کے اس لیے دس بجے یہاں آئے کو کہا تھا آپ تو  
 سواگیاں بچ چکے ہیں۔“  
 ”کچھ دیر اور انتظار کرو۔“  
 ”اور اگر وہ پھر بھی نہ آیا تو؟“  
 ”تو میں تمہاری خاطر کل پھر اپنے دفتر سے چھٹی کروں گا اور  
 اس کے نہ آنے کا سبب معلوم کرنے اس کے پاس جاؤں گا۔“  
 ”اوہ! شکریہ۔“ وہ جذبات سے مہم جوں میں بولی: ”آپ کتنے  
 اچھے ہیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ کبھی نہ آتا سکوں گی۔“  
 اس کی آنکھوں میں ہلکورے تھی تھی نے مجھے اس کی آنکھوں  
 میں بغور جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ میرا نوازہ دوست تھلا اس کی آنکھوں  
 میں لاتی آسوتھے۔  
 ”میزر دوست۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف  
 ہو رہی ہے۔“ میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔  
 ”نہیں میں رو تو نہیں رہی۔ اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”بلکہ میں تو یہ سہرا رہی ہوں کہ آپ کتنے اچھے ہیں بس قدر بہرمان

دفتر سے تو میں نے چھٹی لے لی تھی۔ تمہاری نامہ پری اور  
 علی نواز سے ملاقات کے بعد میں گھر واپس آکر بیٹھ پڑ گیا۔ شام کے  
 گھر سے ہونے تک کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ سونے کی ہر ممکن  
 کوشش کی مگر آکھ لگ ہی نہ سکی۔ رات کا اندھیرا پھیل جانے پر جب  
 میں بستر سے اٹھا تو مجھے ایک بیک۔ یونوں لگا جیسے کسی عورت کی نفسی  
 گم گشتہ جد ایک عورت کے بعد میری سماعت میں رزنگول رہی ہو لہجے  
 یوں لگا جیسے یہ نغمہ میری ساری زندگی میری روح سے کسی جتنے کلمہ  
 پھوٹ پڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا ہوا اور اب...“  
 ”خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں تو خاک  
 نہیں آ رہا۔“

میں سر جھکا کر چُپ ہو رہا اور وہ ایک بار پھر ویسی ہی شروع،  
 باتوں اور سرور نظر آنے لگی۔ مجھ اس کی بے بسی پر تانا ڈانے لگا۔ وہ دنیا  
 کو اپنے حوالے سے دیکھ رہی تھی میری جذباتی کیفیت کو اس نے  
 بے حس کی حد تک نظر انداز کر دینے کی کوشش کی تھی۔

اس نے شرمی اور سوسو کی انتہائی حدوں کو چھوئے ہوئے کہا: ”یہ  
 جی مونس صاحب آپ گروشت پرست کے انسان ہیں یا سہی کے؟  
 کتنی عجیب بات ہے کہ آپ نے مجھ سے بے تکلف ہونے والا  
 محبت کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اگر آپ اپنی شرافت اور کڑ  
 کی پتلی کی داد وصول کرنا چاہتے ہیں تو میرے حلق کی دوا بھی دینا پڑے  
 گی آپ کو کہ آپ سے پہلی ہی ملاقات میں آپ کو اپنا ہمبراز بنانے کا  
 ارادہ ظاہر کر بیٹھی اور دوسری ملاقات میں اپنا سارا کچھ کھول کر آپ  
 کے آگے رکھ دیا۔ بھلا کوئی عقلمند لڑکی ایسا کر سکتی تھی؟“  
 میرے دل میں رشک و حسد کی ایک لہر اٹھی۔

کیوں اتنی مسرور تھی وہ علی نواز کی آج کے خیال سے ا  
 اور کیوں اتنی بے نیبازی برت رہی تھی وہ میری قلبی کیفیت سے ا  
 ”سہاگیاں بچ چکے ہیں۔“ میں نے اپنی کلانی پر بندھی گھڑی



ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تم سے ملنے کی خاطر چھٹی لی ہوگی۔  
انشاء اللہ آج وہ ضرور آئے گا۔

مگر اس رات بھی اس کے لیے جہاز انتظار لا حاصل رہا۔ وہ نہیں  
آیا۔ الفت کی حالت دینی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے گھنگ اس کا حوصلہ چلب  
دے گیا اور وہ سمندر کنارے کھڑی سنگی فصیل پر بیٹھ کر ویسے ہی  
بھٹک کر رونے لگی جیسے میں لے لے سے پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ میں  
نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی مگر وہ بڑی طرح تڑپ رہی تھی۔  
”مجھے جھوٹی منت ملتی ہے۔ اس نے گھائل بچے میں کہا۔

”مجھ سے یہ منت کہیں کہ وہ آج نہ ہی کل ضرور آئے گا۔ مجھے یہ  
سبھالنے کی کوشش مت کریں کہ اس نے میرے ساتھ بیٹھے رہنے اور  
بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مجھے سی بے نوا اور مجبور لڑکی سے  
بے جا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اسے اپنا وعدہ بھلا کیوں یاد رہا ہوگا؟  
اس کی آواز نکلنے پر لحظہ دھیمی سے دھیمی ہوتی چلی گئی یہاں  
تک کہ لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی آواز سکینوں میں بدل گئی۔ میرا دل  
کٹنے لگا۔

”کتنا بے رحم ہے وہ؟“ قدرے توقف سے اس نے پھر بول  
کھولی۔ بے شک نہ آتا وہ مگر آپ سے بھونٹا وعدہ تو نہ کرتا آئے  
کا۔ صاف کہہ دیتا کہ مٹا نہیں چاہتا مگر بھونٹا وعدہ کر کے مجھے انتظار  
کی صلیب پر لٹا کر سیرا تماشاً تو نہ بنا تا کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرمندگی  
محسوس ہونے لگتی۔ میرا قصور فقط اتنا ہی تو ہے تاکہ میں اس سے  
محبت کرتی ہوں۔ اور اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی میں اس  
رات اپنا اسباب سمیٹ کر اس کے پاس جا پہنچی تھی۔ اب سوچتی ہوں  
تو مجھے اس خیال سے نہایت ہونے لگتی ہے کہ اس محبت کے  
ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس رات خود کو اس کے قدموں میں گرادیا  
تھا... میرے اس تصور کی کتنی بڑی سزا دی ہے اس نے مجھے؟  
”فکر مت کرو ابھی تو بارہ بھی نہیں بچے ہیں۔“  
”اب بھلا کیا آئے گا؟“

”تھوڑی دیر اور انتظار کر لینے میں کیا حرج ہے؟“  
”اگر وہ آج بھی نہ آیا تو؟“  
”تو ہم کل بھی اس کا انتظار کریں گے کیونکہ وہ دو دن کی چھٹی  
پر ہے۔“

”اور اگر وہ کل بھی نہ آیا تو؟“  
”تو میں پھر جاؤں گا اس سے ملنے۔“  
”روز روز دفتر سے چھٹی کریں گے تو افسر خفا نہیں ہوں گے  
آپ کے؟“  
”پرسوں ہفتہ واری تعطیل ہوگی۔“

اور بعد میں ظہیر نے دل میں آپ کا اور ملی نواز کا تعالیٰ کرنے کی کوشش  
کر رہی تھی مگر جب مجھ سے محبت ہے مگر مجھے یہ اعتراف کرنے میں  
کوئی حار نہیں کہ آپ اس کے مقابلے میں کبھی زیادہ مددگار نہ رہا ہوں  
وہ آپ جیسا کیوں نہیں ہے؟ کاش وہ آپ جیسا ہوتا۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ وہ کچھ دیر بعد کہنے کی منتظر رہی۔  
”پتا ہے کیا؟“ وہ بوجھل لہجے میں بولی تب مجھ سے اس کی سنجیدگی اور  
ماموشی سے ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا مگر جب میں اپنی گھٹتی لہجے اس کے  
ساتھ فرار ہو جانے کی نیت سے اس کے پاس پہنچی تو اس نے سنجیدگی  
سے مجھے دیکھا وہ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ گواہی میری حوصلہ شکنی کی  
مگر یہ کہہ کر کہ اس نے کبھی شادی کے بارے میں سوچا تو میں پہلی  
لڑکی ہوں گی جس کا وہ اپنی شریک سفر کے طور پر انتخاب کرے گا۔  
اس نے میرے دل کو ایک اچھوٹے سرخوشی سے ملا لیا تھا۔  
اس وقت میرے گھائل میں بھی نہ تھا کہ وہ اپنا وعدہ یوں فراموش  
کر دے گا کہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے کی زحمت بھی گوارا نہ  
کرے گا۔“

”وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ آج نہ ہی کل سی۔ میں نے  
لے پھر کتنی دینے کی کوشش کی اور کہا۔ تم فکر نہ کرو میں کل  
دوبارہ جاؤں گا اس کے پاس۔“

بارہ بجے کے گھنگ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”میرا خیال ہے اب کافی دیر ہو چکی ہے میں اٹھ لینا چاہیے۔“  
”کل وہ ضرور آئے گا۔ میں کل پھر اس سے ملوں گا۔ لے تاول  
گا کہ تم اور میں گزشتہ شب کتنی دیر تک ادکس بے چینی سے اس کا  
انتظار کرتے رہے۔ کل رات ہم پھر اسی مقام پر ملیں گے۔“

”کتنے بچے؟“  
”بھئی میں تو شام ڈھلتے ہی نانہ برہن کر یہاں آ پہنچوں گا۔  
تمہیں جیسے ہی موقع ملے نکل آنا گھر سے۔“  
”ٹھیک ہے۔ اس نے دھیر سے کہا۔

☆  
گلے روز جب میں نے گزشتہ روز کی طرح پھر علی نواز کے  
جہاز پر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ  
دو دن کی چھٹی لے کر جہاز سے اتر آ ہوا ہے۔ مجھے آپ ہی آپ یقین  
سا ہو گیا کہ اس نے الفت سے ملنے کی خاطر چھٹی لی ہوگی۔  
اس رات جب وہ آئی تو اس نے آتے ہی بے تابانہ پوچھا۔  
”آپ نے مجھے تمہیں اس سے؟“

”ہاں۔“  
”کیا اس نے کیوں نہیں آیا تھا وہ کل؟“  
”بھئی وہ تو کل سے دو دن کی چھٹی لے کر جہاز سے اتر آ ہوا۔“

"ہاں ہاں ہی ہر سول تو جمع ہے" اس نے کہا پھر ایک بیک لوجر بدل کر بولی "نہیں نا اب آپ نہیں جانیں گے اس کے پاس میرا نمائندہ بن کر رہتا ہے۔ بس بہت ہو چکا۔ اب میں باور کروں گی خود کو کہ میں علی نواز نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی... نہ میں اسے جانتی ہوں نہ اس سے محبت کرتی ہوں مگر اسے اپنے وعدے کا پابن نہیں تو میں ہی اسے بھلا دینے کی کوشش کروں گی"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے پھر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"غلطی میری تھی کہ میں نے خود کو اس کے قدموں میں گرا لینے کی حماقت کی مجھے سزا ملنی چاہیے" اس کی بھلائی ہوئی آوازوں کے دلی طال کی منظر تھی۔

میلو جی بھڑکایا۔ میں نے پورے لنگ کی کوشش کی مگر میری آواز نہ ساتھ نہ دیا۔

"اگر اس کی جگہ آپ ہوتے" اس نے دھیمے سُروں میں کہا۔

"تو آپ کا لڑ بھل یہ نہ ہوتا آپ ایک نابھو اور بے وقوف لڑکی کو بول کر نشانہ بنا دیتے بلکہ آپ نے اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا ذرہ نہ روا رکھا ہوتا۔ آپ نے اس کی محبت کا جواب محبت اور غم سے دیا ہوتا۔ آپ اسے بیوقوف نہ سمجھتے کہ اس کے ساتھ نہ جاننا اور

لڑنا سب سے کاروبار اختیار کرتے۔ آپ اس بھڑکی ہوئی لڑکی کو پورے پورے سمیٹ لیتے اور اپنے مطلق واقفوں سے آپ نے اس کے کسی دل پر اپنی محبت کے ٹھنڈے پھاٹے رکھے ہوتے۔ خرابا! کتنا فرق چلنا لڑ

کیں اور آپ میں! کاش! وہ بھی آپ جیسا ہوتا یا پھر۔ آپ آپ نہ ہوتے علی نواز ہوتے"

"اوہ! یہ کیا کہہ گئی تھی وہ! میں مضطرب ہو کر رہی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں"

"کچھ تو ہے" اس کے لہجے میں اصرار کی کیفیت تھی۔

"کچھ نہیں"

"بلیز بتائیں نا۔ اس نے ایک بیک میرا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔

میرے رگ پہلے میں برق سی لپک گئی۔

"بتائیے نا کیا بات ہے؟ آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں"

"مشک اور عشق بھی بھلا کچھ نہیں سمجھیں" میری زبان سے یہ ساختہ نکلا۔

"میں سمجھتی نہیں"

کرائی۔

"میں بھلائے دیتا ہوں تمہیں" میں نے کہا اور میں... میں جو الفت سے غصے سے قبل محبت ذات سے پہلے سناٹا رہنے والا ایک ڈنڈو کو سا آدی ہوا کرتا تھا لگتا کہ ایک سر فرسٹ کلاس کلاب دھار گیا: "شرفاقت" میں نے ہدایت سے مہم کے میں کہا: "میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں"

وہ تھوڑی دیر چھپ رہی پھر اس نے کہا: "مجھ آپ کی سنی خیر آراہی اخیر معمولی شہیدگی اور دنی رنی سر آہوں سے تھوڑا تھوڑا اندازہ تو ہو چلا تھا"

"کیا تم یقین کرو گی کہ میں تمہاری محبت میں کم و بیش ویسے ہی گزارنا ہو چکا ہوں جیسے کہ تم علی نواز کی محبت میں گزارنا ہو کر اس کے پاس جا رہی تھی۔ تمہاری خوش قسمتی کہ جب تم نے اس سے محبت کی تو وہ کسی اور کی محبت کا اسیر نہ تھا جب کہ میری بد قسمتی یہ ہے کہ میرا دل اس وقت تمہاری محبت میں گرفتار ہو رہا ہے جب تک کہ

دل کسی اور کے لیے تڑپ رہا ہے"

"تہ... ہاں آپ کسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھ آپ سے ایسی باتوں کی امید تھی۔ آپ تو بہت شریف سے آدمی ہو گئے تھے۔

"محبت بھلائے خود ایک حوصلہ ہے"

اس نے سر جھکایا۔ اس نے اپنے اُمیں ہاتھ کی اُمیں مضطربانہ چٹختے ہوئے بولا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ لوگ آپ جیسی

بلانکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اس تیزی سے کیا آپ ہو جاتی ہے بعض لوگوں کی"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں خود اپنی کاپی آپ پر حیران ہوں"

"آپ کھڑے کھولیں ہیں؟" "تو نہیں میرا اندر دل اضطراب ہے بیٹھے کی اجازت نہیں ہے

رہا زبان کھل گئی ہے تو مجھے دل کی بات کہہ لینے دو۔ میں نے لمحہ بھر کو توقف کرنے کے بعد کہا: "میں اب زیادہ دریا ہاں نہیں آؤں گا اور آج کے بعد تم دوبارہ کسی میری صورت دیکھو گی بھی نہیں دیکھے جو کہنا ہے کہوں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔ دیکھو الفت تم شاید کسی نہ

جان پائیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس لڑکے کو اپنے نہاں فضا دل میں پھنسا رکھتا اور کسی کسی کو کچھ نہ بتا آئیکہ... قصور تھا لہجے

تم نے مجھے زبان کھول دینے پر مجبور کر دیا تم نے علی نواز سے سزا قابل کرنے ہوئے میری بات اپنے دل ہدایت کا اظہار کر کے مجھے دل

کی بات کہہ دینے کا سلیا ہے۔ سب میں برطانیہ امتزاج کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم مجھے سے خالوں میں بننے والی وہ دو چیز ہو جس کی خوشنودی کی خاطر میں اپنی جان تک قربان کر دینے کا حوصلہ

کھینچتا ہوں"

106

”نہیں نہیں مجھے جانی نہیں ہلچلے“

”تم میرا خلاق اڑانے کی کوشش کر رہی ہو“ میں نے بڑا سنا سے ہوئے کہا۔ کاش تم میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکتیں۔ کاش باتم اندازہ کر سکتیں کہ میں تم سے کس قدر بے لوث محبت کرتا ہوں، میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، الفت اور اسی خاطر میں علی نواز کے پاس تمہارا قاعدہ رکھی گیا مگر افسوس کہ میں تمہارے کام ناسکا۔ علی نواز کے نہ آنے کا بتنا دکھ تھیں ہوا بیٹا اس سے کہیں زیادہ دکھ مجھے ہے کیوں کہ میں تو اسے تمہارے حضور پیش کر کے سرخروئی حاصل کرنا چاہتا تھا مگر میری بد قسمتی کہ اپنے تمام تر غلوں میں نیت کے باوجود میں سرخروز ہوسکا اور میری محبت تمہارے درد کا علاج نہ ہو سکی۔“

”بان ہاں بولیے۔ میں سن رہی ہوں۔ الفت نے میرے خاموش ہو جانے پر کہا۔

”اگر علی نواز آگیا ہوتا تو میں بڑے زلیخا زبانی نہ کھولتا اور تم سے اپنی محبت کو فقط اپنے سینے ہی میں بسا دے رہتا۔ مگر علی نواز کی دودھ فراموشی پر تمہاری تڑپ نہ مجھے میسر ہو کر دیا کہ میں اپنا دل کھول کر تجھے سامنے دکھا دلا اور تمہیں بتا دوں کہ اگر تم کسی جفا جھوٹے محبت کرتی ہو تو کوئی وفا پیشہ تم سے بھی کتنی محبت کرتا ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ علی نواز کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ خوش قسمت ہے کہ تمہارے دل میں بسا ہے۔ میرا خیال تو شاید کبھی تمہارے دل کے نزدیک جھٹکنا ہی نہ سکے گا، مگر اس تلخ حقیقت کا ادراک رکھنے کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں کیوں کہ محبت کے بارے میں میرا مکتب فکر یہ ہے کہ محبت ہمیشہ نتیجہ ہوا کر رہی تو سر بلند نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اسے ٹھنڈے ہونے کے لئے زہر اب بھی پینا پڑتا ہے۔ مجھ میں زہر اب پینے کا حوصلہ ہے میں جانتا ہوں کہ میں کبھی ہی تمہارے دل میں جگہ نہ پاسکوں گا۔ مگر یہ سچ ہے الفت کہ میری بقیہ زندگی اس محبت کے سہارے بسر ہوگی جو میں تمہاری بابت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں علی نواز سے تمہاری محبت کے بیچ مائل ہونے کا رتق بھر بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ مگر تم سے محبت کیسے بنا بھی نہیں رہ سکتا۔“ جذبات کی شدت سے میری آواز لفظ بہ لفظ بوجھل تر ہوتی چلی گئی۔

فتنہ کچھ دیر سر جھٹکے خاموش رہی پھر اس نے ایک گہری سانس کھینچے ہوئے کہا: ”آئیے آرا کچھ دیر جیل قادی کیجئے ہیں“ میں چپ چاپ اس کے ساتھ بولیا۔

چند قدم خاموشی سے چلنے کے بعد وہ بولی: ”میری بھورکی ہے مونس صاحب کہ وہ بے وفا اگر مجھے بھلا کر مجھ سے دامن پھڑانا نہیں چاہے گا تو میں اسے بھلا نہ سکوں گی۔ عورت اور مرد میں شاید یہی بظاہر فرق ہے کہ محبت پریم دیوانی ہوتی ہے مرد بے وفا اور ہرجائی... ہر حال اگر وہ مجھ سے دامن پھڑانا چاہتا ہے تو میں بھی اس کی یادوں کو

ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں دامن کر کے اسے بھول جانے کی کوشش کروں گی“ اس نے توقف کیا پھر بولی: ”میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ مونس صاحب کہ یوں ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بے وفائے نے اس کی خیر نہیں کر میں غشی سے ایسی بے اداسان ہوئی کہ شوخی اور ترجمہ میں نہ جانے کیا کیا جتنی اور آپ سے ملانے کی کوشش کرتی رہی.... مجھے معاف کر لیجیو۔ اب مجھے اپنے اس شروع رقیبے پر جو میں نے آپ کے ساتھ مدار کاہا واقعی شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”شرمندہ آہ میں ہو رہا ہوں اس خیال سے کہ تمہارے دکھ کا علاج کرنے کے بھلائی ہمارا دل لے بیٹھا... شرمندگی کا احساس اتنا گہرا ہے کہ آج کے بعد میں تمہیں اپنی صورت دکھانے کا ارادہ نہیں رکھتا میں نے اپنے دل کی بات کہ تو وہی ہے مگر اب مجھے خیالت ہو رہی ہے میں بجا رہا ہوں اور آئندہ تمہیں اپنا خود غرض چہرہ نہیں دکھاؤں گا۔“

”ٹھہرے پہلے آپ میری بات نہیں؟“ الفت کی آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ ”میرا دشوار اس کتنا ہے کہ آپ انتظار کر سکتے ہیں.... کر سکتے ہیں نا؟“

”انتظار؟ کس بات کا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس انتظار کروانا چاہتی ہو تم مجھ سے؟“

”مجھ سے بھلا نے کے لیے کچھ وقت دیکھا ہوگا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو محبت روشن تھی وہ ماند پڑنا شروع ہو گئی ہے اور اسے ختم ہو بھی جاتا چاہیے کیوں کہ اس نے عہد شکنی کی ہے مجھے دھوکا دیا ہے، آزار پہنچایا ہے میں اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔ اب مجھے اس سے نفرت ہو چکی ہے۔ ہاں میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں کیونکہ اس نے ایک عہد کو پامال کر ڈالا۔ ایک محبت بھرے دل کو اپنے قدموں تلے بے دردی سے روند ڈالا۔“ وہ تھمی پھر بولی: ”جب میں آپ کا اس سے مقابلہ کرتی ہوں تو آپ مجھے بہت ارفع اور متمم محسوس ہوتے ہیں۔ اس نے مجھ آزار پہنچایا جب کہ آپ نے میرے زخموں پر مرہم لگا دیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو رہا ہے کہ کیوں اس کے وعدے کا اعتبار کر بیٹھی، کیوں اس سے چاہت کی جھیک مانی، حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ تو بندہ کر لیا تھا مگر اسے مجھ سے محبت نہ تھی! اس نے مجھ کو ٹنڈے بھی کبھی یہ نہ کہا کہ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ آپ میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔“

کہ اسے مجھ سے نہ تو محبت تھی ناس نے اس کا اظہار کیا جب کہ آپ نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا ہے... میں آپ کی محبت کا جواب محبت ہی سے دوں گی مگر اس کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔ اس کی آواز جو لفظ بہ لفظ بوجھل اور دھیمی ہوتی چلی گئی تھی، ایک ایک آنسووں اور دلی دلی سسکیوں میں ڈوب گئی۔

”پہلے رومت، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

وہ کچھ دیکھ سیکھنے کے بعد چُپ ہو گئی۔ مجھ اس پر تڑپ اُڑا تھا۔  
گانش! میں اس حد تک کی یاد کو فوری اس کے دل سے گھر سکتا۔  
یا پھر اس کے سامنے لاکھ کر سکتا!

کچھ دیر بعد اس نے لڑائی ہوئی دہی آواز میں کہا: مونس صاحب! آپ میرے بارے میں ہر گمان نہ ہونے دے گا۔ یہ نہ سوچیے گا کہ میں غیر مستقل مزاج لڑکی ہوں یا موقع دیکھ کر بے تڑپا بلتی ہوں۔ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی نہ خیال کیجیے گا کہ میں علی نواز کو آسانی سے بھلا سکوں گی۔ پہلے تک اس کی حد تک مونس نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے اور مجھ اس سے نفرت ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے لیے میرے دل میں جو محبت تھی اسے فوری اور آسانی سے مٹانا میرے لیے ممکن نہیں۔ ممکن ہو بھی کیونکر سکتا ہے! پورے ایک برس میں اپنے دل میں اس کے نام کی شمع روشن کیے اس کی راہ تھی رہی اور تسمیہ کہتی ہوں کہ اس ایک درس کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی میں نے اپنے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں آنے دی۔ مگر وہ بے ایمانی کر گیا اس نے میرے محبت بھرے دل کو روند ڈالا۔ اب مجھے اپنی فطرتی احساس ہو رہا ہے کہ وہ محبت اور بھروسہ کیا ہے جانے کے لائق تھا ہی نہیں پھر مال اب... اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر بھیگی ہوئی آواز اور دل گیر لہجے میں بولی: اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والا وقت مجھ پر یہ عقدہ کھولے کہ اس سے میری محبت فقط خود بخود ہی تھی دادی جان کے جبر اور سختی سے نجات حاصل کرنے کی ایک امتحانہ کوشش تھی۔ ہو سکتا ہے مستقبل مجھے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے کہ مجھے علی نواز سے نہیں بلکہ کسی ہمدرد اور مہربان مرد سے محبت کرنی چاہیے تھی۔ آپ کو اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب میں پورے خلوص نیت سے آپ کی محبت کا جواب دے سکوں لیکن آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ وقت کے ساتھ مجھ سے آپ کی محبت ٹھٹھے گی نہیں۔ مونس صاحب! میں محبت اور توجہ کو تڑپ ہوئی لڑکی ہوں۔ اگر آپ نے مجھے یہ یقین دلایا کہ آپ ہمیشہ اسی طرح مجھ سے محبت کرتے رہیں گے تو میں سمیلا قرار کرتی ہوں کہ پورے خلوص کے ساتھ آپ سے محبت کرے اور تا عمر آپ کی شکر گزار رہنے کی کوشش کروں گی۔

”اوہ! الفت! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کستا ہوں کہ ساری زندگی تم سے اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔“ میں نے جذبات سے معمولی لہجے میں کہا۔

”شکریہ۔ بہت شکریہ... بس اب اس موضوع پر کام نہ لیں۔ وقت تک مزہ۔۔۔ بات نہ کریں گے جب تک میں اس کے خیال کو اپنے دل سے مکمل طور پر محو نہیں کر دیتی میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ آپ کا ہاتھ تھاموں گی۔“ وہ تھمی پھر بولی: بس اب ابھی ابھی بائیں کیجیے کیوں کہ اب آپ بھی خوش ہیں اور میں بھی خوش ہوں۔

مونس کا ہنسی بھرا ہوا تھا کہ وہ طویل تھی۔  
محبت میں اس کی ناکامی کے لمحے میں میں اس کا شکر کرتی تھی  
تھا شکر بہانہ مجھ ایک ناقابل بیان عمر خانی کا احساس ہوا تھا۔  
پھر کچھ دیر بعد ہوا اور اس کی باتیں کرتے اور پختے ہنساتے رہے  
وہ جب ہنسی تھی اس کی ہنسی کو آتی ہوئی محسوس ہوتی۔  
اس رات ہم نے سر جوڑ کر مستقبل کے سامنے پہنچائی ہوئی شکل  
میں سمجھائے۔

میں نے اس سے کہا: الفت! میں کوئی امیر آدمی نہیں ہوں  
ممد و وسائل ہیں میرے لیکن میرا وعدہ ہے کہ تمہیں خوش رکھنے  
کے لیے میں اپنی جان بھی تم پر بھروسہ کر بیٹھے سے دریغ نہیں کروں گا  
”وسائل کی تو مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ ہم مکانی کا ایک  
حصہ رائے پر اٹھا کر بڑی فراغت کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ آخر وہ  
مکان میرا ہی ہے۔ دادی جان! یہ چاری تو چراغ سوری ہیں۔“  
”بھئی! مجھے تمہاری دادی جان کے ہاتھ سے وسائل سے  
کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو اپنے باندوں کی قوت پر تمہیں خوش رکھنا  
چاہتا ہوں۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے اور اسے جنت کی طرح  
بھمائیں گے۔“

”دیجیے جناب! ایک بات واضح کر دوں میں آپ پر کہ  
دادی جان کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گی آپ کو گھوٹا دیا  
رہنا ہو گا۔“

”چلو تمہاری خاطر یہ بھی منظور مگر یہ تو بتاؤ کہ دادی جان  
کے حضور میری پہلی ماحتری کب ہوگی؟“  
”بھئی! پہلے تو واہ ہوا کر رہی ہوگی پھر ماحتری کی نوبت آئے گی۔“  
”اور واہ کیونکر کب اور کون ہوا کرے گا؟“  
”یہ سوچنے والی بات ہے۔“

وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئی پھر بولی: دادی جان تک آپ کی  
رسائی کی میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی ترکیب آتی ہے۔  
”وہ کیا؟“

”آپ ہماری انیکسی کے لئے کراہ دار بن جائیں۔ پہلے  
دادی جان بڑھتی شرافت کا سکہ بٹھائیں پھر سکہ نکالیں پھر اپنی ہاتھ  
کر لائیں۔“

”بڑا لمبا اور صبر آزمایا سہ ہو گا۔ تو۔“  
”نہیں ایسا کوئی زیادہ لمبا اور صبر آزمایا نہیں۔ علی نواز کے  
جاننے کے بعد انیکسی میں ایک تنہا خاتون کراہ دار آبی تھیں جو آکر با  
دو ماہ قبل انیکسی چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ انیکسی خالی ہے آپ کو فوری  
قبضہ مل جائے گا۔ دادی جان جو نوجوان مرد کراہ داروں سے انتہائی  
کترایا کرتی تھیں علی نواز کو کراہ دار رکھنے کے بعد ان کی نوجوان مرد

## ارزو اور دعا

ایک ۹۵ سالہ بزرگ نے اپنی ساگرہ منائی تو ایک صاحب نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے اپنی تقریر میں بڑھاپے سے متعلق بہت سے لطیفے بھی شامل کر دیے۔ جوانی تقریر میں بزرگ نے کہا: یہ میری آرزو بھی ہے اور دعا بھی کہ اتنی عمر تک میں ضرور جیوں جتنی عمر کے صاحب کے منائے ہوئے لطیفے ہیں:

”بہت ہو چکی جناب اب چلیں“

میں بادل ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نیم تاریک ساحل سے جگمگاتی روشنوں کی سمت پیش قدمی کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک شخص مخالف سمت سے ہمیں اپنی جانب آنا دکھائی دیا۔ الفت نے میرا ہاتھ چھو کر بازو تھام لیا اور سٹ کر میرے بہت نزدیک ہو گئی نیم تاریکی میں دُور سے آتے ہوئے شخص کے نقش و نگار واضح نہ تھے۔ وہ ہمارے نزدیک پہنچا تو خوشبو کے ایک تیز جھونکے نے میری مشام جاں کو معطر کر دیا۔ ہمارے نزدیک سے گزرتے ہوئے وہ دفعتاً ٹھم گیا اور دو قدم اٹھا کر ہمارے بالکل نزدیک آکھڑا ہوا نیم تاریکی میں اس نے ہمیں اور ہم نپلے سے بغور دیکھنے کی کوشش کی لفظ بھر کو توجہ یوں لکھا جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔

وہ علی نواز تھا!

”آپ آگئے؟“ الفت نے یک بیک میرا بازو چھو کر اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”معاف کرنا بہت دیر ہو گئی۔“ علی نواز کی آواز مجھے دُور بہت دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

پھر میں نے انہیں دیکھا تو انہوں نے بہت تیار ہو کر ایک دوپٹے سے ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ الفت پر ایسی شادی مرگ طاری ہوئی کہ وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”رونے کی بھلا کیا ضرورت۔ بس اب میں آؤں گا ہوں۔“ میں نے علی نواز کو کہتے سنا۔

ہدایات کا رنگ گزرا گیا تو الفت نے علی نواز کی بازوؤں کے حصار سے نکل کر اس کا بازو تھاما اور پھر میری جانب توجہ ہوئی۔

”آپ تو علی سے مل چکے تھے کیا پہچان نہیں؟“ الفت کی آواز جھلنے ہوئے سسے کے مانند مہری سماعت میں اترتی چلی گئی۔

”پہچان لیا ہے۔“ میں نے آسنو پتے ہوئے کہا اور اپنا دایا ہاتھ مصلحت کے لیے علی نواز کی جانب بڑھا دیا۔

کراہ داروں کے ہاوسے میں راستہ ایسی بدلی کہ اب وہ دن رات کسی نوجوان مرد کراہ دار کے نزول کی دعائیں مانگا کرتی ہیں۔ چہل قدمی کی بہت جگہ میں نے ان سے پوچھا کیا بات ہے ہادی جان آپ کسی نوجوان مرد کراہ دار کے آپنے کی دعائیوں مانگنے لگی ہیں تو کتنے لگیں ہو سکتا ہے کسی بہانے سے اسے لیے کوئی اچھا زل جائے۔ اب تیری شادی بھی تو کرنی ہے۔ کب تک میں تجھے اپنے گھٹنے سے لگائے بٹھائے رکھوں گی۔“

”اگر یہ بہت ہے تو میں کل ہی کراہ دار انکسی کی صورت تمہاری دلو کی کے حضور حاضر ہوتا ہوں پھر کراہ داری سے تمہاری امید داری تک ہم داری جان گولے کر ہر روز ساحل پر چہل قدمی کو نکلا کریں گے۔ لوگ ہمیں دیکھا کریں گے اور ہم ایک دوسرے کو... کیوں ٹھیک ہے نا؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔

”کیا سوچنے لگیں؟ میں لے پوچھا۔“

”سورج رہی ہوں کیا یہ وہی شخص ہے جو عورت سے مخالف رہا کرتا تھا؟“

”ہاں یہ وہی شخص ہے اور اسے اتنا حوصلہ دینے والی بھی ایک لڑکی ہی ہے۔“

ہم تادیر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ ساڑھے بلوچے کے لگ بھگ اس نے کہا: ”بہت دیر ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے گھر جانا چاہیے۔“

”جی تو نہیں چاہتا میرا کہ تم جاؤ۔“ میں نے عبور بانہ انداز میں کہا۔

”اچھا؟ وہ دھیرے سے ہنس دی۔“

”تم اندازہ نہیں کر سکتیں الفت کہ میں آج کتنا خوش ہوں۔“

”واقعی؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا: ”میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ قسمت کی دیوی بوجھ بھریوں ہرمان ہو جائے گی میرے خواب تعبیر پالیں گے یقین کر و الفت کہ میں ایک مہر سے تمہاری تلاش میں سرگراں تھا اور آج تمہیں پا کر میرے دل کی حالت عجیب ہوئی جا رہی ہے۔“

”بس جناب زیادہ رو میٹنگ نہ ہوں۔ انہیں اور مجھے میرے گھر تک چھوڑ گئے ہوئے اپنے گھر کا رخ کریں۔ میں نے مینڈ سوئیں لپھے اچھے خواب دیکھیں اور کل انکسی کرائے پر لینے کی درخواست کے ساتھ دادی جہان کا سامنا کریں۔“

”ارے مینڈ کس کیفیت کو آئے گی آج تو توجہ ہو گا۔ کاش! میں تمہیں اپنا سینہ کھلی کر دکھا سکتا کہ میرا دل غمی سے کیسا بے اوسان ہونے جا رہا ہے۔“

"مجھے یقین تھا کہ آپ صرف آئیں گے۔ الفت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر بولی۔" ہلا یہ طنز مونس صاحب کا مرہون منت ہے۔

"بے شک" علی نواز نے تائید کی پھر بولا "مونس صاحب! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

"اچھا یہ بتائیں کل آپ کہاں تھے؟ جہاز سے تو آپ کل کے اترے ہوئے ہیں" الفت نے پوچھا۔

"ماں کی قدم بوسی کو کھتر چلا گیا تھا۔ کل گیا آج لوٹ آیا۔"

"اب تو نہیں جائیں گے؟"

"نہیں بھی جانا تو بڑے گا کیونکہ کل صبح مجھے ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے البتہ کل شام میں تمہاری دادی جان کی قدم بوسی کو کہتا ہوں میری والدہ کے جنہیں میں خاص اسی مقصد سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"وہ میں کہاں؟"

"اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا رہا ہے میں نے انہیں... اور ہاں دیکھو ہفتہ مشورہ ہی رُکے گا میرا جہاز کیوں کہ میں کپتانی سے مزید ایک برس کا معاہدہ کرنے جا رہا ہوں۔ بس ہفتے بھر کے اندازاً شادی کرنی ہے مجھے۔"

میرا دل گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔

"مونس صاحب! شادی میں بھی آپ کو اسی طرح پیش پیش رہنا ہوگا۔" علی نواز نے مجھ سے کہا۔

"کیوں نہیں؟ تو اب میرے لیے بھائی سامان ہو چکے ہیں" الفت جبکی۔

میں دم بخود رہ گیا۔

محبت کے معاملے میں عورت کا ایسا ہے دین ہونا میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ علی نواز کے کہنے سے قبل تو وہ مجھ سے وعدے دے کر چکی تھی۔

"یہ آپ ہمیں اجازت دیں گے؟" علی نواز نے کہا۔

"نہیں" میں نے کہا۔

اس کے سوا میں اور کبھی بھی کیا سکتا تھا!

وہ مجھے بیچ لہ میں چھوڑ کر ایک دوسرے کا بازو تھامے ساحل کے تاریک حصے کی سمت بڑھ گئے اور مجھے یوں لگا جیسے سمندر میری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔

میں سر جھکائے مضمحل اور ناشاد سا سمندر کنارے ایسا وہ فصیل کی جانب بڑھا اور سمندر کا رخ کر کے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دُور سمندر کے پانیوں سے آنے والی جہازوں کی رنگ برنگی ردِ خیموں کو حسرت سے دیکھنے لگا۔

قنادیر ہی گزری ہوگی کہ مجھے اپنے عقب میں الفت کی آواز سنائی دی۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں مونس صاحب! آپ کا لڑکا تو بوجھا ہی نہیں۔"

میں نے بڑی سرعت سے اپنے آنسو پونچھے اور اس کی جانب پلٹے ہوئے بظاہر ہنس کر کہا۔ "کیا کرو گی آنا پھر پھر کر؟"

"بھئی آپ کو شادی کی دعوت جودیتی ہوگی، میں۔" علی بولا۔

میرا اور کار سانس اوپر اور نیچے کانپنے رہ گیا۔

علی نواز نے جیب میں سے ایک جیبی ڈائری اور قلم نکالا اور میرا پتہ لکھنے کو مستعد نظر آنے لگا۔

"جی ہاں" اس نے کہا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنا پتہ لکھنے کو داتا پڑا۔

جب وہ ایک بار پھر مخالف سمت میں پلٹ گئے اور میری نگاہوں کی زد سے نکل گئے تو میں نے شکست خوردہ قدموں سے بس اسٹاپ کا رخ کیا۔



پورے چاند کی روشنی میں شروع ہونے والی اس داستان کا انجام ایسا کر بناک تھا۔ چاندنی راتوں نے مجھے دس لیا تھا۔

ایسی اضطراب انگیز رات میری زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ اس رات میں تنہا اور طول شہر کی سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا رہا۔ مجھے دنیا ادھر گھبر گھبر رہی تھی۔ میرے دل کا اضطراب مجھے آسمان کے ستارے نوحہ لینے پر اکساتا تھا۔ مجھ پر اضطراب اور جنون کی ایک کر بناک کیفیت طاری تھی۔

رات کے پچھلے پہر جب میں اپنی تیا گاہ پر پہنچا تو خود کو نیم جاں محسوس کر رہا تھا۔ بے دم سا ہستہ گرا اور ایسا پڑا کہ کئی روز بخار میں مبتلا گردو ہمیش سے بے خیر رہا۔ مالک مکان خوابانی نہ ہونے تو شاید کوئی مہرے منہ میں پانی کے دو قطرے ٹپکنے والا بھی نہ ہوتا۔ خوابانی نے گھر پر ڈاکر کو بلا کر مجھے دکھایا۔ میری بیماری داری کی اور دوا دارو کا خیال رکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ خوابانی نے میری حالت کی اطلاع میرے دفتر میں بھی دی۔

کئی روز تک بے سندھ پڑے رہنے کے بعد جب قد سے ہوش آیا تو مجھے خوابانی نے بتایا کہ کوئی علی نواز نامی میرے دوست میری ملاقات کے تیسرے دن مجھ اپنی شادی میں شرکت کا بلوا دینے آئے تھے مگر میری ملاقات پر افسوس کرتے واپس چلے گئے تھے۔ خوابانی کی زبانی یہ بات سن کر میری آنکھیں بھیگ گئیں اور مجھ اپنی آنکھوں میں آنکھانے والی تابی لہر کو خوابانی کی نگاہوں سے چھپا لینے کی خاطر آنکھیں موند لینا پڑیں۔

کیونکہ میں خوابانی کو کہ علی نواز میرا دوست نہیں دیکھی

خوشیوں کا قائل، میرا قیسم بد و سیاہ، میری علالت کا وقت دار تھا۔ تیز بخار نے ٹائیفائیڈ کی جون لے لی، خوابانی نہ تھی تو کوئی مجھے پرچھنے والا نہ تھا، میری اس علالت کے دوران انھوں نے میرا ملان کی طرح خیال رکھا۔

اپنی اس طویل علالت کے دوران ایک روز مجھے سرورین ٹاک سے ایک خط موصول ہوا جب خوابانی نے ڈیکے سے خط وصول کرنے کے بعد خط مجھے دیتے ہوئے کہا: "یہ تمہارا خط آیا ہے۔"

میں نے کہا: "دفتر سے آیا ہوگا۔"

"نہیں باہر سے آیا ہے۔"

'باہر کون ہے؟' اور جو مجھے خط لکھے گا: میں نے خوابانی سے لفاظی لیتے ہوئے سوچا اور کہنیوں کے سہارے بستروں پر اٹھ بیٹھا۔ ایسی کمزوری ہو گئی تھی کہ لہنے سہارے اٹھ بیٹھنا بھی مجھے محال معلوم ہونے لگا تھا۔

لفظی ہر لفظ میرا نام اور پتا تھا۔ مکتوب نگار نے لفاظی پر تمکے کیجے کہیں بھی پانا تا پتا نہ لکھا تھا۔ لفاظی چاک کر کے میں نے خط نکالا اور مندرجات ہر نظر سے دوڑانا شروع کیں۔

لکھا تھا۔

میں صاحب!

آداب!

میں نے آپ کو کبھی کبھی بستر ہوگی میں یہ خط آپ کو دیتی سے لکھی ہوں۔ یہ پہلی پوسٹ ہے جہاں ملی کا جنازہ رکا ہے۔ دو تین روز یہاں رک کر آگے بڑھ جائے گا۔ ملی اس وقت شہر میں اپنے کسی شام سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ کہ رہے تھے شام کو مجھے گھمانے پھرانے کے لیے لے جائیں گے میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ شام کو جب باہر نکلیں گے تو میں آپ کو خط پوسٹ کرنے کی کوشش کروں گی۔

میری انتہائی خواہش تھی کہ آپ میری اور ملی کی شادی میں شریک ہوتے مگر السوس کہ آپ طویل ہو گئے تھائی شادی ایسی جھلت میں ہوئی کہ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ہوا۔ ایک روز ملی اپنی والدہ کے ہمراہ دادکدھان سے ملنے آئے اور دو روز بعد ہم ایک اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے پھر ایک دن میں ملی نے میرا پاسپورٹ بنایا۔ جلدی جلدی سفری دستاویز تیار کروائیں اور مجھے ساتھ لے کر سفر پر نکل کھڑے ہوئے ملی کے ساتھ میں بہت خوش ہوں۔ زندگی ایک

حسین پنا محسوس ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی داری جہاں بڑی طرح یا فانی لگتی ہیں۔ انھیں رابعہ کے سہارے پھونٹائی ہوں۔ آپ کو کبھی فرصت ملے تو ملی کے دوست بن کر ان سے ملنے چلے جایا کریں۔

میرے اور ملی کے ملن میں آپ نے جو کردار ادا کیا اس کی قدر ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔ ملی اب بر ملا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر انھیں آپ کے تورو سے میری جانب سے یہ ہینام نہ ملتا تو انہیں آپ کے تورو سے بھرنے تو وہ اس خیال سے مجھ سے ملنے میں تردد کرتے کہ ہو سکتا ہے میں ان کے خیال کو اپنے دل سے غور کر کے کسی اور جانب راغب ہو چکی ہوں۔

میں آپ کی جہ دل سے شکر گزار ہوں مگر کچھ شکر سنا بھی کہ میں نے آپ کو نہیں دھوکا دیا اور خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ملی کو تو کبھی بھول سکتی تھی ننان سے نفرت کر سکتی تھی۔ وہ تو میرے لیے جہاں جہاں ہیں۔ مجھے معاف کر دیں مونس صاحب کہ رنج و صدمے کی شدت میں میں آپ سے ایسی بات کہہ بیٹھی جو اب مجھے انتہائی احمق محسوس ہوتی ہے۔ بے شک مجھے آپ سے محبت ہے مگر ایسی محبت نہیں جیسی ملی سے ہے بلکہ آپ کے لیے میں ہمدردانہ جذبات رکھتی ہوں۔ مجھے میری اس خط پر معاف کر دیجیے گا مجھانہ ہے کہ آپ کو دکھ پہنچا ہوگا میں نے آپ کے ساتھ کچھ خود غرضانہ رویہ روا رکھا۔ لیکن مجھے یہ یقین بھی ہے کہ جو لوگ محبت کرنا جانتے ہیں وہ زخم کھانے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور معاف کر دینے کا حوصلہ بھی اور آپ چونکہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے یقیناً مجھے معاف کر دیں گے۔

آپ نے جس شدت سے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا وہ ہمیشہ میرے ذہن کے ایوانوں میں مسکتی رہے گی۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی کہ آپ نے میرے گھائل دل پر اپنی پختلوص محبت کے پھلے دھر کر مجھے ڈوبنے سے بچانے کی بے لوث کوشش کی تھی۔ مجھ اس وقت ذہنی سہارا جب میں ریزہ ریزہ بکھرنے کو تھی۔ اگر آپ میری سہو کو درگزر کر دیں تو میں تازہ نگاری آپ کی احسان مند رہوں گی۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ تازہ نگاری آپ کے خیال کو اپنے دل میں

بسلنے رہوں گی اور کبھی آپ کی یاد سے فکری کی  
مرنگب نہ ہوں گی کیوں کہ میں نے جہاں لیا ہے کہ  
دل میں بسی محبتوں سے فکری کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا  
دیکھیے نا جب علی ودرے کے مطابق مجھ سے ملنے نہ  
آئے تو میں نے خود کو دھوکا دینے کی کوشش کی کہ  
میں ان سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ مگر جب وہ میرے  
سامنے آئے تو میرے دل کے لیے اختیار ان کے لیے  
اپنا ڈر واکر دیا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ میرا دل تو اول و  
آخر علی کا تھا اور کسی قیمت پر بھی کسی اور کا ہو ہی نہیں  
سکتا تھا!

مولنس صاحب! اس سفر سے واپسی پر میں علی کے  
ساتھ آپ سے ملنے آؤں گی۔ ہم پھر ملیں گے، طبع گئے! نا  
اور ابھی اس ملاقات میں نہ میں آپ سے معافی مانگوں  
گی نہ آپ کوئی کلمہ شکوہ کریں گے کیوں کہ یہ خط آپ کو  
ارسال کرنے کے بعد میں اپنی راتست میں یہ یاد رکھ  
لوں گی کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔  
ایک دوستانہ مشورہ آپ کو دینا چاہتی ہوں...  
کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کریں جو آپ کی بے لوث  
محبت کی واقعی ماہل ہو اور گھر بسالیں۔ امید ہے کہ  
آپ میری برادری یعنی عورت ذات سے خائف  
ہونا ترک کر چکے ہوں گے کیوں کہ بارش کا پہلا بھینٹا  
تو بہر حال پڑ ہی چکا ہے آپ کے دل پر!  
آخر میں پھر وہی التجا کہ مجھے معاف کر دیجیے گا  
اور اپنے دل سے میری محبت کو محو نہ ہونے دیجیے گا!  
آپ ہمیشہ میرے دل میں اور میری دعاؤں  
میں رہیں گے۔

اجازت!  
الفت!

میں نے اس خط کو ایک بار نہیں دو بار نہیں باہر پڑھا میری  
آنکھوں میں آنسو اُڑتے رہے۔ بالآخر الفت کا خط تھا جسے تمہارے  
مجھے ہاتھ پکپکانے لگے اس کا خط میرے ہاتھوں سے گر پڑا اور میں  
نے اپنا چہرہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے چھپا لیا۔  
طویل بیماری بلکہ اسے دکھ کہنا زیادہ مناسب ہو گا جھینٹنے  
کے بعد جب میں بستے سے اٹھا تو خوابانی نے میری صحتیابی پر اپنی  
سمرت کا اظہار میرے کمرے کی صفائی ستھرائی اور از سر نو تزئین و  
آرائش کروا کے کیا۔

"مولنس! خوابانی نے کہا: تمہاری بیماری کے دوران تمہارے

کمرے میں عڑی کے چالے میری توجہ کا مرکز بنے رہے۔ میں نے  
سورج دکھا تھا کہ تمہارے بستے اُٹھے ہی سامنے چالے صاف کر دیے  
دوں گی۔ دیکھو میں نے سامنے چالے صاف کر دیا ہے ہیں۔ کتنی  
صاف ستھرا ہو گیا ہے تمہارا کمرہ بھی میری مالو تو تم اب شادی کرنا  
ایکے آدمی کی کوئی زندگی نہیں۔ کوئی دکھ نہ کھانا بھی ضرور ہونا چاہیے  
میں نے خوابانی کی جانب دیکھا۔ باوجودیکہ وہ درمیانی عمر  
کی ایک تندرست و توانا عورت تھی نہ چالے کیوں وہ مجھے یورپی نظر آتی  
اس کا چہرہ مجھے پتھر یوں بھرا اور آنکھیں زندگی کی دمک سے محروم ہو کر  
ہوئیں۔ ایک بیک مجھے اپنا تو آراستہ گلہ میں حدیوں پرانا عکس  
ہونے لگا۔ کمرے کے در و دیوار مجھے بے در و دیوار بے رنگ و رنگ  
دکھائی دینے لگے۔ کمرے کی ہر شے مجھے دھندلائی ہوئی نظر آنے  
لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں میرے سارے کمرے میں چالے  
تان دیے ہوں اور ان چالوں نے میری راہ دکھ لی ہو۔ میں نے اپنے  
کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو نہ چالے کیوں خوابانی کے مکان کے  
رو برو ایسادہ وہ بلند بالا مکان جو کل تک مجھے بہت خوب صورت  
لگا کرتا تھا شکستہ و خمیدہ دکھائی دیا۔ شاید سورج جلدی ٹھپ گیا تھا اور  
ہر شے تاریکی کی زد میں آچکی تھی یا پھر میری دل گرفتگی نے مجھے پندرہ  
برس آگے لے جا کر دفعتاً بوڑھا، مضمحل، دل شکستہ اور ایک مرتبہ پھر  
اسی قدر تنہا کر دیا تھا جتنا میں الفت سے ملنے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔  
میرا چاندنی رائیس گھوٹاری کی میں ڈوب چکی ہیں۔ میں بہت  
تنہا، دل گرفتہ اور اُداس ہوں۔ میرے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی ہے۔  
ہر شے دھندلا سی گئی ہے۔ میرے دل پر چالے سے تن گئے ہیں مگر...  
مجھے الفت سے کوئی کلمہ کوئی شکایت نہیں۔ میری دماغ ہے کہ وہ چال  
بھی رہے خوش رہے۔ سدا ہنستی مسکراتی، شادا اور باد رہے اس کے دل  
پر میرے دل کی طرح کبھی کوئی حالانہ تن پائے! اسے کبھی کوئی دکھ نہ  
ملے! اس کا ہر ہمیشہ روشن اور تاباں رہے۔ خدا اس کو اس کا خیر کی جزا  
دے کہ اس نے تنہائی کا زہا ہوتے ہوئے مجھ سے تنہا شخص کی بے آبرو  
زندگی میں اپنے دو میٹھے بولوں اپنی دل کش مسکرتوں کا ہر تھول  
دینے کی نیکی کی۔

خوشی کا تو ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری ہو کر تباہ ہے۔  
سورج کی ایک کرن سُنٹی میں دبا کر تو گھٹنگھوڑا اندھیادوں کا  
مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔  
تو پھر الفت کی عطا کردہ خوشی کے سہارے میں اپنی باقی  
زندگی کیوں نہیں گزار سکتا کہیں کہ یہی ایک خوشی تو میرے لیے حاصل  
زیست ہے!





میں اسے شہزادی کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ نام میرا دیا ہوا تھا اور نہ نام تو کچھ اور ہو گا جو اب مجھے بھی یاد نہیں۔

میرا تعلق پیشہ ور بھکاری خاندان سے ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ پنجاب کے ایک بڑے شہر میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہماری جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمارے ہی پیشے کے کئی اور خاندان بھی آباد تھے۔ چاہا فسٹلو 'جیرا' بدھوا 'خیر' اور ایسے کئی دوسرے لوگ مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان

میری ماں نے میرا نام عیدو رکھا تھا، شاید اس لیے کہ میں عید کے دن پیدا ہوا تھا۔ میرے باپ کو سب شہزادی کہتے تھے، میری ماں نذیرین کہلاتی تھی۔ بس یہ تھا میرا خاندان! اس کے علاوہ میری ایک خالہ بھی تھی جو پیدائشی اندھی تھی۔ اس کے چہرے پر چچک کے بڑے بڑے نشانات تھے۔ اس کی آنکھوں کے بنے نور گڑھے اور پونوں پر پھیلا ہوا کچھ مجھے اب بھی یاد آتا ہے تو متلی ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کی بیٹی سے میری بڑی دوستی تھی۔

## خاندان





نہیں تھی۔ ماں کہیں اور باغی میں کہیں اور جاتا۔ شزاوی کی عمر ۸ سال کی تھی۔ مجھے اپنے کام سے فرصت ملتی تو میں یہ وقت شزاوی ہی کے پاس گزارتا۔ میری عادتیں اس بہستی کے دوسرے بچوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان بچوں سے میری دوستی بھی نہیں تھی۔ شزاوی مجھ سے چھوٹی تھی لیکن وہ میری گہری دوست تھی۔ وہ اپنی توہلی زبان میں مجھے عید و کھتی تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ ہم دونوں کھیلتے ہوئے ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ دور تک نکل جاتے۔ ریل کی پٹری پر لوہے کا ٹکڑا رکھ کر ریل کے آگے کا انتقال کرتے۔ ریل آتی اور جب وہ ٹکڑا چپک کر چپٹا ہو جاتا تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔

”شزاوی! تو میرے ساتھ کراچی چلے گی؟“ میں اس سے پوچھتا۔

”کراچی کیا ہوتا ہے؟“

”بگنی! وہ بہت بڑا شہر ہے؟“

”اتنا بڑا“ وہ ہاتھوں کو پھیلا کر کہتی۔

”اور نہیں تو کیا“ میں اس سے کہتا۔ ”میرا ابا پچھلی عید پر بھیک مانگنے کراچی گیا تھا۔ اتنے سارے ٹوٹ لایا تھا۔ وہ ماں کو بتا رہا تھا کراچی میں سمندر بھی ہے۔“

”سمندر! وہ کیا ہوتا ہے؟“ ننھی شزاوی پوچھتی۔

”جل جل! تجھے تو کچھ بھی پتا نہیں۔ دیکھنا میں تو کراچی جاؤں گا۔“ ہم تقریباً روزانہ یہی باتیں کرتے، گھومتے پھرتے، کھیلتے گھروٹ آتے۔

ایک روز حسب معمول میں اسے کام پر جانے کے لیے تیار ہوا۔ تیار ہونے سے مراد یہ ہے کہ لینیں اتار کر ایک میٹلی سی بنیان پس لی۔ چپل اتار کر ایک طرف رکھ دے اور بنگے پاؤں اس مخصوص علاقے کی طرف چل دیا جہاں میری ڈیوٹی تھی یعنی جہاں مجھے بھیک مانگنی تھی۔ یہ علاقہ پہلے ابا کا تھا لیکن اب اس نے یہ مجھے دے دیا تھا اور خود زیادہ کمائی والے علاقے کی طرف چل دیا تھا بلکہ چل گیا دیا تھا، وہ جگہ اس نے خرید لی تھی۔ شاید میں نے آپ کو اب تک یہ نہیں بتایا کہ فقیروں کی دنیا میں بھیک مانگنے کی جگہیں باقاعدہ فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے لیے فقیروں ہی میں ایک ٹھیکیدار ہوتا ہے، جو یہ کاروبار کرتا ہے۔ ایک فقیر کے علاقے میں دوسرا فقیر نہیں آسکتا، اگر آتا ہے تو باقاعدہ جگڑے کی نوبت آجاتی ہے۔

میں ابھی اپنے علاقے سے کچھ دور تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میری ماں جو کچھ دیر پہلے گھر سے آئی تھی، وہ آدمیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کی چپٹہ میری طرف تھی۔ یہ ظاہر اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا لیکن وہ بھیک نہیں مانگ رہی تھی، یہ تو علاقہ بھی اس کا نہیں تھا اور پھر بھیک مانگتے وقت تو وہ اندھ ہی بن جاتی تھی مگر اس وقت تو وہ ابھی خاصی نظر آ رہی تھی، باتیں

کئی لوگ بندر اور بھالو بچا کر بھی اپنی روزی پیدا کرتے تھے لیکن میرا باپ انہیں اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا، اس کے نزدیک یہ لوگ بھکاری کھلانے کے مستحق نہیں تھے، غیر ہنرمند تھے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا ”کسی کی جیب سے پیسے نکلوانا اتنا آسان نہیں۔ جس کو یہ ہنر نہیں آتا، سالانہ کیا فقیر بنے گا۔ یہ ہنر بڑی سخت سے اور ریاضت سے آتا ہے۔ جو لوگ یہ محنت نہیں کر سکتے، بندر اور بھالو نہیں بچائیں گے تو اور کیا کریں گے۔ کام چور کہیں گے۔“

میری عمر چھ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنی ماں نذرین بھکاریوں کی اتلی تمام کرچہ کھانے کے لیے بازاروں، گلیوں، گلیوں کا رخ کرنے لگا تھا۔ کہنے کی تو میری عمر نہیں تھی لیکن سوچنا ضرور تھا کہ ماں گھر میں تو ٹھیک ٹھاک رہتی ہے مگر سڑک پر آکر اندھ ہی بن جاتی ہے۔ دراصل وہ اندھ ہی نہیں تھی، ذہن تک رجھاتی تھی۔ جس طرح میرا باپ ٹکڑا نہیں تھا لیکن ٹکڑا تھا۔ میں بھی اپنی ماں کے اس جموٹ میں شریک ہو کر صدمہ لگاتا تھا۔ ”اندھے بھکاریوں پر رحم کھاؤ، اندھے بھکاریوں کی مدد کرو۔“ میں جب اپنے ننھے سنے ہاتھ کا مشکول بنا کر کسی سفید پوش کا راستہ روکتا تو بہت کم ایسا ہوتا کہ مجھے پیسے کے بجائے جھڑکی ملتی۔ شاید پیرہ اس وقت بھی میرے نصیب میں دو سروں سے زیادہ تھا۔ شام کو جب ہم ماں بیٹے کمانی کر کے گھر لوٹتے تو میری ماں کی قمیص میں گلی بھٹی جیب ریز گاری اور چھوٹے نوٹوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ دوسری عورتیں دھک اور حسد سے میری ماں سے کہتی تھیں۔ ”نذرین! تیرا منڈا بڑا بھاگو ان ہے، جاو ہے اس کے سوال میں جاو۔“

میرے کھائے ہوئے یہ پیسے زیادہ دیر تک میری ماں کے پاس نہ رہنے پاتے تھے۔ روز میں یہ تماشا دیکھتا تھا کہ چراغ جلتے ہی میری ماں کے میل سے بھرے بال میرے باپ کے منہ لٹا ہاتھوں میں ہوتے۔ میری ماں غلیظہ گالیوں سے کچھ دیر اس کی تواضع کرتی، اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی اور بالآخر وہ سارے پیسے میرے باپ کے ہاتھ لگ جاتے۔ میرے باپ کو جوئے کی لت اور شراب کی عادت تھی۔ میرے باپ میں ہی کیا، اس بہستی کے تقریباً ہر مرد کے لچھن یہی تھے۔ عورتوں کی کمانی پر ہمیشہ اڑانا بھی فقیروں کی اس دنیا کا عام دستور تھا۔ رات گئے جب میرا باپ نشے میں ڈون کوئی قلمی دھن کھگلتا، جگلی میں داخل ہوتا تو ایک مرتبہ پھر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ماں اس سے بہت لڑتی تھی مگر یہ لڑائی رات بھر کی رسرسل سے زیادہ مشیت نہ رکھتی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم ماں بیٹے اس طرح کاروبار پر روانہ ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور پھر چراغ جلتے ہی تماشا وی ہنگامہ، وی ہوا، وی نشہ!

پیسہ کھاتے، سڑکیں تاپتے کئی برس گزر گئے۔ اب میری عمر دس برس کی ہو گئی تھی۔ اب ماں کی اتلی تھامنا میری مجبوری

کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ بھی رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچوں ایک جیسی آکر رکی اور میری ماں ان دو آدمیوں کے ساتھ جیسی میں بیٹھ گئی۔ جیسی روانہ ہو گئی۔ میری پوروش جس طے اور جس بہتی میں ہو رہی تھی اس میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر عورتیں بھیک مانگنے کے پردے میں جسم کا ہوا بھی کر لیتی تھیں۔ ان کے مردوں کو بھی اس کا ظم ہوتا تھا۔ شاید میرے باپ کو بھی ہو مگر اس کو تو پیسہ چاہئے تھا وہ کیوں برامانے لگا تھا۔

"مگر ماں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ پیسہ تو اس کے ہاتھ لگے گا بھی نہیں۔ میں نے سوچا۔ لیکن بے بسی کے آنسوؤں کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے یہ سب پسند نہ آیا۔ اب میری عمر اتنی ہو گئی تھی کہ اس قسم کی باتیں نامحسوس طریقے سے مجھ پر اثر انداز ہونے لگی تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ ماں جہاں کہیں بھی گئی سے لٹ کر اپنے اس اڑے پر ضرور آئے گی جہاں وہ بھیک مانگتی تھی۔ میں اپنے اڑے کے بجائے اس کے اڑے کی طرف چل دیا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے کب لوٹ کر آئی اور کس کے ساتھ آئی۔

میں اڑے پر پہنچا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ میدو کے ہونٹ پر بھی آج بہت کم لوگ تھے۔ میں بھی دھوپ سے بچنے کے لئے پان کے کیبن کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ ماں کا دور دور تک پانا نہ تھا۔ پان سگریٹ والے نے تو مجھے جانتا تھا آکھ دباتے ہوئے مجھ سے پوچھا "اوتے میدو! آج نذیرن نہیں آئی۔"

"ہاں نہیں۔ گھر سے تو نکلی تھی ابھی تک ادھر نہیں پہنچی"

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوتے کسی یار کے ساتھ چلی گئی ہوگی" دکان پر کھڑے ہوئے گا بک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

بات سچی تھی مگر مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ میں کیبن کے پاس سے ہٹ گیا۔ میدو کے ہونٹ میں آج بہت کم گا بک تھے ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ میں نے سوچا کچھ دیر یہاں بیٹھ جاؤں تب تک شاید ماں بھی آجائے۔ اب مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ میں ابھی بیٹھای تھا کہ میدو آیا۔ "اوتے جیب میں پیسے ہیں؟"

میرے پاس پیسے کہاں! میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ تو پھر پھنکا کھا چل ادھر سے۔ میدو نے مجھے بھگا دیا۔

"یہ آج میدو کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی ماں کے ساتھ آتا ہوں تو میری بڑی خاطر کرتا ہے۔ اس روز بکٹ بھی کھلایا تھا۔ مفت بالکل مفت۔" میں نے سوچا اور ہونٹ سے نکل آیا۔

دو پہر گزر گئی ماں اڑے پر واپس نہ آئی۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا کہ نہیں وہ میری ماں کو مار نہ ڈالیں۔ میں نے سوچا چل کر ابا کو بتا چاہے۔ میں اس کے اڑے پر پہنچا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ سخت گرا، گرا وجہ سے گھرواپس چلا گیا تھا۔ میں بھی گھرواپس

پلٹ آیا۔

گھر میں ابا پہلے ہی سے سو رہا تھا شاید وہ گھر کا کام کر گیا ہی نہیں تھا۔ میں نے پوری بات ابا کو بتادی۔ ابا میری بات سننے کے بعد پریشان ہونے کے بجائے بے اعتنائی سے ہوا "اوتے اچھا! ایسے گل ہے۔ اس کا چل ہی ہے کہ کن مرئی کے گی۔" وہ بیڑیا "اوتے گل نہ کر شام تک آپ آجائے گی۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کنئی گل ہے اس کو ہم سب کی ابا اپنے آپ سے کتا ہوا چلم بھرنے چل دیا۔

مجھے بھی خبر آگیا۔ میں شزاوی کو لے کر ریلوے لائن کی طرف نکل گیا۔

"آج ہمارے ہاں مرئی کے گی۔" میں نے شزاوی سے کہا "تو کیا ہے گل میرے گھر بھی کئی تھی۔" شزاوی نے جواب دیا۔

"گل تیری ماں کتنے بچے گھر آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا شام کو آئی تھی۔"

"جیسی تو مرئی کئی تھی۔ اب شام ہو رہی ہے۔ میری ماں بھی آگئی ہوگی۔ اب مرئی کے گی۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آجے مجھے بھی کھلاؤں گا چل میرے گھر۔"

میں شزاوی کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ ماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ابا بہت پریشان تھا۔ اڑے تک دیکھ آیا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی دیر نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندھرا پھیل گیا آٹھ والی گاڑی بھی گزر گئی مگر ماں نہیں آئی۔ بستی کی کئی اور عورتیں اور مرد اس رات ہماری جگہ میں جمع تھے۔ ابا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آخر کب تک انتظار ہوتا! اس بچے کے قریب سب لوگ یہ کہہ کر اٹھ گئے "شیرا آئی! صبح تک اور کچھ لے ورنہ تھانے میں ریٹ درج کروادیں گے گل جاوے گی۔ اب سو جا۔"

لوگوں کے جانے کے بعد ابا بہت دیر تک تم صم بیٹھا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہاں شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہو سکتا ہے کام زیادہ ہو گیا ہو" اب وہ صبح ہی آئے گی۔ نہیں آئی تو پھر ریٹ تو تلھوانی ہی پڑے گی۔

"ابا! آج تو نے تازی بھی نہیں لی!"

"نہیں یار! آج دل نہیں چاہ رہا۔ تو بیٹھ میں تیرے لئے کچھ کھانے کولاتا ہوں۔" ابا باہر نکل گیا۔

ابا کے جاتے ہی میری اندھی خالہ جگلی میں داخل ہوئی۔

کہہ رہے رہے تیرا باپ؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"میرے لئے کھانا لائے گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں تیرے گھر مرئی نہیں کئی؟" شزاوی نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"نہیں! ابا! میں نہیں آئی" میں نے جواب دیا۔

خالہ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ شاید اسے تمام معاملے کا پتہ سے علم ہو چکا تھا۔

ابا جھگی میں داخل ہوا۔ وہ میرے لئے مرنی لایا تھا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ باپ فقیر ہی نہیں نہ ہو باپ ہوتا ہے۔ وہ میرے لئے گھر میں تو مرنی نہ چکا اسکا لیکن اپنا وعدہ ضرور پورا کیا۔ "ابا! اماں یاد آ رہی ہے۔" میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چپ کر اورے! اماں یاد آ رہی ہے۔" اماں کو تھری ہوا ہے جو تجھے یاد آ رہی ہے۔ روٹی کھا اور سو جا۔" ابا نے مجھے زور سے ڈانٹا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اماں کو میری یاد تک نہیں آئی پھر میں اسے کہیں یاد کروں۔" میں نے دل میں کہا اور مزے سے مرنی کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں شزاوی بھی شامل ہو گئی۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔

دیے کی خیالی روشنی میں آج ہماری جھگی کا سناٹا بڑا اداس اور خوفناک لگ رہا تھا۔ باہر چھینکروں کی کوازیں اور اندر ابا کے پیسے کی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی توازن نہ تھی۔ یاد دہانے کے وقت سے ریل کا بیت نامک انجن خاموشی کے سینے کو چیرتا ہوا گزرتا تھا۔ معمول تو روز کا یہی تھا لیکن اماں ہوتی تھی تو یہ سناٹا کیسے غائب ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی عورت ماں کے پاس بیٹھی تھمتھے بکھیرتی رہتی تھی۔ آدھی رات کے بعد ابا کے ساتھ اس کی بک بک جھک جھک سے جھگی آباد ہو جاتی تھی۔ اب کوئی عورت بھی نہیں تھی۔ خالہ بھی شزاوی کو لے کر کب کی جا چکی تھی۔ ابا بھی خاموش تھا۔ لڑتا تو کس سے لڑتا۔

میں زمین پر پڑے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے پر لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ نہ جانے کب فینڈ کی ریل میں بیٹھ کر خوابوں کے شہر جا پہنچا۔ اماں مجھے کراچی میں مل گئی۔ ابھی میں اسے آواز دے کر بلائے والا ہی تھا کہ ابا نے مجھے آواز دے لی "عید والٹھ"۔۔۔ اوئے دیکھ تیری اماں آگئی۔"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ابا نے مجھے اٹھانے کے لئے جھرت بولا تھا۔ یہ ماں باپ بھی خوب ہوتے ہیں۔ گھر میں باپ نہ ہو تو ماں باپ کا نام لے کر ڈراتی رہتی ہے۔ ماں گھر میں نہ ہو تو باپ ہر کام کے لئے ماں کا سارا ڈھونڈتا ہے۔ یہ کر لے تیری ماں آئی ہوگی نہ نہ کر تیری ماں آئے گی تو خفا ہوگی۔

میں نے آنکھیں لٹتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ "مکہ مر ہے ماں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں آئی" اب تمہارے جنازہ پڑے گا۔" ابا نے لٹنڈی سانس بھری۔

چاچا غصلا اور ابا نے تمہارے جا کر بہت نکسواری۔ ہونا کیا تھا

۔۔۔ پولیس آئی، برادری والوں سے پوچھ گچھ کی، کسی کو ڈرایا کسی کو دھمکایا۔ دو چار دن پولیس کا بہتی میں آنا جانا رہا، جب انہیں دینے کے لئے ابا کے پاس کچھ نہ رہا تو یہ کہہ کر انہوں نے تفتیش کے خاتمے کا اعلان کر دیا کہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔ کچھ دن تک بہتی میں اماں کے یوں غائب ہو جانے کے چرچے ہوتے رہے پھر لوگ بھول گئے۔ یہاں تک کہ ابا نے بھی اس کا خیال چھوڑ دیا۔ شروع شروع میں تو وہ اکثر نشے کی حالت میں اماں کا نام بولنے لگا لیاں بکا کرتا تھا، پھر اس نے میری ماں کو گالیوں کے لائق بھی نہ سمجھا اور ایک دن کہیں سے میرے لئے دو سری ماں لے آیا۔ یہ عورت صورت مثل کے اعتبار سے تو بہت اچھی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جیسے کوئی ٹانگن! آپ یقین کریں کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں اس طرح چمکتی تھیں جیسے دو چھوٹے بلب روشن ہو جائیں۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ میری ماں کراچی چلی گئی ہے لہذا میں نے سوچا، میں بھی کراچی چلا جاؤں، کیا خبر وہ مجھے مل جائے۔

ایک دن موقع پا کر میں کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ہم فقیریوں کو ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن، ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے تک بھیک مانگتے مانگتے میں کراچی آ گیا۔ مسافروں کا ایک سیلاب تھا جو کینٹ اسٹیشن پر اترا، اسی سیلاب میں بہتا ہوا میں اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ نہ منزل کی خبر نہ راستے کا علم، جس طرف نہ اٹھا چل دیا۔ چوڑی چوڑی سڑکوں پر ٹریفک کا جھوم اور انسانی سروں کی بھیر دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ کراچی کو میں بڑا شہر ضرور سمجھتا تھا لیکن بڑے شہر کے معنی مجھے معلوم نہیں تھے۔ "یہاں تو کسی کو کسی کی پردہ ای نہیں ہے۔ یہاں میری مجبوریوں کو دیکھ کر مجھے بھیک کون دے گا؟ مجھے عید کہہ کر گالی کون دے گا؟ اور اگر یہ سب کچھ نہ ہوگا تو میں کھاؤں گا کہاں سے اور رات آنے پر کہاں لیٹ کر آنکھیں بند کروں گا۔" میں نے سوچا۔ بھوک اور فینڈ کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں شام ہونے والی تھی۔ بھوک الگ ستانے لگی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں اوڈین سینما کے پچھلے علاقے تک آ گیا۔ یہاں کئی موٹر گیراج تھے، میں وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو غور سے دیکھتا ہوا جگے جگے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں کام کرنے والے اکثر لڑکے میرے ہم عمر تھے۔ بلکہ بعض تو مجھ سے بھی چھوٹے تھے۔ مجھے یہ بچے اس طرح کام کرتے ہوئے بہت اچھے لگے۔ انہیں دیکھ کر اس خیال نے میرے دل میں کوٹ لی کہ اگر میں بھی ان کی طرح محنت کروں تو روٹی کا آسرا بھی ہو جائے گا اور بھیک مانگنے سے بھی بچ جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں ایک موٹر گیراج میں

توی نے بھی میری سفارش کی "حاجی صاحب" ٹیک کام ہے۔ لڑکا بھیک مانگنے سے نفرت کرتا ہے، محنت کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اسے ٹھکرا دیا تو شاید یہ پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں گواہ ہوں، کوئی ایسی دسکی بات ہوئی تو میں آپ کا پورا پورا ساتھ دلاں گا۔"

غرض خاصی بحث و تمحیص کے بعد حاجی صاحب مجھے کام سکھانے پر تیار ہو گئے۔

"اب کچھ رقم ہے میرے پاس؟" حاجی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں جی دو روپے ہیں۔"

میں نے چالاکی دکھائی۔

"چل نکال۔"

ان دو روپوں میں باقی پیسے خود حاجی صاحب نے ملا کر مٹھائی منگائی۔ قاتحہ دلائی گئی۔ پھر وہ مٹھائی پر سے گیراج میں تقسیم ہوئی جو اس بات کا اعلان تھی کہ میں حاجی صاحب کا شاگرد بن گیا ہوں۔

مجھے ایک سینئر میکینک کے ساتھ کام پر لگا دیا گیا۔ دن بھر میں کام سیکھتا، رات کو گیراج میں کسی گاڑی کی سیٹ پر آٹھ کا بندہ سہ بن کر پڑ جاتا۔ یہ تھی میری زندگی۔ کچھ ہی دن حاجی صاحب مجھے پانچ روپے کا نوٹ دیتے کہ "جا بیٹا، میں کر گھوم پھرے" میں یہ دن بڑے مزے میں گزارتا۔ کبھی کلشن چلا جاتا، کبھی فلم دیکھتا اور کبھی بونسی بازوں میں گھوم کر دن گزار دیتا۔ فرصت کے ان لمحات میں مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی تھی۔ میں اکثر بازاروں میں گھومتے ہوئے اپنی ماں کو تلاش کیا کرتا تھا۔ ایک تو وہ مرتبہ کلشن پر عبداللہ شاہ نازی کے مزار پر بھی گیا کہ شاید وہاں ماں مل جائے مگر ماں گم ہو جائے تو اتنی آسانی سے توڑی ملتی ہے۔ کئی موقعوں پر شہزادی بھی مجھے یاد آتی لیکن میں نے عقارت سے اس کے خیال کو جھٹک دیا۔ "فقیر کی اولاد! اس کا میرا کیا ناتا" اگر وہ مل بھی جائے تو میں اس سے بات نہ کروں۔ مگر میری ماں بھی تو فقیرنی ہے۔ "میں سوچتا ہوں میری ماں ہے" ماں تو بس ماں ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتی۔ "میں خود ہی جواب دیتا۔ سینے میں چاری تو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ جانے کتنی چھٹیاں گزر گئیں مگر کون کونسا تھا نہ ملی۔"

کارخانے میں اکثر لڑکوں کو مظلوم تھا کہ میں بھکاری خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ دن میں کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ فقیر آتا تو لڑکے مجھے چھیڑتے، ابے عید، تیرے رشتے دار آگئے، اس بات پر کئی مرتبہ میرا جھگڑا ہوا۔ ایک مرتبہ تو میں نے ایک بھاری جھوڑا اپنے ساتھ لے کر کھینچا اور وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ اس کے لگا نہیں دینا، سیدھی سیدھی جیل ہو گئی ہوتی۔ لیکن اس واقعے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ لڑکے ڈر گئے اور انہوں نے مجھے

داخل ہو گیا۔ بھیک مانگنے کی عادت نے مجھے کوئی اور قاعدہ سیکھایا تھا یا نہیں، اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری جھجک اور شرم ختم ہو گئی تھی۔ میں بغیر کسی تکلف کے جو کھانا چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ اس عادت نے یہاں بھی میرا ساتھ دیا۔ میں نے گیراج میں داخل ہوتے ہی اندر بیٹھے ہوئے ایک توی کو مخاطب کیا "اس گیراج کا مالک کہاں ہے؟"

"وہ نماز پڑھنے گئے ہیں" اس توی نے مجھے بتایا۔

"کب آئیں گے؟" میں نے عجیب بے شک سوال کیا۔

"جب نماز ختم ہو جائے گی، ویسے بات کیا ہے؟" اس توی

نے میرے سراپے کا جائزہ لیا۔

"مجھے نوکری چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ کوئی کام دہام جانتے ہو؟"

"نہیں۔ کوئی کام جانتا تو نہیں مگر سیکھ لوں گا۔" میں نے

یقین دلایا۔

"ادھر بیڑ کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ حاجی صاحب ابھی آتے ہوں

گے۔ میں ان سے تمہاری بات کرادوں گا۔ چلو!"

میں جا کر بیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں حاجی صاحب آگئے تو مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ حاجی کہیں سے بھی نہیں لگتے تھے۔ نہ منہ پر داڑھی تھی نہ سر پر ٹوپی۔ زبان اور مزاج سے خالص کاروباری آدمی لگتے تھے۔ وہ آدمی جس سے میری بات ہوئی تھی، اب ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسی نے میرا تعارف حاجی صاحب سے کرایا۔

"حاجی صاحب! یہ لڑکا کام کی تلاش میں ہے۔ آپ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ میں نے اسے بٹھالیا تھا۔ آپ دیکھ لیں۔"

"کام کی تلاش میں! پہلے کہاں کام کرتا تھا بھائی تو؟" حاجی صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی میں کام نہیں جانتا، آپ مجھے سکھادیں پھر میں یہیں کام کروں گا۔"

"جی میں یہیں کام کروں گا۔" حاجی صاحب نے میری نقل اتاری۔ "ابے ہم تیرے دادا کے نوکر ہیں کہ تجھے کام سکھائیں اور ہاں سرکار، آپ بھاگ کر کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کراچی کے تو آپ ہیں نہیں۔" حاجی صاحب نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جی پنجاب سے آیا ہوں۔"

"پھر تو میرا اندازہ درست نکلا۔ ٹاپا بانہ، میں پولیس عدالت کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کل کلاں کو تمہارا باپ تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آجائے تو میں تو مارا گیا نا" حاجی صاحب نے کہا۔ "نہیں، مجھے کوئی ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔" پھر میں نے حاجی صاحب کو پوری تفصیل بتائی۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے

پہنچا ہوا تھا۔

سے چار ہو جاؤ۔

میں نے چور لٹا ہوں سے اپنے عسکری صاحب کو دکھا  
جنہوں نے بڑی محنت سے مجھے کام دکھایا اور اب میں بغیر کوئی صلہ  
دئے یہاں سے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا حاجی صاحب کی آنکھیں  
بھگی ہوئی ہیں مگر وہ مسکرا رہے ہیں۔ توڑی ہی دیر میں پورے  
کارخانے میں یہ خبر گردش کر گئی۔ اچانک میں اہم قومی بن گیا۔  
کوئی معافی مانگ رہا تھا۔ کوئی کبھی کبھی آتے رہنے کا وعدہ لے رہا  
تھا کوئی مبارکباد دے رہا تھا۔ مبارک سلامت کے اس شور میں  
سیٹھ صاحب کی نئی نویلی جھلسل کرتی گاڑی میں بیٹھ کر میں گیاراج  
سے روانہ ہوا۔

گاڑی سیٹھ صاحب کی دو سوچ و درپیش کو غشی میں داخل ہوئی تو  
دو بارودی ملازموں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ صاحب مجھے  
لے کر ایک کمرے میں پہنچے۔ مجھے اس وقت اپنے غلیظ کپڑوں پر  
بڑا غصہ آرہا تھا۔ میں اپنے ساتھ دو جوڑی کپڑے لایا ضرور تھا مگر  
مسئلہ یہ تھا کہ یہ کپڑے نہانے کے بعد ہی تبدیل کئے جاسکتے تھے۔  
سیٹھ صاحب نے میری یہ پریشانی بھانپ لی انہوں نے ایک  
کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”جینا عید محمد یہ غسل  
خانہ ہے جا کر نہالونی الحلال اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑوں سے  
کام چلاؤ۔ کل تمہارے لئے بہت سارے کپڑے آجائیں گے۔  
میں تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔ حکم ملتے ہی غسل خانے میں  
گھس گیا۔ نہ جانے کتنے دن سے ڈھنگ سے نہایا نہیں تھا اور پھر  
ایسا غسل خانہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب جو  
موقع ملا تو اگلے بچیلے سارے حساب چکاؤئے۔ معلوم نہیں کتنی  
دیر تک نہاتا رہا۔ نہا کر نکلا تو سیٹھ صاحب میرے ہنظر تھے وہ  
مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچے۔ یہ ان کا ڈائٹنگ ہال  
تھا۔

”لو سیاں! اب بھوک لگ رہی ہوگی کھانا ہو جائے۔“

انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ ماحول میرے لئے بڑا اجنبی  
تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کس طرح بیٹھتا ہے کس طرح کھانا ہے  
... میں نہایت سہا ہوا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر سیٹھ صاحب نے  
مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے تم اس ماحول کے عادی نہیں  
ہو گے۔ یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تم بے تکلف ہو کر جس  
طرح کھائیں ہو کھاؤ۔ آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ آجائے گا۔  
شاہاش! سالن پلیٹ میں نکالو اور شروع ہو جاؤ۔“ میں نے ڈرتے  
ڈرتے پلیٹ میں سالن نکال لیا۔

سیٹھ صاحب نے نوکر سے پوچھا ”بیگم صاحبہ کو کھانا پہنچا دیا“

”جی سرکار“ نوکر نے اقرار میں کر دیا ہلاکی۔

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے سوچا ان کے یہاں عورتیں اور  
مرد الگ الگ کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر سیٹھ

دن بھر آنے والی خیر عورتوں سے یہ لڑکے جو خوش مذاق کیا  
کرتے تھے اس نے پورے دل میں فقیروں کی طرف سے اور بھی  
ظہرت پیدا ہو گئی۔ میں رات کی تھمائی میں اپنے خدا سے شکوہ کیا  
کرتا تھا کہ اس نے مجھے ایسے خاندان میں کیوں پیدا کیا۔ میں اپنی  
کوشش سے وہاں سے نکل آیا ہوں مگر کھلاؤں گا تو قسری۔ کیا  
ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نام اور خاندان سے میرا کوئی رابطہ ہی نہ  
رہے؟ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آتی تھی۔ تھک تھک کر سو جاتا۔ کام  
اور خیالات کی اسی گردش میں دن گزرتے گئے۔

حاجی صاحب کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے مجھے تقریباً  
ایک سال گزر گیا تھا۔ اب میں اچھا خاصا کلینک بن گیا تھا۔  
حاجی صاحب نے بینک میں میرا اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا تھا جس میں  
میرے پیسے جمع ہو رہے تھے۔ اب میں عید سے عید محمد ہو گیا تھا  
اسی نام سے میرا اکاؤنٹ کھلا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک سیٹھ صاحب ہمارے گیاراج پر  
آئے ان کی گاڑی کی ”ڈھولگی“ تبدیل کرنی تھی اور بھی دو ایک  
چھوٹے چھوٹے کام تھے۔ کام مشکل نہ تھا اس لئے حاجی صاحب  
نے یہ کام میرے ذمے لگا دیا۔ سیٹھ صاحب سے میں نے پیسے  
ملے کر لئے اور بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ سیٹھ صاحب  
گاڑی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان سے دوسرے دن کا وعدہ ہوا تھا۔  
دوسرے دن جب سیٹھ صاحب آئے تو میرے کام اور باتوں سے  
بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے میرا صاحب سے میری بہت  
تعریف کی۔ حاجی صاحب بھی مجھ سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے  
مجھ سے نہ صرف میری تعریف کی بلکہ میرا مانس بھی ان کے سامنے  
کھول کر رکھ دیا۔ سیٹھ صاحب مزید متاثر ہوئے۔ کچھ دیر ان  
دونوں نے تھمائی میں باتیں کیں۔ مجھے نہیں معلوم ان کے  
درمیان کیا بات ہوئی میں نے ان کا اعلان سنا حاجی نے مجھ  
سے کہا ”جینا عید محمد! سیٹھ صاحب تمہیں پیناچا کر اپنے گھر لے  
جانا چاہتے ہیں کیا خیال ہے تمہارا؟“

میں اس اچانک صلے سے پریشان ہو گیا ”سزہ کائے کھڑا رہا“  
کیا جواب دیتا۔

”میرے خیال میں تمہیں مان لینا چاہئے تمہارا مستقبل بن  
جائے گا۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ ہاتھ منہ کالا کرتے عمر گزر جائے گی  
حاجی صاحب نے مجھے قائل کیا۔

”تو پھر ایک شرط ہے میری۔“ میں نے نیم رضامند ہوتے  
ہوئے کہا۔

”یو لو جینا یو لو!“ سیٹھ صاحب گڑگڑائے۔

”مجھے پڑھنے کا شوق ہے“ آپ کو میرا شوق پورا کرنا ہو گا۔“  
سیٹھ صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا ”یہ بھی کوئی کتنے  
کی بات ہے یہ سب تو ہمیں خود ہی کرنا ہو گا۔ بس اب تم جلدی

ضرورت پڑتی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ ٹھگے ہارے مسافر حالات کی تیز دھوپ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ یہ مسافران نصیب نہ ہو تو سائے میں پنکھیاں برستی ہیں، خوشی کے پھول غم کے انکادوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

میں اس گھر میں رہتے ہوئے کئی مرتبہ بیگم صاحب کے غضب کا نشانہ بنا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بھاگنے میں کراٹھانہ رکھی مگر میں بڑی ذہین مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ان کا ہر ظلم میرے صبر کی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوتا رہا۔ انہیں شاید میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا، جانتی ہی نہیں تھیں کہ ہم گندی بستیوں میں رہنے والے لوگ تو مسک جراثیم سے بھی ہار نہیں مانتے۔ زمین پر لیٹ کر ہماری ہڈیاں فولاد بن جاتی ہیں۔ صدے اٹھاتے اٹھاتے ذہن و قلب ایسے شل ہو جاتے ہیں کہ پھر جوت کو محسوس کرنے کی سکت ہی نہیں رہتی۔ ہاتھ پھیلائے کی عادت اتنا زلیل بنا دیتی ہے کہ مزہ ڈیل ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ بالآخر وہ ہار گئیں۔ اب وہ صرف اتنا کرتی ہیں کہ میرا سامنا ہوتے ہی غرت سے منہ پھیر لیتیں یا اٹھ کر چل بیٹیں گویا انہوں نے حالات سے مصالحت کر لی تھی۔

سینہ صاحب نے مجھے پڑھانے کا وعدہ پورا کیا۔ میرے لئے ایک ٹیچر کا بندوبست کر دیا گیا جو مجھے تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے کے ادب بھی سکھاتا تھا۔

تھوڑے ہی دن میں میں نے ابتدائی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا۔ میری ذہانت نے سینہ صاحب کو چونکا دیا۔ میرے ٹیچر نے بھی میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے کھائے۔ ادب تہذیب کے اعتبار سے بھی اب میں سینہ صاحب کی دنیا کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا۔ اب سینہ صاحب مجھے اپنے طبقہ احباب میں بھی متعارف کرانے لگے تھے۔ میں ان کے خانہ پابندی سے کلب بھی جانے لگا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے اب بی اے تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اب میں نے سینہ صاحب کے کاروباری امور میں بھی کچھ نہ کچھ دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ اس خیال تک آتے آتے ایک اور مجرہ بھی رونما ہو چکا تھا جس کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ کہ بیگم صاحب کے روپے میں اب بے انتہا لچک آگئی تھی۔ وہ اب مجھے میرا نام لے کر پکارنے لگی تھیں۔ جبکہ اس سے پہلے اے اور اوئے سے کام چلاتی تھیں۔

صاحب نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو۔"

"سوچ رہا ہوں بیگم صاحب، الگ کیوں کھاتی ہیں۔"

"تم اس وقت آرام سے کھانا کھاؤ۔ اب اس گھر میں آئی تے ہو تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔" سینہ صاحب نے شفقت سے کہا۔ میں کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

بعد میں کچھ نوکروں کی زبانی اور کچھ خود سینہ صاحب کے بتانے پر جو معلومات میں نے جمع کیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سینہ صاحب کا نام برکت علی خان تھا۔ ان کا تڑپے کا بزنس تھا۔ اور بھی کئی کاروبار تھے جن کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ دولت کا ٹکٹا انہیں تھا مگر اس کا وارث کوئی نہ تھا۔ سینہ صاحب کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس لئے شادی کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ بیگم صاحب کو اولاد نہ ہونے کا بہت صدمہ تھا اسی وجہ سے ان کو نیم پامل بنایا تھا۔ وہ اولاد نہ ہونے کا قصور وار سینہ صاحب کو سمجھتی تھیں۔ اس لئے ان کا سارا غم سینہ صاحب ہی پر اترا تھا۔ سینہ صاحب مجھے اس لئے لے کر آئے تھے کہ شاید بیگم صاحب کی مانتا کو تسکین مل جائے، مجھے دیکھ کر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی آجائے لیکن میرے بارے میں صرف سن کر ہی ان پر پل پل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسی لئے اس دن بلکہ اس کے بعد بھی کئی دن تک انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ایک ماہ میں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم سے پہلے بھی کئی بچوں کو سینہ صاحب لے کر آئے لیکن بیگم صاحب نے ایسا دوا دیا پچایا اور ان مسندوں پر ایسے ظلم کئے کہ ان میں سے کوئی بھی پندرہ ہفتوں سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔

یہ سب باتیں سن کر میں نے تیرہ کر لیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں رہنا سینہ صاحب کی بھی خدمت ہے اور بیگم صاحب کی بھی۔ رہی ظلم و ستم کی بات تو میں بہت سنت جانتا ہوں۔

سینہ صاحب نے گھر بیٹھنے کے تین دن بعد میں نے بیگم صاحب کو دیکھا۔ وہ کئی بات پر مالی کوتاہی سے کہہ رہی تھیں۔ میں بھی ان کو دیکھنے کے شوق میں ان پر چلا گیا۔ ان کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ مالی کوجھل کر مجھ پر بڑی بڑی "کون ہے یہ؟" است کون آیا ہے یہاں؟ آیا میری دولت پر قبضہ کرنے۔ ٹھہر جا میں تیری ہڈی پٹی ایک کرتی ہوں۔" وہ میرے پیچھے دوڑیں۔ میرے نصیب اچھے تھے کہ میں اسی وقت سینہ صاحب بھی پہنچ گئے۔ بیگم صاحب نے بھول بھال سینہ صاحب کے پیچھے پتہ بھانڈ کر پڑیں۔ دونوں کے درمیان جن مکالمات کا تبادلہ ہوا انہیں سن کر تو میں حیرت میں کم ہو گیا۔ اس وقت میری نظیریاں اور بیگم صاحب میں جھگڑنے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مجھ پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ دونوں کے فاصلے دولت سے کم نہیں ہوتے اس لئے تو انہما کی گھنڈی نیچاؤں اور محبت کے سائبان کی



وقت میری طرفی کی امتحان نہ رہی جب بغیر کسی جیل و جت کے وہ چیک کیش ہو گیا۔ میں پہلے امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسرے مرحلے میں میں نے ایک کاروباری خط کا جواب سینٹ صاحب کے دستخطوں کے حوالے سے دے ڈالا۔ اعتراض وہاں سے بھی نہیں آیا۔ اب ایک ہی مرحلہ باقی تھا کہ سینٹ صاحب کو بھی آرایا جائے۔ یہ موقع بھی قلدی ہاتھ لگ گیا۔ سینٹ صاحب نے ایک کاروباری خط دستخط کر کے اپنی میز پر رکھا اور کسی کام سے دفتر سے باہر چلے گئے۔ میں نے وہ خط اٹھالیا۔ دوبارہ ٹائپ کرا کے اپنے ہاتھ سے دستخط کئے اور دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ سینٹ صاحب واپس آئے تو میں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی "ذرا ان دستخطوں کو دیکھئے" ایسا نہیں معلوم ہوتا جیسے بیماری کی وجہ سے آپ کے ہاتھ میں خفیف ساروش پیدا ہو گیا ہے۔"

"نہیں تو اچھے خاصے دستخط ہیں۔ تمہیں یہ رعشہ کا وہم کیسے پیدا ہوا؟" انہوں نے دستخطوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا غور سے دیکھئے" مجھے تو یہ آپ کے دستخط لگتے ہی نہیں۔ میں نے زور دے کر کہا۔

"تمہیں یہ آج ہو گیا گیا ہے کیوں میرے دستخطوں کے پیچھے بڑے ہوسے ہو۔ میرے بارے میں زیادہ نہ سوچا۔" انہوں نے کانٹہ میرے سامنے سے ہٹالیا۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ آج میں اپنی کامیابی پر بے ہوشی ہوا تھا۔ اب میری مہارت میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ اب میں کسی وقت بھی اس پلاننگ پر عمل پیرا ہو سکتا تھا جو میرے ذہن میں پل رہی تھی۔ اس پلاننگ کی کامیابی کے لئے مناسب وقت اور موقع کی ضرورت تھی۔ اس دن کے بعد سے میں اسی مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ دولت کی لکیر میرے ہاتھ میں شاید بہت گہری تھی۔ ایک قابل عمل ترکیب میرے ذہن میں آئی تھی۔

میرا ایمان ہے کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ دولت سب کچھ نہ سہی لیکن بہت کچھ ضرور ہے۔ میں نے اسی طاقت کا سہارا لیا۔ دولت کمانے کے لئے بعض اوقات دولت خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ خرچ کرنے کے مواقع بھی میں نے فراہم کر لئے۔ سینٹ صاحب کے وکیل کو ایک بڑی رقم کا نذرانہ پیش کر کے اسے اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ ایسے کاغذات تیار کر دے جن میں تحریر ہو کہ "میں یعنی سینٹ برکت علی اپنی تمام متقولہ و غیر متقولہ جائیداد بشمول تمام کاروبار اپنے بیٹے عید محمد کے نام کرتا ہوں۔ مزید یہ کہ میری بیوی۔ ہم باہم ہے وہ اس دولت کی مگرانی سے عاجز ہے میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی اس لئے عید محمد کو مالکانہ حقوق میری زندگی میں مورثہ سے حاصل ہو جائیں گے۔"

صاحب اور بیگم صاحبہ درمیان سے ہٹ جائیں تو میں اس حالت کا تھا وارث بن جاؤں گا۔ اس وقت نہ تو میں نے یہ سوچا کہ بیگم صاحبہ نہ سہی سینٹ صاحب میرے محسن ہیں اور نہ ہی اس پر غور کیا کہ بیٹے کون زندہ رہتا ہے۔ قدرے دیر ہی سے سہی سینٹ صاحب کے بعد میں ہی ان کا وارث ہوں لیکن انتظار کے مصائب تو اعلیٰ طرف اٹھاتے ہیں۔ کیا خیراتے عرصے میں ان کا کوئی اور وارث پیدا ہو جائے کیا خیر خود سینٹ صاحب کی نیت بدل جائے۔ کون جانے کیا ہو جائے۔ مستقبل سنوارنا ہے تو قریب کا راستہ اختیار کرو 'دور کیوں جاؤ۔ قطبہ قطبہ سمیٹنے کے بجائے چلو بھر کر کیوں نہ ہو۔ پی تو لو مگر کیسے؟ موت تو وقت پر ہی آتی ہے۔ سینٹ صاحب کو وقت سے پہلے موت کا چوکھٹے دکھایا جائے؟ کچھ بھی ہو کچھ کرنا چاہئے۔ اب میں نے ایک کینے مقصد کو اپنی زندگی کا حاصل بنا لیا۔

میں نے اپنے مشن کا آغاز مانتا کے قتل سے کیا۔ اس بوڑھی عورت کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا جو بے چاری میری آنکھوں میں اپنے بیٹے کا کس دیکھنے لگی تھی میرے وجود نے جس کی دیوانگی کا علاج کر دیا تھا جس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ مگر اب میں نے سوچا کہ اس کا پاگل پن ہی میرے حق میں بہتر ہے۔ میں نے اپنے رویے سے اس کے دل کو چھیلنا شروع کیا۔ وہی عورت جو میری ہنسی کی شہنشاہ کی عادی بن گئی تھی میرا بدلا ہوا روپ دیکھ کر بھونپکا رہ گئی۔ میں اسے کسی ایک حالت کا عادی بنا کر اس میں برداشت کی قوت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس کے لئے میں ڈہری شخصیت کا مالک بن گیا۔ سینٹ صاحب کے سامنے میں اس کا بیٹا بن جاتا اور سینٹ صاحب کی غیر موجودگی میں روپ بدل لیتا۔ اس طرح اس کے ذہن کو اسے جھٹکے لگے کہ بے چاری پھر سے سہی سہی رہنے لگی۔ سینٹ صاحب اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کی طرف سے مزید بے پروا ہو گئے۔ اس ڈہری مارنے کے زور بڑھایا کو ادھ موا کر دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

سینٹ صاحب کی کمزور بننا میرے تو اتنا بازوؤں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی لیکن میں خواہ خواہ کسی بکھیرنے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی میں ہر قدم احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ سینٹ صاحب بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ اور یہ مرض میرے لئے تعویذ کا باعث تھا۔ ان کی طبیعت موت کا انتظار کرنا میرے بس سے باہر تھا لہذا میں نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ دن رات صحت کر کے سینٹ صاحب کے دستخط بنانے کی ریکٹس کی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اصل اور نقل میں تیز کرنا مشکل ہے تو اپنی کارکردگی کے امتحان کے لئے سینٹ صاحب کی چیک بک سے ایک چیک لے کر اس پر ایک بڑی رقم درج کی اور سینٹ صاحب کے دستخط کر کے بینک بھیج گیا۔ اس

گھمایا۔ سامنے سیٹھ صاحب جو اسزاحت تھے۔ ان پر مل کا دورہ پڑا تھا، خطہ نکل گیا تھا لیکن ڈاکٹروں کے مطابق آکھ سے کہتے ان کے لئے خطرناک ہو سکتے تھے۔

”گویا ابھی امکان ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ان کے دل کی دھڑکن پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا۔“

میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ ان سے کس لمحے میں کیا بات کی جائے جس سے انہیں سخت اذیت پہنچے اور وہ اس گرواب میں پھر گرفتار ہو جائیں جس سے فی الحال وہ گزر آئے تھے۔

میں نے آہستہ سے آواز دے کر انہیں جگا دیا۔ ان کی آنکھوں سے فحاشت صاف ظاہر تھی۔ انہوں نے سکرانے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

”میرے خیال میں بہت ہو چکا، اب آپ کو مرانا چاہئے۔ کیا خیال ہے سیٹھ صاحب؟“ میں نے سفاکی سے کہا۔

سیٹھ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ان کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ انہوں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

”شاید تم یہ اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم سے میری تکلیف دیکھی نہیں جاتی لیکن پھر بھی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔“

”مجھے تمہاری تکلیف سے کوئی غرض نہیں، میں نے تو یہ بات اس لئے کہی کہ تم بہت بیش کہنے، بہت ہی چکے، اب دوسروں کو موقع دو، میں نے چہتے ہوئے کہا۔“

”کیا! ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شاید درد کی کسی لہر نے انہیں لپٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔“

میں پھر نہا ”بڑے مہاں! میں چاہوں تو ابھی تمہیں ماسوں لیکن تم میرے حسن ہو، میں یہ ظلم نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور چاہوں گا کہ جہاں اتنے احسان کے ہیں ایک اور احسان کر دو۔“

”کل جاؤ میرے کمرے سے گندی ٹالی کے کیتڑے، میں تمہیں پھر سے نصیحتاں دلاؤں گا۔ میں اپنی دولت میں سے ایک پائی تمہیں نہیں دلاؤں گا“ وہ اپنی دانست میں دھاڑے مکران کی توار دووازے تک بھی شاید ہی پہنچی ہو، ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا، بے دم سے ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے اطالامی گھنٹی کی طرف ہاتھ پڑھایا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا ”نہیں نہیں، ایسی بھی کیا جلدی ہے، پہلے میری پوری بات تو سن لو۔ اس کے بعد شاید تمہیں اس زحمت کی ضرورت نہ پیش آئے۔ ابھی کیا کہا آپ نے؟ آپ ایک پائی مجھے نہیں دیں گے۔ مگر آپ شاید بھول گئے کہ تمام دولت تو آپ پہلے ہی میرے نام کر چکے ہیں۔ اگر اب آپ بھی گئے تو نصیر سے بدتر زندگی ہوگی آپ کی۔ لیکن نہ آئے تو کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ اور اس پر اپنے حوالہ بھی ملاحظہ کر لیجئے، پھر دیکھئے۔“

میں نے فوٹو اسٹیٹ ان کی طرف پڑھائے۔ انہوں نے

دیکھ کر صاحب کچھ دیر تک جذب کا شمار رہے لیکن میرے مسلسل زور دینے اور دولت کے لالچ نے انہیں ہچکھلا دیا۔ کاغذات تیار ہو گئے۔ میں نے پروگرام کے مطابق اپنے ہاتھ سے سیٹھ صاحب کے دستخط کئے اور کاغذات کو اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

... اب سوال یہ تھا کہ سیٹھ صاحب کو یہ خبر کیسے سنائی جائے، مزید یہ کہ اس خبر ہونے والے دور عمل کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ اس دور عمل سے بچنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار نہایت ضروری تھا۔

میری قسمت یاد رہی کر رہی تھی۔ یہ موقع بھی جلد ہاتھ آ گیا۔

... سیٹھ صاحب بلڈ پریشر کے پرانے مریض تو تھے ہی۔ ایک مرتبہ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا۔ وہ صاحب فرائش ہو گئے۔ ان کا فیملی ڈاکٹر آیا اور چند دوائیں تجویز کر کے چلا گیا۔ بیمار دار تو میں ہی تھا۔ میں نے وہ دوائیں ان تک پہنچنے ہی نہیں دیں۔ اس نازک وقت میں بیگم صاحبہ کی تعریفیں بھی شروع کر دیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کی تعریفوں سے چڑتے ہیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی بات پر وہ شدید غصے میں آجائیں اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بلڈ پریشر کے مریض کو غصہ آنا بھی بہت جلد ہے اور نقصان بھی بہت ہوتا ہے۔ کوئی دوا ان کے پیٹ میں گئی نہیں، میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں انہیں جھٹکا کر دیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ شام تک ان کی حالت بہت بگڑ گئی۔ میں جان بوجھ کر ڈاکٹر کو اطلاع نہیں کر رہا تھا۔ شام کو کسی وقت انہیں ہارٹ

انک ہو گیا۔ اب میں نے ضروری سمجھا کہ ڈاکٹر کو اطلاع کر دوں۔ ڈاکٹر فوراً پہنچا۔ سامنے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ انہیں فوراً اسپتال لے جانا چاہئے۔ میں اور ڈاکٹر مل کر سیٹھ صاحب کو جناح اسپتال لے گئے جہاں انہیں داخل کر لیا گیا لیکن شاید یہ

دوہ بہت معمولی تھا۔ جلد ہی انہیں ہوش آ گیا مگر مجھے دوبارہ بے ہوش کرنے کی تدبیر بھی آئی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ دو تین دنوں کی سب سے بڑی کمزوری دولت ہی ہوتی ہے۔ جو دولت جمع کرتا ہے اور اسے دولت کی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ

مجھے جب بگڑا ہے، یہ دولت جب جھنجھتی ہے تو یہ جدائی ہے۔ رخصت اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے یہی نسخہ استعمال کیا۔ رات کو مجھے سیٹھ صاحب کے ساتھ اسپتال میں رہنا تھا۔

میں ضروری تیاری کی غرض سے گھر آ گیا۔

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دووازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرہ ایکٹو طور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں

پل رہا تھا اس کی تکلیف نے خود میری نظر میں مجھے پراسرار بنا دیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرہ نمبر ۲۱۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھنگے سے دووازے کا ہینڈل

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دووازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرہ ایکٹو طور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں

پل رہا تھا اس کی تکلیف نے خود میری نظر میں مجھے پراسرار بنا دیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرہ نمبر ۲۱۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھنگے سے دووازے کا ہینڈل

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دووازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرہ ایکٹو طور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں

پل رہا تھا اس کی تکلیف نے خود میری نظر میں مجھے پراسرار بنا دیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرہ نمبر ۲۱۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھنگے سے دووازے کا ہینڈل

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دووازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرہ ایکٹو طور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں

پل رہا تھا اس کی تکلیف نے خود میری نظر میں مجھے پراسرار بنا دیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرہ نمبر ۲۱۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھنگے سے دووازے کا ہینڈل

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دووازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرہ ایکٹو طور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں

پل رہا تھا اس کی تکلیف نے خود میری نظر میں مجھے پراسرار بنا دیا تھا۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرہ نمبر ۲۱۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھنگے سے دووازے کا ہینڈل

کاغذات کو فور سے دیکھا۔ سیدہ ان کے ماتھے پر پہنچنے لگا۔  
کاغذات ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں  
سے اپنے دل کو تھاما۔ میرا تیر نشانے پر لگ چکا تھا۔ میں نے اکثر  
کو اطلاع کی۔

رات کی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر فوراً حاضر ہوا۔ معائنے کے بعد  
ثابت ہو گیا کہ ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر  
ضروری تدابیر کرتا، سینہ صاحب کی روح قفسِ مغربی سے پرواز  
کر گئی۔

سوت کی باقاعدہ تصدیق ہونے کے بعد رات ہی کو میرا ان  
کی میت لے کر گھر آیا۔

سینہ صاحب جب تک زندہ رہے نوکروں کے ساتھ بڑی  
نرم دلی سے پیش آئے اور ان کے اس رویے کی وجہ سے نوکران  
پر جان چھڑکتے تھے۔ سینہ صاحب کی اچانک موت نے نوکروں کو  
بہ حواس کھڑا کیا تھا۔ میت گھر پہنچنے ہی کرام برہا ہو گیا۔ تمام نوکروں  
نے دودھ کو گھی کو سر پر اٹھالیا۔ بیگم صاحبہ لاکھ نیم پانچل سہی  
تھیں تو ایک مشقی عورت ہی نا۔ یا تو زندگی بھر انہوں نے سینہ  
صاحب سے سیدھے منہ بات نہ کی یا اب یہ حال تھا کہ سینہ  
صاحب کی میت کے سرہانے بیٹھے بیٹھے رات آنکھوں میں  
گزاردی 'چوڑیاں توڑ دیں' ہال نکھیر لئے۔ اس تمام صورت  
حال میں 'میں واحد آدمی تھا جو نہایت مطمئن تھا' جس کی ہر حال  
کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی تھی لیکن میں اپنے اطمینان دلی سے  
کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے مصنوعی غم کی  
غلاب اپنے چہرے پر وقتی طور پر اوڑھ لی تھی۔ ساتھ ساتھ  
نوکروں کو تسلی بھی دینا چاہتا تھا اور تسلی بھی اس بیان کے ساتھ  
کہ "بس خاموش ہو جاؤ" میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ہوا ہے  
تمہاری حالت دیکھ کر میرے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ جائے گا"  
مگر تو کماں مانتے والے تھے۔ پتہ تو انہیں سینہ صاحب سے  
محبت تھی اور پتہ مجھے خوش کرنے کے لئے اس طرح بھوں بھوں  
کرنے روئے پلے جا رہے تھے کہ میری طبیعت الجھنے لگی۔ میں  
سوچنے لگا کہ اگر رات بھر یہ لوگ اسی طرح کمرے میں موجود  
رہے تو میں تو آرام کر چکا۔ ان مردوں کی وجہ سے مجھے منہ بسور  
کر بیٹھا رہنا پڑے گا۔

آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا 'میں نوکروں سے مخاطب ہوا' کیا  
تم نے نہیں سنا کہ اس طرح رونے سے مردے کو سخت اذیت  
ہوتی ہے اور کیا تم یہ چاہو گے کہ تمہارے سینہ صاحب کو مرنے  
کے بعد تمہاری ذات سے تکلیف پہنچے۔ اگر رونا ہی ہے تو  
دوسرے کمرے میں جا کر سوئے جاؤ۔ چلو 'سینہ صاحب کو تنہا  
پھوڑو۔"

تمام نوکر روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے  
میں سینہ صاحب کی میت کے ساتھ میں رہ گیا تھا یا سرہانے بیٹھی

ہوئی بیگم صاحبہ۔ اب بیگم صاحبہ کے آنسو ٹپک ہو گئے تھے۔  
اپنے آپ سے بے خبر ہوئی پھٹی آنکھوں سے اپنے سناگ کوئی بھر  
کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے بھرائے ہوئے ہمت دیر  
ہو گئی تھی۔ نوکروں کے جانے کے بعد میں نے کمرے کو اندر سے  
بند کیا اور خوب ہی بھر کر ہنسا۔ بیگم صاحبہ اب لاش کے بجائے  
مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی ہوں گی لو 'ایک پانچل کا اور  
اضافہ ہوا۔ مجھے اس وقت بے چاری بڑھاپا پر بڑا ترس آیا مگر بے  
درد بنے رہنے ہی میں عافیت تھی۔ ظلم کا بازار گرم کئے رہنے ہی  
میں میری نجات تھی۔ میں نے بیگم صاحبہ کے شانوں کو تپستیا تے  
ہوئے کہا "تمہارے سر تاج روٹھ گئے ہیں۔ مہلو مگر تھوڑا  
میری نیند نہ خراب ہو' میں سونے جا رہا ہوں" بیگم صاحبہ نے  
زخمی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سر جھکالیا۔ میں اپنے کمرے میں  
جانے کے لئے دوسرے دروازے سے نکل گیا۔

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے ہمت تھک گیا تھا۔ اسوفا مجھے  
بستر پر لیتے ہی نیند کی آغوش میں چلے جانا چاہئے تھا ویسے بھی میں  
نیند کا بہت کچا تھا۔ لیکن خلاف توقع ایسا نہ ہوسکا۔ تقریباً تین  
بجے میں اپنے کمرے میں آیا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے بستر تک  
آتے آتے ساڑھے تین بج گئے ہوں گے مگر نیند مجھ سے روٹھی  
ہوئی تھی۔ کدوٹ بدلتے بدلتے دن نکل آیا۔

کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر بے چارے تھک ہار کے  
سو گئے تھے حتیٰ کہ بوڑھا مضافی بھی آج فجر کی نماز کے لئے شاید  
انٹنا ہی بھول گیا تھا۔ میں اس طرح ہزبڑا کر اٹھا جیسے مجھے کچھ یاد  
آ گیا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ رات ہی سینہ صاحب کا انتقال ہوا ہے۔  
ان کی لاش ان کے کمرے میں پڑی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ان  
کی موت کا ذمے دار میں ہوں لیکن اس تصور سے میں نے اتفاق  
نہیں کیا 'ہر شخص اپنی موت کا ذمے دار خود ہوتا ہے' میں نے  
سوچا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے کے تاثرات  
کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا شیو بڑھا ہوا تھا رات بھر  
کی جگہ سے آنکھیں انکارے کی طرح کلال ہو رہی تھیں "عیدِ عزا  
آج شیو مت بنا نا" سرخ آنکھیں اور بڑھا ہوا شیو تیرے ہمت  
کام آئے گا آخر تو سینہ صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے "انعام تو تجھے  
ہونا ہی چاہئے" منہ پر اٹکے سیدھے چھپا کے مار کر میں غسل  
خانے سے باہر نکل آیا۔ سینہ صاحب کے قریبی دوستوں اور دفتر  
دالوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دینے کے بعد میں سینہ صاحب کے  
کمرے میں پہنچا۔ بیگم صاحبہ 'سینہ صاحب کا سر اپنے زانو پر  
رکھے بیٹھی تھیں' ان کی پیٹھ میری طرف تھی "پانچل بیویوں کا بھی  
تو فائدہ ہے" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میری  
آواز پر بیگم صاحبہ نے چوکھ کر دیکھا اور سر جھکالیا۔

اب کوٹھی میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے  
نوکر بھی جاگ گئے تھے۔ انہوں نے ذرا تنگ روم کا سامان

نکل کر چائے کا قرش پھاڑا تھا۔ اگر تیاں بھی جلادی گئی تھیں۔ کسی نے قریب کی مسجد سے پیارے بھی لگا کر رکھ دئے تھے۔ پڑوس کے کچھ نوکر اور ان کے بچے پیارے بڑھ رہے تھے۔ صاحب لوگ ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے اس لئے نہیں بچے تھے لیکن نکلنے والی دیر میں قریب کھڑے والے آنا شروع ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے سفید مہال سر پر رکھا اور پیارے پڑوس میں مصروف ہو گیا۔ دو نوکروں کو قبرستان کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ مہال صبح ہی سے آکر بیٹھ گیا تھا۔ اب مجھے دفتر والوں کا انتظار تھا۔ اسٹاف کے لوگ آجائیں تو میری جان چھوٹ جائے۔ لیبر صاحب سب کچھ خود سنبھال لیں گے اور واقعی لیبر صاحب کے آنے کے بعد میری جان چھوٹ گئی۔ انہوں نے آتے ہی لان میں شامیانہ لگا کر کرسیاں ڈلوادیں۔ دفتر کے لوگوں نے مجھے ایک طرف بٹھلایا کہ "سر آپ بیٹھیں ہم سب کچھ سنبھال لیں گے" اور انہوں نے واقعی سب کچھ سنبھال لیا۔

دوسرے پہلے پہلے سینہ صاحب اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ محلے کی دوسری بیگمات نے بیگم صاحبہ کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ ان کا پاگل پن نہ جانے کیا کر بیٹھتا مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ وہ سینہ صاحب سے کتنی محبت کرتی تھیں۔

سینہ صاحب کو دلانے کے بعد میں دفتر کے بعض لوگ اور چند تجارتی خوشامدی گھر واپس آئے تو نئی مصیبت میرا راستہ تنگ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ پر شدید دودھ پڑا تھا۔ عورتوں نے ایک توہ نوکر کی مدد سے انہیں رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ ان کے منہ سے کھب جاری تھا وہ چیخ چیخ کر مجھے کوس رہی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کیا وہ ان کا فیلٹی ڈاکٹر تھا ان کے مرض کو پہ پہلے سمجھتا تھا۔ اس نے نیند کے انجکشن کے ذریعے انہیں سلا دیا۔

دقیقی طور پر تو یہ خلو عمل کیا تھا لیکن ہوش میں آتے ہی انہوں نے اپنی زبان پھر کھولی تو نہ جانے کون کون سے راز ہوں جو ان کے علم میں ہوں۔ اور اگر وہ زبان پر آگئے تو یہ بڑھیا میرا جینا خراب کر دے گی میں سوچ میں پڑ گیا۔

سینہ صاحب کا عزیز رشتے دار شاید کوئی تعامی نہیں۔ بیگم صاحبہ بھی غالباً میری طرح اکیلی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کے رشتے دار کو نہ میں نے سینہ صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا نہ مرنے کے بعد کوئی آیا۔ دوست احباب دو چار دن آتے جاتے رہے پھر سنا پھر تھائی۔

بیگم صاحبہ کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی سینہ صاحبہ کی موت نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ وہ پھر سے پاگل پن کے سمت قریب پہنچی جاتی تھیں۔ نوکر چاکران کی طلبہ امی میں دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ اگر یہ اسی طرح ان کا دل بھلاتے اور خدمت کرتے رہے ان کی دوا دارو کا خیال کرتے رہے تو بڑھیا پاگل ہونے سے رہی۔ ہوش مند مگر کن کی

موجودگی میں مجھے اپنے پانچ بچوں اور آمد میں جتنی دشواری پیش آسکتی تھی اسے میں جانتا تھا۔ میں نے نوکروں کو لٹکالے لگانے کا ارادہ کر لیا بلکہ مجھے ہر اس توہی کو خود سے دور رکھنا تھا جو سینہ صاحب کا حق تک ادا کرنے کے خطہ میں جلا ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے محض ایک حکم کے ذریعے تمام نوکروں سے ان کی روزی چھین لی۔ ان میں سے بعض بہت روئے بوئے تڑپے لیکن میں نے ان پر واضح کر دیا کہ "میرا کام بغیر نوکروں کے چل سکتا ہے" میں تمہیں محض اس لئے برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مرحوم کی نشانیاں ہو۔"

میں نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ انہیں ایک ایک ماہ کی تنخواہ ادا کر کے رخصت کیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد بہت جلد میں نے دو ملازم رکھ لئے۔ یہ ملازم تھے مجھے اپنا مالک سمجھتے تھے تو ان سے کوئی خطہ نہیں تھا۔

سینہ صاحب کی چٹکری ہیڈ آفس اور ٹکٹ برانچ میں بھی میں نے چھاننی کے اس عمل کو دہرایا۔ جہاں بھی کسی ملازم کو سینہ صاحب کے گن گاتے دیکھا اسے گھر کی راہ دکھائی اس کام میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ ہمارے معاشرے میں ابن الوقت بہت مل جاتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ بہ آسانی مل گئے جو محض میری خوشنودی اور اپنے نمبر پوچھانے کے لئے جاسوسی کے فرائض نعت انجام دینے لگے۔ میں نے انہی اطلاعات کو بنیاد بنا کر اپنے راستے کے پتھروں کو ہٹا کر راست ہموار کر لیا۔ محض ایک مہینے کی قلیل مدت میں تمام دفاتر میں میرا سکہ چلنے لگا۔

بیگم صاحبہ ابھی تک اپنے ہوش و حواس میں تھیں بلکہ اب تو وہ میرے اقدامات پر دہلی زبان میں احتجاج بھی کرنے لگی تھیں۔ اور تو اور ان کا ایک بھانجا بھی کہیں سے برآمد ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ قانونی کارروائی بھی کریں۔ دنیا کو معلوم تھا کہ میں سینہ صاحب کا حقیقی بیٹا نہیں۔ بیگم صاحبہ بہر حال سینہ صاحب کی قانونی بیوی تھیں۔ سینہ صاحب نے لاکھ میرے نام جائداد منتقل کر دی ہو لیکن عدالت بیگم صاحبہ کو ان کا حق دلا سکتی تھی پھر یہ کہ میں بیگم صاحبہ کی موجودگی میں اگر اس جائداد کو فروخت کرنا چاہتا تو کیسے کر سکتا تھا؟ ان سب باتوں کا ایک ہی حل تھا کہ بیگم صاحبہ کو کسی طرح یا تو پاگل کر دیا جائے یا پاگل قرار دے دیا جائے۔ میں نے دونوں امکانات پر کام شروع کر دیا۔

ان انیسویں پر عمل کرنے کے لئے ڈاکٹر کو احکام میں لینا ضروری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ کا فیلٹی ڈاکٹر اس قسم کا آدمی ہے جو ایمانداری کو اپنا پیشہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس کو شیٹے میں اتارنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لئے میں نے کسی ہنر سمجھا کہ سینہ صاحب کے دوسرے وقاداروں کی طرح

اسے بھی بیگم صاحبہ سے دور کر دیا جائے مگر اس طرح کہ اسے لگ نہ گزے اور اس کے لئے بیگم صاحبہ کو احد میں لینا ضروری تھا۔

بیگم صاحبہ مجھ سے بہت بدگمان تھیں مگر میں ایک گھاگ! میں نے ان کی موجودہ کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے ان کے نو دماغ بھانجے سے راہ دور سمیٹا کر لی۔ پہلے زدہ کم کم آتا تھا۔ اور عموماً اس وقت جب میں گھر نہ ہوتا لیکن اب میرا خوف اس کے دل سے نکل گیا بلکہ دوستانہ فضا قائم ہو گئی۔ میں نے مختلف طریقوں سے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ بیگم صاحبہ مجھ سے محض اس لئے نفرت کرتی ہیں کہ میں ان کا سا بیٹا نہیں، ان کے بہن سے پیدا نہیں ہوا۔ اس میں کچھ ان کی ذہنی حالت کا بھی قصور ہے جبکہ میں ان کو اپنی سگی ماں سمجھتا ہوں۔ ہا جا نداد و کا دبار کا مسئلہ۔ یہ سب کچھ خود بیگم صاحبہ نے میرے نام کر دیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے قبول کر لیا کہ میں اپنی صلاحیتوں سے اس دولت میں اضافہ کر سکتا ہوں۔ اگر بیگم صاحبہ مجھ پر بھروسہ کریں، مجھے اپنی محبت سے نوازیں تو یہ دولت ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ وہ حکم دیں تو آج میں یہ دولت ان کے نام کرنے کو تیار ہوں۔ اور میں ایسا ان کے کئے بغیر ہی کر دیتا لیکن ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ بس ذرا ان کا علاج عمل ہو جائے، یہ فریضہ بھی میں انجام دے لوں گا۔

میں نے اس سے کہا "اب تم ایک کام کرو، کسی طرح بیگم صاحبہ کا دل میری طرف سے صاف کر دو۔ مزید یہ کہ بیگم صاحبہ کے علاج پر ہم دونوں مل کر توجہ دیں۔ وہ اپنے علاج کی طرف سے بڑی بے پروا رہتی ہیں۔"

ان کا بھانجا جس کا نام میں آپ کو بتانا بھول گیا، راشد تھا، میری باتوں میں بڑی آسانی سے آگیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔

میری اس گفتگو کا اثر دو چار دن میں ظاہر ہونے لگا۔ بیگم صاحبہ راشد پر بہت بھروسہ کرنے لگی تھیں۔ جب انہوں نے راشد کی زبانی میری تعریف سنی تو ان کے دل پہلے میں چک آگئی۔ ان کی آنکھوں میں موجود نفرت کی چنگاریاں دم توڑنے لگیں۔ اب وہ میرے سلام کا جواب دینے لگیں۔ میں ان کی خیریت دریافت کرتے ہوئے مسکراتا تو وہ بھی جوابی تبسم سے میرا استقبال کرتیں۔ ہفتے بھر کی خاموش محبت کے بعد ہم دونوں ماں بیٹوں کی طرح کھل مل گئے، خوشی کا یہ موسم بیگم صاحبہ کو بہت راس آتا۔ ان کی صحت تیزی سے بحال ہونا شروع ہو گئی۔ ان کے ہنستہ وار چہکے کے لئے ڈاکٹر آیا تو ان کی سنبھلتی ہوئی حالت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"تم نے انہیں اتنی محبت دی ہے کہ یہ اپنا غم بھول گئی ہیں۔ تم ملائی مبارک باد ہو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ان کے سامنے

بیگم صاحبہ کا تذکرہ کم سے کم ہو ورنہ یہ دوبارہ تصوراتی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گی" ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیا۔

میں جس منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب تھا اور اب پریشان ہونے لگا تھا، ڈاکٹر کے ایک جیلے نے مجھے وہ راستہ بٹھا دیا۔ بیگم صاحبہ کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ بیگم صاحبہ کو اس حالت پر پہنچا سکتا تھا جس کا میں حتمی تھا۔

میں نے بیگم صاحبہ کا قبر آدم پور ٹریٹ ہسپتال میں بیگم صاحبہ کے کمرے میں رکھوایا۔ اس کے علاوہ بھی چند چھوٹی تصویروں کے فریم ان کے کمرے میں ادھر ادھر لگوا دیئے۔ بیگم صاحبہ کا بیٹا اور کپڑوں کی الماری بھی ان کے کمرے میں پہنچا دی۔ میں ہتھی دیر بیگم صاحبہ کے پاس رہتا کسی نہ کسی بہانے سے بیگم صاحبہ ہی کا ذکر کرتا رہتا۔ کبھی ان کی تعریف کرتا، کبھی دبے لفظوں میں ان مظالم کا ذکر کرتا جو انہوں نے بیگم صاحبہ کے ساتھ کیا۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ ان باتوں پر کھسکا کر رہ جاتیں۔ ان کی آنکھوں میں پڑھائیاں ہی تیرنے لگتیں۔

بیگم صاحبہ میری تعمیر کردہ پراسرار فضا کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہ کر سکیں۔ مستقل بیماری نے ان کے اعصاب کو بہت شکست کر دیا تھا۔ وہ ان نفسیاتی چوٹوں سے بلبلا کر رہ گئیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگیں، اکثر تنہائی میں خود سے باتیں کرنا ان کا مشغلہ بن گیا۔ میرے لئے یہ ایک اچھی علامت تھی، میں نے اپنی صم کو اور تیز کر دیا۔

ایک رات بیگم صاحبہ کی پیٹوں نے تمام کوٹھی کو سر پر اٹھالیا۔ میں دوڑ کر ان کے کمرے میں پہنچا۔ کرا اندر سے بند تھا۔ ایک نوکر کو میں نے مددگار کی مدد سے کمرے کے اندر بھیجا۔ دروازہ کھلنے کے بعد میں اندر داخل ہوا۔ بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ کی تصویر کے سامنے دوڑا نوٹھی ہوئی تھیں۔ ہڈیاں چلیں ان کے ہونٹوں سے بلند ہو رہی تھیں۔ ان کے ماتھے سے خون بہ رہا تھا۔ نہ جانے کس وقت انہوں نے کسی چیز سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نوکروں کی مدد سے ان پر قابو پایا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لاکر صوفے کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ مسلسل کبھی اپنے آپ کو، کبھی بیگم صاحبہ کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا۔ گویا یہ دورہ سابقہ دوروں کی بہ نسبت زیادہ شدید تھا۔ اب وہ نیم پاگل نہیں کھل پاگل لگ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کو بچان ہی نہ رہی ہوں۔ میں نے ان کے نیلی ڈاکٹر کو بلائے سے پہلے ضروری سمجھا کہ ان کے کمرے کو پہلے والی حالت پر لے آؤں تاکہ ڈاکٹر صاحبہ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ نوکروں کی مدد سے میں نے بیگم صاحبہ کی تصویریں اور ان کا بیڈ وغیرہ نکلوا دیا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ بخوبی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔

بیگم صاحبہ ابھی تک ہڈیاں بک رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے ان کے زخم پر پٹی باندھنے کے بعد تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا "عید محمد صاحبہ میں پچھلے معانے کے بعد بہت خوش تھا۔ ان کی حالت بہت تیزی سے سنبھل رہی تھی۔ مگر اس وقت تو میں ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے لیکن کچھ ہے ضرور۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج کل میں ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ شاید میں اس کی روشنی میں کوئی علاج تجویز کر سکوں۔"

"ڈاکٹر صاحبہ مجھے یاد نہیں کہ کوئی بات ہوئی ہو کھانا کھانے کے بعد اچھی خاصی اپنے کمرے میں نہیں بیٹھے خدا حافظ کہا۔ بس ڈیزہ روکھنے بعد۔"

"بہر حال۔ میں بلڈ پریشر چیک کرتا ہوں" ڈاکٹر صاحبہ بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کون ہے تو قصائی کہیں کے، آخ تھو" بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر پر تھوک دیا۔ میری ہنسی نکلنے نکلنے رہ گئی۔ ڈاکٹر صاحبہ کو یہ توقع نہیں تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"عید محمد صاحبہ! ان کی حالت تو میرے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔ آپ ایسا کریں ان کے چہرے کو رومال سے زحانپ دیں تاکہ یہ دوبارہ تھوکنے والی حرکت کا اعادہ نہ کر سکیں۔ میں ان کو ایک انجکشن دیتا ہوں۔ یہ انجکشن انہیں سوجھنے کے لئے مسلا دے گا۔ اگر بیدار ہونے کے بعد بھی ان کی یہی حالت رہتی ہے تو پھر معاف کیجئے گا، ان کو دماغی اسپتال میں داخل کرانا ہوگا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو معلوم ہے، یہ صرف میری ماں ہی نہیں میری محسنہ بھی ہیں۔ میرے عظیم محسن کی واحد نشانی" میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز! حوصلہ کیجئے شاید یہ سب کچھ نہ ہو۔ آپ یہ انجکشن تو مجھے دینے دیں" ڈاکٹر صاحبہ نے میرے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی" میں نے رومال لے کر پوری طاقت سے بیگم صاحبہ کے منہ کو دبوچ لیا۔ ڈاکٹر صاحبہ تیار ہی تھے۔ انہوں نے انجکشن لگا دیا۔ بیگم صاحبہ بہت تڑپیں لیکن منہ میں لے منہ چھوڑا نہ ڈاکٹر صاحبہ نے بازو۔

"جب ان پر غنودگی طاری ہو جائے تو انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دیجئے گا اور جب تک یہ خود نہ اٹھ جائیں انہیں اٹھائیے گا نہیں۔ اگر انہیں پڑ سکون نیند نہ آتی یا وقت سے پہلے انہیں اٹھا دیا گیا تو حالت مزید بگڑ سکتی ہے" ڈاکٹر صاحبہ یہ ہدایات دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحبہ کے جانے کے بعد میں نے نوکروں کی مدد سے

بیگم صاحبہ کو ان کے بستر پہنچا دیا۔ میں ان کے کمرے ہی میں ٹھہر گیا۔ نوکروں کے جانے کے بعد میں نے اپنی اسکیم پر عمل شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پڑ سکون نیند ان کا علاج ہے لہذا انہیں نیند سے دور رکھنا اب میری ذمہ داری بن گئی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر بیگم صاحبہ کو چھینچوڑا۔ ان کا پورا جسم ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ میرے چھینچوڑنے کا ان پر قطعی اثر نہ ہوا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ میں نے قریب رکھے ہوئے جگ سے پانی لے کر ان کے چہرے پر چھڑکا۔ وہ کسمائیں اور پھر سو گئیں۔ میں نے پھر چھینچوڑا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں، پھر سو گئیں۔ غرض کہ میں انہیں چھینچوڑتا، جگاتا رہا۔ وہ جاگتی، سوئی رہیں۔ یہاں تک کہ رات بیٹ گئی۔

صبح ۸ بجے کے قریب انہوں نے ایک زوردار چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اچھی نگاہوں سے مجھے گھورا۔ دھمکیاں دیتے ہوئے ملکہ عالیہ کی خواب گاہ میں آنے کی "وہ دہاڑیں۔"

میں سچ ڈر گیا۔ میں نے گھبرا کر نوکروں کو بلانے کی گھنٹی بجائی، تھوڑی دیر میں تمام نوکر کمرے میں موجود تھے۔

بیگم صاحبہ نے کمرے میں رکھی مختلف چیزوں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ نوکروں نے بہ دقت تمام انہیں رستوں میں جکڑ دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کو ٹیلی فون پر اطلاع دی "آپ کا علاج ناکام ہو گیا۔ جلدی آئیے بیگم صاحبہ کی حالت بہت خراب ہے۔"

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ اسے کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے بیگم صاحبہ پر نظر ڈالتے ہی مجھ سے کہا۔ "انہیں گدو بندر لے جانا پڑے گا۔ آپ گاڑی نکلوائیے، جلدی کیجئے۔"

ڈرائیور نے گاڑی نکالی۔ اس وقت تک راشد بھی آچکا تھا۔ میں نے سوچا، یہ بھی اچھا ہوا۔ اب وہ اسے میری سازش نہیں، ڈاکٹر صاحبہ کی تجویز سمجھ کر مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی خال کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

بیگم صاحبہ کے ہاتھ پاؤں باہر کر انہیں گاڑی میں بٹھایا گیا، ان کے ساتھ ڈاکٹر اور راشد بیٹھ گئے، اگلی سیٹ میں نے سنبھالی۔ اب ہماری گاڑی ڈیفنس سوسائٹی سے گدو بندر کے لئے روانہ ہوئی۔ بیگم صاحبہ راستے بھر قہقہے لگاتی رہیں یا پھر وقفے وقفے سے مجھے اور سیٹھ صاحبہ کو گالیاں کھتی رہیں۔ گاڑی میں ان کے علاوہ کوئی نہیں بول رہا تھا۔ ڈرائیور پوری رفتار سے گاڑی کو بھاگا رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ، انہیں اندازاً کتنے دن پاگل خانے میں رہنا پڑے گا؟" میں نے خاموشی کو توڑا۔

"اس وقت کیا کہا جاسکتا ہے۔ شاید ماحول کی تبدیلی ان کے لئے خوش گوار ثابت ہو۔ ویسے مدت کے بارے میں اس وقت

”دنیا کچھ بھی کے جو میں کتا ہوں وہی سمجھے۔ ماضی کی جرح کو ان کے ذہن سے لٹا دیا ہوگا۔ جب تک علاج مکمل نہیں ہو جاتا، آپ میں سے کسی کا ان کے سامنے آنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر اولیس نے قطعیت سے کہا۔

”ہم ان کی صحت کے لئے اپنے دل پر چھوڑ دے گئے ہیں۔“ ڈاکٹر اولیس کا کتا مانتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو“ ڈاکٹر نے شکر یہ ادا کر کے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

راشد میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے دندیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ اس فیصلے سے خوش نہیں تھا لیکن کر کیا سکتا تھا۔ میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اسے مخاطب کیا ”راشد! دیری سو رہی تمہاری حال اتنے دن بعد میں بھی تو اب یہ افتاد آن پڑی وہ پھر چھڑ گئیں مگر مجھے اختیار میں کیا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ دعا کرو وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں تو اب چلیں۔“

راشد کو بالکل چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا... خاموشی سے قدم اٹھاتا ہوا گاڑی کی طرف چل دیا۔ اسے جاتا دیکھ کر میں اور میرا فیلی ڈاکٹر بھی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ذرا سیر کرنے کا زرا اشارت کی۔

اب بظاہر میرے لئے میدان صاف تھا۔ تمام کام بخیر و خوبی انجام پانچکے تھے۔ راشد کی طرف سے معمولی سا خلوص تھا مگر مجھے وہ ایسا آوی نہیں لگا جو کوئی مشکل کھڑی کر سکتا۔ وہ بیگم صاحبہ کی شہرہ پر تو کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا لیکن اکیلے اس کے بس میں کچھ بگڑتا تھا۔

میں اپنے نام اور خاندان کی طرف سے بڑی احساس کتبی تھی جلا رہتا تھا، میرے نام ہی سے فقیر ہونا ظاہر ہوتا تھا۔

عیدونہ سسی عید محمد سسی۔ اس نام کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں زیادہ دور تک چلنا مجھے گوارا نہ تھا۔ جب بھی کوئی مجھے عید محمد کہہ کر پکارتا، میرے دل پر گھونسا سا لگتا، میں اپنی ننگوں میں گر جاتا... مجھے وہ عیدو یاد آجاتا تھا جو اپنی ماں کی انگی تمام کر گئی تھی صد اگا کر ایک ایک پیسہ جمع کرتا تھا۔ میں ماضی کی ان گھنیا یادوں کو صفحہ ذہن سے حرفِ ظلم کی طرح مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔ اب تک کے بکھیروں نے اس طرف سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اب ذرا فرصت ملی تو خیال آیا کہ کوئی ایسا نام اختیار کیا جائے جس کے ساتھ سینٹھ کے لفظ کا سبوت بھی اچھا لگے اور اس نام کے ذریعے کسی اچھی نسل کا اظہار بھی ہوتا ہو۔ یہ نہایت بچکانہ اور بھونڈی خواہش تھی لیکن تھی تو خواہش ہی تا۔ اور خواہشات کی تکمیل کا ہر جتنے خوب آتا تھا۔ ذرا سے غور کے بعد میں نے اپنا نام ٹھیک علی خاں تجویز کر لیا۔ اس نام سے میرا پٹھان ہونا بھی ظاہر ہوتا تھا جو میرے نزدیک سید کے بعد دوسری اعلیٰ ذات ہے۔

کچھ کتا لا حاصل ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر چپ ساہو لی۔ میں نے بھی رقت گزاری کے لئے باہر سڑک پر نظریں بھاری اور آئندہ پیش آنے والے وقت کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔ کون جان سکتا تھا میں اسی وقت کیا سوچ رہا تھا۔

گاڑی پاگل خانے کی حدود میں داخل ہوئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ گاڑی ایک جھکے سے رک گئی۔

”آپ کو تو پسینے آ رہے ہیں؟ آپ اتنے نزدیکیوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا“ ڈاکٹر صاحب نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں بھی گاڑی سے باہر آ گیا۔

”آپ یہاں کھڑی ہیں؟ میرا ایک واقعہ کار ڈاکٹر ہے اس سے مل کر میں ابھی آتا ہوں“ ڈاکٹر صاحب نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے دست ڈاکٹر کے ساتھ واپس آئے۔

”یہ ہیں ڈاکٹر اولیس“ ڈاکٹر صاحب نے ان کا تعارف کرایا۔ ”اور آپ ہیں مسٹر عید محمد۔“

ڈاکٹر اولیس کے ساتھ انتظامیہ کے چند افراد اور اسٹریچر بھی تھا۔ ان افراد نے بیگم صاحبہ کو بڑی بے دردی سے باہر کھینچا۔ اسٹریچر لٹا کر باندھا اور تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم تمام افراد برآمدے ہی میں کھڑے ہو گئے۔

دو سیر تک مختلف مشینوں کے ذریعے بیگم صاحبہ کا چیک اپ ہوتا رہا۔ نہایت غور و خوض کے بعد ڈاکٹروں کے پورے مشل نے حنفیہ طور پر بیگم صاحبہ کو خطرناک پاگل قرار دے دیا۔ ڈاکٹر اولیس نے نہایت تأسف سے مجھے یہ خبر سنائی اور ساتھ ہی یہ آیات بھی دیں۔

”کھل علاج تک بیگم صاحبہ کا پاگل خانے میں رہنا نہایت ضروری ہے۔ ان کے علاج میں کم سے کم چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ لگ سکتا ہے لیکن اس عرصے میں آپ کو ایک قربانی دینی ہوگی“ ڈاکٹر اولیس نے میری طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

”قربانی! کیسی قربانی؟“ میں نے پوچھا۔ ”جتنے عرصے بیگم صاحبہ یہاں داخل رہیں گی، آپ سمیت ان کا کوئی رشتے دار ان سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا“ ڈاکٹر اولیس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ تو بہت مشکل ہے۔ کم از کم مجھے تو اجازت ہونی چاہئے۔ دنیا کیا کہے گی! شاید آپ کو معلوم نہیں، یہ میری سگی ماں نہیں ہیں۔ دنیا تو یہی کہے گی تاکہ سوئیل ماں کو اسپتال میں ڈال کر بھول گئے، ملنے تک نہیں جانتے“ میں نے کہا۔

میرے کہ سید صاحب کا نام پر کہ علی خاں تھا اور میرے تعلیمی کاغذات وغیرہ میں طلعت انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اب صرف نام کو تبدیل کرانے کا مسئلہ تھا۔ گاہر ہے طلعت تو تبدیل کرانے سے بنا۔ میں نے اخبارات کے ذریعے مشترکہ کر دیا کہ آئندہ سے مجھے فلیب علی خاں ولد برکت علی خاں لکھا اور پکارا جائے۔ دو دنوں پر گئی سید برکت علی کی سختی بھی اتنا کر اپنے نام کی سختی گوارا کی۔

ان چند ضروری کاموں سے نکلنے کے بعد میں کاروبار کی طرف توجہ ہوا۔ میرا عقیدہ ہے کہ کاروبار وہ کہ جس کا تجربہ ہو، کارندے ایسے تلاش کرو جن پر بھروسہ نہ ہو، اکثر بھروسے کے ہی لوگ دھوکا دیتے ہیں۔ سید صاحب چڑے کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ کہاں سے چڑے ملنے کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ اس کے علاوہ چڑے کی جینیں، پرس وغیرہ بنا کر باہر بھی بیچتے تھے۔ مجھے صرف اس معلوم تھا کہ یہ بہت منافع بخش کاروبار ہے۔ اس کاروبار کا تجربہ مجھے نہیں تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ روایتی سا کاروبار مجھے پسند بھی نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کاروبار کو یکدم ختم کیسے کیا جائے۔ اتنے بڑے اسٹاف کو بیروزگار کر کے میں کسی انتہائی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا لہذا میں سوچا کہ اس کاروبار کو بہت بہت ختم کیا جائے اور اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے زیادہ توجہ دوسرے کسی کاروبار پر دی جائے۔

میں نے ان فیکٹریوں کے کارکنوں کو نکال باہر کرنے کے بجائے انہی عہدوں پر اپنے مطلب کے آدمی بٹھا کر پابندیاں اتنی سخت کر دیں کہ کارکن خود نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور یوں یہ کاروبار سننے سننے قطعاً اختتام تک پہنچ جائے۔ اور پھر مجھے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ دو چیسے مل ہی رہے تھے۔

میں نے بچپن میں کچھ دن حاجی صاحب کے گیراج پر گزارے تھے، مجھے کاروں کی پہچان اور تجربہ تھا۔ اب میں دوبارہ تو کمینک بن نہیں سکتا تھا۔ میں نے گیراج کھولنے کے بجائے شر کے تین فیشن ایبل علاقوں میں کاروں کے شوروم کھول لئے، اس کے ساتھ ہی اسپر پارٹس کے کاروبار کی بھی داغ بیل ڈال دی۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں کاروں کے شوروم بہت۔ تھوڑے ہی دن میں میرا کاروبار چل نکلا۔ میرا اندازہ ایک مرتبہ پھر درست نکلا۔ میں نے چند مہینوں ہی میں ہزاروں لاکھ لاکھوں کمائے۔ اب میں سید فلیب علی خاں کہلانے لگا۔ تمام کاروبار ملے زموں نے سنبھال رکھا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مختلف شورومز پر گھس گمراہی اور وقت گزارنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ اس کام میں مزید تجربے کے بعد میں نے مختلف ماڈل کی کاروں کی ایجنسی بھی حاصل کر لی اور دفتر قائم کر کے فحاش سے ٹینک ڈائریکٹری کر سی سنبھال لی۔ یہ صاف ستھرا کاروبار میرے لئے آئندہ ثابت ہوا۔

میں اپنے بچپن میں پڑ کر بیگم صاحبہ کی جانب سے بے فکر ہو گیا تھا۔ ان کو اسپتال میں داخل ہونے ایک سال کا عمر گزر چکا تھا۔ تھوڑے دن تک ان کی حالت کے بارے میں ڈاکٹر ادھر سے ادھر آتے رہے۔ پھر شاید میری سوچا کہ بوجھ سے ان کو کھینک کر لایا گیا ہو گا۔ اب سال بھر گزر جانے کے بعد میرے ذہن میں اطمینان نے کوٹ لی۔ میں نے سوچا کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ بیگم صاحبہ کی دماغی حالت درست ہو گئی ہو اور وہ کسی دن گھر چلی آئیں۔ ویسے تو ایک کمزور بوڑھی عورت سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن خواہ مخواہ میں کسی الجھن میں کیوں پڑتا۔ میں نے سوچا۔ اب اس کا بھی انتقام کر لیا جائے۔

بیگم صاحبہ کی شخصیت دریافت کرنے میں ایک روز گدو بندر جا پہنچا۔ ڈاکٹر اویس کا تارہ ہو چکا تھا، ان کی جگہ اب کوئی ڈاکٹر نسیم تعینات تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کام کے آدمی لگے۔ انہوں نے مجھے عام سا آدمی سمجھ کر بے اہمیتائی برتی لیکن جیسے ہی ان کو میری حیثیت کا علم ہوا وہ خوشامد پر اتر آئے۔ ان کی یہ ذہنیت مجھے اچھی لگی۔ دولت کے لالچی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ یہ صاحبہ بھی آئندہ میرے بہت کام آئے۔ ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کی حالت بالکل ٹھیک تو نہیں کسی جا سکتی لیکن اب وہ خطرناک پاگلوں کی فرست میں شامل نہیں۔ کبھی کبھی وہ چنچے پن کا شکار ہو جاتی ہیں ورنہ عموماً ان کا موڈ خوش گوار رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ چند مہینوں میں بالکل ٹھیک ہو جائیں۔

ڈاکٹر نسیم نے مجھے یہ معلومات خوش خبری کے طور پر فراہم کیں لیکن میں تو تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جناب! اب ایسی خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس ہمارے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اپنے عزیزوں کو دیکھ کر اب ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔"

میں ڈاکٹر نسیم کے ساتھ بیگم صاحبہ کی ہیرک کی طرف روانہ ہوا۔ ہم مختلف کٹھنوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے زمانہ دارا میں داخل ہوئے۔ ایک کونٹری میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی کسی عورت کو دیکھ کر مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، یہ بیگم صاحبہ تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چڑے کا ایک ٹکڑا تھا جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو تھیں۔

"کیس سے ان کے ہاتھ یہ چڑے کا ٹکڑا لگ گیا ہے۔ نہ جانے اس سے ان کی کون سی یادیں وابستہ ہیں۔ اسے ہاتھ سے رکھتی ہی نہیں، تقریباً مینہ بھر سے یہ ہیں اور چڑے کا یہ ٹکڑا ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔"

جیسے ہی بیگم صاحبہ کی نگاہ مجھ پر پڑی، ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ کچھ دیر وہ مجھے خاموش آنکھوں سے دیکھتی رہیں پھر جیسے انہیں سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ پھٹ پڑیں تو



خاصہ فوجی معزز گھرانے کا دولت مند کنوارا تھا۔ میں کا دباوی  
مصروفیات میں گھرا ہوا پر عمدہ ضرورت تھا لیکن پتھرے کا قیدی پر عمدہ  
بھی آزادی کے لئے اپنے ہون کو تیلیوں سے نکراتا ضرور ہے۔  
مو کی آزادی عورت کی قید میں مضمر ہے۔ میری زندگی اس قید  
سے اب تک آزاد تھی۔ میں اپنی تماشاموں سے اکتانے لگا تھا۔  
.. میں نے شہر کے مختلف کلبوں کی رکنیت حاصل کر لی۔ ان کلبوں  
میں ہر طبقہ خیال کے رکنیں زادوں اور رکنیں زادوں سے میری  
ملاقاتیں رہنے لگیں۔ کچھ وقت کٹ جاتا دنیا کو دیکھنے کا موقع  
بھی ملتا۔ بہت سے کا دباوی مسائل بھی پیش آتے ہوتے۔

ان کلبوں کا رخ کرنے کے بعد میری شخصیت کا ایک اور  
رخ میرے سامنے آیا اور وہ یہ کہ خواتین کے لئے میری شخصیت  
میں ایک خاص کشش ہے۔ ہر عمر اور ہر قماش کی عورت مجھے  
اس نگاہ سے دیکھتی جس کا مطلب سمجھنا کسی مرد کے لئے کبھی  
دشوار نہیں ہوتا۔ اپنی اس مقبولیت نے مجھے ایک اور ہی ہوا سے  
آشنا کیا۔ مشہور ہے کہ عشق کرنے کے لئے بڑے دل ہی کی نہیں  
بڑے دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کا تو مجھے معلوم نہیں  
البتہ میں بڑے دماغ کا مالک ضرور ہوں جس کا ثبوت میری زندگی  
کی وہ گتیاں ہیں جنہیں میں نے چنگی بجاتے چل کر لیا۔

اس دور کے کئی شاندار معاشقے میری زندگی کا حاصل ہیں۔  
میں اس رنگ و بو کے سیلاب میں ڈوب کر عزت نہیں تو دولت  
ضرور گنوا بیٹھتا اگر زبیدہ میری زندگی میں نہ آئی ہوتی۔

زبیدہ کو میر نے پہلی بار اپنے شوروم میں رکھا تھا۔ میں کسی  
کام سے صبح ہی صبح شوروم پہنچ گیا۔ اپنے دفتر میں بیٹھا حساب  
کتاب میں مصروف تھا کہ نیلے رنگ کی مژدا میں ایک لڑکی وہاں  
پہنچی۔ میرے آنس کے سامنے کی دیوار شیشے کی تھی۔ وہاں سے وہ  
لڑکی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی وہ میرے سبیل میں سے کسی  
بات پر بحث کر رہی تھی۔ کبھی کسی گاڑی کا دروازہ کھول کر دیکھتی  
کبھی کسی کی باڈی ٹھونک بجا کر دیکھتی۔ دور سے اس کا درازہ  
اور چمکی چہرے پر خشمے میں بھی مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی  
تھی۔ میں نے ایک ملازم سے پوچھا "کون ہے یہ لڑکی؟"

"معلوم نہیں سر! تین دن ہو گئے ہیں اسے آتے ہوئے۔  
تمام گاڑیوں کی قیمت پوچھ چکی ہے 'لینا دنیا کچھ ہے نہیں۔ یا تو  
کوئی کنگلی ہے یا بس یونسی۔"

"ٹھٹ اپ! جاؤ اس سے کتنا آپ کو سینٹ صاحب بلا  
رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں وہ میرے کمرے میں تھی "فرمائیے کہاں  
ہیں آپ کے سینٹ صاحب؟"

"تشریف رکھئے۔ میں نے ہی زحمت دی ہے آپ کو۔"

"مگر وہ آپ کا ملازم تو کہہ رہا تھا کہ سینٹ صاحب بلا رہے  
ہیں۔"

آگیا میرے شوپرے کے قائل تو سمجھ رہا تھا کہ میں مر گئی۔ دیکھ! میں  
زمہ ہوں" میں گھبرا کر فوراً سلاخوں سے پیچھے ہٹ گیا۔ پاگل کا  
کیا بھوسا حملہ ہی کرے۔

"ویسے تو میرا بیٹا بھی تو ہے۔ آ میں میری بلا نہیں تو لے لوں  
کتنے دن بعد آیا ہے تو۔"

میں اٹکا کچا نہیں تھا کہ ان کے انس دام میں آجاتا۔ میرا اپنی  
جگہ سے ہلانگ نہیں۔

"آپنے ڈاکٹر صاحب ملیں۔ ان کی حالت تو جوں کی توں  
ہے۔"

میں ڈاکٹر کا انتظار کئے بغیر لیٹ آیا۔ مجھے جانا دیکھ کر ڈاکٹر  
بھی میرے ساتھ ہولیا۔ حکیم صاحبہ کی چلیں بہت دیر تک میرا  
تغائب کرتی رہیں۔

"یہ قائل والا کیا معاملہ ہے؟" ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر بیٹھے  
ہوئے پوچھا۔

"میں تو معاملہ ہے صاحب! شوہر کی وفات کے صدمے نے  
ان کا یہ حال کیا ہے۔ سمجھتی یہ ہیں کہ شاید میں نے علاج میں

کو تباہی برتی اور وہ میر گئے۔ لہذا ان کی نظر میں 'میں قائل ہوں۔'  
"اور یہ چڑے کے کھڑے کا سما بھی میری سمجھ میں نہیں

آیا۔ اسے بروقت ہاتھ میں کیوں رکھتی ہیں۔"  
"ان کے شوہر یعنی میرے والد چڑے کا کا دباؤ کرتے تھے

شاید انہی یادوں کو کیدلی رہتی ہیں اس چڑے کے کھڑے کے  
ذریعے۔"

"ہوں! ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔

"ویسے ڈاکٹر صاحب مجھے ان سے ہمدردی ہے اور مجھے ہی  
کیا ان سے توفیوں کو بھی ہمدردی ہوگی۔ لاکھوں میں کھیلنے والی

عورت کا آج کیا حال ہے لیکن اس ہمدردی کی علامت کہ اپنے گھر  
میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ معاشرے میں میرا ایک مقام

ہے ایک حیثیت ہے۔ میں انہیں لئے لئے کہاں پھروں گا۔ میں  
صاحب ثروت ہوں۔ ان پر پیسہ خرچ کر سکتا ہوں وقت اور

توانائی نہیں۔ آپ ان کو یہاں مستقل رکھنے کی صورت نکالئے  
میں ماہانہ ایک مناسب رقم آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ پہلی قسط حاضر

ہے۔"  
میں نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ڈاکٹر کی میز پر سجائے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کا حکم میرے لئے بہت تھا"  
ڈاکٹر نے لوٹوں کو میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔ ہر مہینے میرا آدمی آپ کے پاس آئے گا"  
ڈاکٹر مجھے چھوڑنے میری گاڑی تک آیا۔

☆☆☆

میں نے سخت محنت سے اپنا مستقبل آباد کیا تھا۔ اب میں

”جو چلتی بھی ہو اور سستی بھی ہو“ اس نے شانوں کو بھونکا  
 دیا۔

”تمام گاڑیاں آپ ہی کی ہیں کوئی سی بھی پسند کر لیں۔“  
 ”جی!“

”میرا مطلب ہے۔ یہ گاڑیاں گاؤں ہی کے لئے ہیں۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ سب کی سب میرے بحث سے باہر  
 ہیں۔“

”کتنی رقم خرچ کر سکتی ہیں آپ؟“  
 ”پچاس ہزار تک۔“

”آپ ایسا کیجئے کل بیچ دوں بچے تشریف لائے۔ میرے  
 پاس ایک گاڑی ہے۔ کل دیکھ لیجئے گا آپ کو پسند آئے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے جناب! کل سنی۔“

”کس نام سے یاد رکھوں میں آپ کو؟“ میں نے پھر وہی  
 سوال کیا۔

”زبیدہ زبیدہ خان“ وہ مسکرا دی۔

مجھے یاد نہیں کوئی دن میں نے اتنی بے چینی سے گزارا ہو  
 جیسا اس کے جانے کے بعد میں بہت مضبوط اعصاب کا آدمی  
 ہوں۔ بڑی سے بڑی پریشانی مجھ سے نکرا کر واپس پلٹ جاتی ہے  
 لیکن زبیدہ نے مجھے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی  
 آئیڈیل ہوتا ہے شاید میرا آئیڈیل زبیدہ تھی جو ہمارے جموں کے  
 کی طرح میرے دوران حیات میں آگئی تھی۔ میں فطرتاً لڑکیوں  
 میں دلچسپی لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ ذوقِ جمال کے اعتبار سے  
 بھی کوئی لڑکیوں لیکن حسب نسب کا بھوکا ہوں اور زبیدہ کے ماتھے پر  
 کوئی لیکر تھی جو اس کے اعلیٰ نسب ہونے کی پہچان تھی۔ وہ بھی  
 میری طرح خان تھی مگر میری اصلیت اس پر کھل ہی نہیں سکتی  
 تھی۔ میں اپنے ماسی کو دفن کر چکا تھا اور وہ میری خالہ زاد  
 شہزادی، ذہن کی اولاد، مشکل بدست اس کا میرا کیا جوڑا میں نے  
 نہایت دکھ سے سوچا اور آنکھوں میں رات بتا دی۔

دوسرے دن ٹھیک ڈس بجے میں شوروم پہنچ گیا۔ میں بے  
 چینی کے عالم میں تھا۔ کبھی سوچتا رہتا تھا کہ کبھی خیال گزرتا  
 نہیں آئے گی۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ نیلے رنگ کی مزدا شوروم  
 کی پارکنگ میں داخل ہوئی۔

وہ جب شان بے نیازی سے میرے آفس کی طرف آ رہی  
 تھی۔ شمالی رنگ پر گلابی پر۔ سوٹ و صپ میں شخص کی کرنیں  
 بکھیر رہا تھا۔ آنکھوں پر لگا کو گو پشہ اس نے ایک جھٹکے سے  
 غلامی آنکھوں سے الگ کیا۔ فضا میں آواز کارس کھولتی ہوئی  
 میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

”اسلام ٹیکم سینٹر صاحب!“

”وٹیکم۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اپنا نام بتا چکا  
 ہوں۔“

”سیٹھوں کے کیا سیٹھ ہوتے ہیں؟ کیا میں سیٹھ نہیں  
 ہو سکتا؟“

”اچھا! چلئے آپ ہی ہوں گے۔ اب فرمائیے کیا بات ہے؟“  
 ”ہاں یہ ہوئی نہ بات۔ میں نے سنا ہے کہ تم دن دن سے آپ  
 ملازموں کی جان کھاری ہیں۔“

”جان کھاری ہیں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ دکان ہے۔  
 دکان پر بھاؤ آتا تو تو تباہی ہے۔“

”بھاؤ آتا ضرور کیجئے لیکن کچھ خریدئے بھی تو۔“

”واہ صاحب واہ! پسند آئے نہ آئے کچھ خریدئے بھی تو“  
 اس نے تقریباً میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔

مجھے ذہن کی عمریں جاننے کا شوق ہے نہ تجربہ لیکن اس کی  
 شوخی بتا رہی تھی کہ اس نے نیا نیا کان چھوڑا ہے۔ بکار خریدنے  
 آئی ہے اور اکیلی یقیناً کسی بڑے گھر کی ہوگی لیکن ساہو لباس اور  
 سلیقے سے دوپٹا اوڑھنے کا انداز بتاتا ہے کہ اس کا تعلق کسی  
 شریف گھرانے سے ہے میں نے سوچا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟ کوئی اور تفتیش کرنی ہے یا مجھے  
 اجازت ہے؟“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے کہاں۔ میں نے کولڈ ڈرنک بھجائی ہے۔“

”دکانداری کا یہ حربہ بہت پرانا ہو گیا ہے مسٹر! کوئی اور  
 طریقہ اپنائیے خدا حافظ۔“

وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آیا۔  
 ”پلیز! اب یہ آہی گئی ہے تو اسے پی کر جائیے گا“ میں نے  
 بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تیس دن بائیں یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی لڑکی میں دلچسپی لے  
 رہا تھا ورنہ میرے ساتھ پہلے پیشہ اور ہر سے ہوئی ہے۔ اس لئے  
 بات آنکے بڑھاتے ہوئے کچھ گہرا ہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ آدمی  
 بوتل ختم کر چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد تو کوئی ہمانہ  
 بھی نہیں رہے گا اور یہ اٹھ کر چلی جائے گی۔ مجھے کچھ بات کرنی  
 چاہئے۔

”مجھے ٹیکس جی خاں کہتے ہیں۔ آپ کا نام پوچھ سکتا  
 ہوں۔“

”پوچھنے پر تو کوئی پابندی نہیں البتہ میں بتاؤں نہ بتاؤں یہ  
 میری مرضی۔“

”مجھے یقین ہے آپ اتنی بد اطلاق نہیں ہوں گی۔“  
 ”انسانی منہ پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ آپ کوئی بھی رائے  
 قائم کر سکتے ہیں“ اس نے بیٹے کی منطقی انداز میں کہا۔

”یاد رہے! میرا مشورہ بہت ہے۔ ٹیکس جی خاں اسے پکھانا  
 تمہارے بس سے باہر ہے میں نے دل ہی دل میں کہا۔

میں نے بات کا رخ بدلا ”خیر آپ کی مرضی اویسے گاڑی  
 کس قسم کا چاہتا ہے آپ کو؟“

”سینہ کوئی نام رکھ لے سینہ ہی رہتا ہے۔ جو زحمانہ سی  
 ہواں سی۔ آپ کل کسی گاڑی کا ذکر کر رہے تھے۔ آگئی؟“  
 ”ابھی ابھی پہنچی ہے۔ ابھی تو میں نے خود بھی جی بھر کر نہیں  
 رکھا۔ ذرا توقف کیجئے“ میں نے بہت کدے اس کی آنکھوں سے  
 آنکھیں ملائیں۔

”آج کولڈ ڈرنک نہیں منگائیے گا؟“

”نہیں“ توجہ نہیں باہر چل کر نہیں گئے۔“

”میں کسی اجنبی کے ساتھ تمہا کہیں بیٹھنے کی قائل نہیں۔“  
 ”مس زبیدہ! ہر آدمی پہلے پہل اجنبی ہوتا ہے۔ اجنبیت کی  
 یہ دیواریں ہم جیسے انسان ہی گراتے ہیں۔ رہی تمہا کی بات تو  
 میں وہ تمہا آدمی ہوں کہ آپ میرے ساتھ جہاں کہیں ہوں گی تمہا  
 ہی ہوں گی تاوقتیکہ آپ مجھے ایک فرد ’ایک انسان‘ ایک آشنا  
 ایک دوست نہ سمجھ لیں۔ آخر یہاں بھی تو آپ میرے ساتھ  
 بیٹھی ہیں نا۔“

”یہاں کی بات اور ہے یہ آپ کا آفس ہے۔“

”پھر بھی ’ملازموں کے سامنے کچھ اچھا نہیں لگتا ہوں بیٹھے  
 رہتا۔“

”اور ساتھ جائیں گے تو اچھا لگے گا؟“

”نہ جائیے ساتھ۔ آپ لہرنی کی طرف چلے‘ میں آتا  
 ہوں۔“

”آخر کیوں؟“

”مجھے آپ سے کچھ باتیں کہنی ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسا  
 کریں۔ پلیز انکار نہ کیجئے گا۔ ’ملید میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ  
 ایسی باتیں بتا سکوں کہ آپ مجھے آئندہ تھکا نہ رہنے دیں۔“ اس  
 کے گل گلہابی جاڑا بن گئے۔ اس کی آنکھیں یوں جھک گئیں جیسے  
 پہلے کی منہ بند کلیاں۔ اس کی خاموشی رضامندی کا اذن دے رہی  
 تھی۔

”میں یہ پیسے لائی تھی گاڑی کے لئے“ اس نے شانے پر  
 ہاتھ لگتے ہوئے پرس کو میری میز پر رکھ دیا۔  
 ”نی احوال اسے رکھ لیجئے۔ واپس آکر شاید ضرورت پڑے۔  
 اب آپ لہرنی کی طرف چلے‘ میں پہنچتا ہوں۔“

وہ جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی اٹھ گئی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ  
 وہ میری تجویز پر عمل کرے گی یا نہیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے  
 اپنی گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی اشارت ہونے کی آواز  
 میری سماعت سے کھراکی تو مجھے ہوش آیا۔ اس کی گاڑی شوروم  
 سے باہر نکل رہی تھی۔

”میں لہرنی پہنچا تو وہ گاڑی پارک کر کے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے  
 میرا انتظار کر رہی تھی۔“

”ہیلو!“

”ہیلو‘ آگئے آپ۔“

”آپ نے“ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔ اس  
 نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی شوخی پھر لوٹ آئی تھی۔  
 اس نے اسی بے نیازی سے کار سے قدم نیچے رکھا جس انداز  
 دلربائی سے وہ آفس پہنچی تھی۔

”ایک بات کہوں۔ آپ گھبرائی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔  
 اسی طرح ’ملین‘ شوخ اور گفتہ رہا کریں“ میں نے ہونٹ کی  
 بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی کپڑے گرد بٹکا سا ملتا بنایا۔ وہ  
 لڑکھرائی اور پھر بیڑھیاں چڑھنے لگی۔

پہلی روم میں اس وقت قطعی رش نہیں تھا۔ اکاؤنٹا جوڑا  
 خوش گہریں میں مصروف تھا۔ ایک آدمی نے ہماری طرف نگاہ  
 اٹھا کر دیکھا اور بس!

”کیا نہیں کی؟“ میں نے نسبتاً ایک الگ تھلک کیبن میں  
 بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”جو آپ منگالیں۔“

”نہیں‘ آج آپ بتائیں۔“

”کولڈ ڈرنک“ وہ کلک کلک کر آفس ہی۔

”اچھا تو آپ میری چہ بٹاری ہیں۔“

وہ چپ رہی‘ میں نے ملک ٹیک کا آرڈر روئے دیا۔ ملک  
 ٹیک آئے تک مسلسل خاموشی ہم دونوں پر طاری رہی۔ آخر  
 میں نے اس خاموشی کو توڑا۔

”وہ کیوں زبیدہ‘ نہ تو یہ ہوٹل نہ۔۔۔ شایان شان ہے اور نہ  
 ہی یہ ملک ٹیک جو تم لی رہی ہو۔ یہاں تو میں تمہیں اس وقت  
 اس لئے لایا ہوں کہ کھلف کے اس بھنور سے تم اپنے آپ کو  
 آزاد کر سکو جو ہم دونوں کے درمیان ملتا در حلقہ موجود ہے۔  
 اجنبیت کی اس دیوار کو گرا سکو جس کے مسمار ہونے کے بعد دو  
 انسان ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ احوال  
 مجھ سے کہہ سکو جو دوستی اور اپنائیت کی بنیاد بن جاتے ہیں۔  
 تمہارے بارے میں میں اب تک کچھ بھی نہیں جانتا‘ بس تم  
 اچھی لگتی ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ اور اچھی لگنے لگو۔“  
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بری لگنے لگوں؟“

”نہیں‘ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو مگر یہ  
 حقیقت ہے کہ میرے پاس دولت بھی ہے‘ بددانی بھی۔ لیکن میں  
 نے کسی لڑکی کو اس قدر ٹوٹ کر نہیں چاہا جیسے تمہیں۔ کوئی بات  
 تم میں ضرور ہے جو میری روح نے محسوس کی ہے۔ کیا اب بھی  
 اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی؟“

”کیا بتاؤں؟“

”کچھ بھی۔ وقت گزار ہی کے لئے سہی۔“

”ٹھیک صاحب! آپ نہ جانے مجھے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔  
 میں ایک اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی ہی لڑکی ہوں۔ کسی

طرح بھی آپ کے سامنے کے برابر بھی نہیں۔ میرے ہاں باپ نہیں ہیں۔ بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان کا نام یوسف علی خاں ہے۔ وہ کسٹم آفسر ہیں۔ کھاتے بہت ہیں لیکن سب کچھ بھائی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ بھائی مجھے بوجھ سمجھتی ہیں۔ میرے بھائی مجھ سے بہت پار کرتے ہیں۔ یہ گاڑی بھی انہی کی ہے جو میں استعمال کرتی ہوں۔ وہ جب خرچ کے لئے جو کچھ مجھے دیتے ہیں وہی سب کچھ جمع کر کے میں گاڑی خریدنے آپ کے شرووم میں آئی تھی۔ میں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اب سوچتی ہوں، کیسے نوکری کر لوں۔ بس۔ یا اور کچھ بات ہے مجھے سمجھنے کے لئے۔

”تم نے اپنے خاندان، میرا مطلب ہے حسب نسب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”کیوں، کیا کسی تعلق کے لئے صرف انسان ہونا کافی نہیں؟“

”شاید ہو لیکن مجھ میں ایک ہی کمزوری ہے، میں انسانوں کو ذات بات کے ترازو میں تولتا ہوں۔ اسے میری خامی سمجھ کر معاف کرنا۔ انسان تو فقیر بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں اور تم میں بہت فرق ہے۔“

”تم بھی بھائی جان کی طرح ہو۔ وہ بھی اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں البتہ بھائی جان کی زبانی میں نے سنا ہے کہ ہم لوگ یوسف زئی پھان ہیں۔ ہمارے اجداد کبھی افغانستان سے آئے تھے۔“

”اچھا! پھر تو دوستی کی نہیں بھی یوسف زئی پھان ہوں“ میں نے بے خیالی میں اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس نے گرجوشی سے اس کا جواب دیا۔

”کیا خیال ہے، کھانا پیس کھالیا جائے؟“

”نہیں، کھانا نہیں۔ بھائی جان لہج کرنے گھر آتے ہیں اگر میں نہ پہنچی تو انہیں ٹکر ہو جائے گی۔“

”اور گاڑی؟“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں۔ سنجیدگی سے بتائیے۔ کوئی گاڑی آئی ہے؟“

”میں نے ایسے ہی تھوڑی بلایا تھا۔ کل آئے اور گاڑی اٹھا لیجئے۔“

”یعنی کل پھر آتا ہوگا؟“

”اب تو شاید روز تو تازے گا۔“

ہم دونوں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اسے اپنی انجینس کا ہاتھ دیا کہ وہ کل شرووم پر نہیں بلکہ یہاں مجھ سے ملے گاڑی وہیں پہنچ جائے گی۔ انجینس کا ہاتھ میں نے اسے لئے دیا کہ وہاں نسبتاً زیادہ تنہائی تھی۔ میرا الگ کمر تھا جہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں ہو سکتی تھیں۔



میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ پل۔ اے نے اطلاع دی۔ ”سرا!

کوئی مس زبیدہ ہیں آپ کے لئے؟“

”نورا سمجھو۔“

”یہ یوزبیدہ کیسی ہوا؟“

”نہیں۔ آپ سنا ہیجئے۔“

”ارے کتنی کہیں ہو۔“

وہ سماںوں کے لئے بھائی کے ہونے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اخلاقیاتی کرسی سے اٹھ کر ان کے برابر جا بیٹھا۔

”زبیدہ! کل تمہارے ہاتھ کے بعد میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا۔ کچھ معاملات اپنے ذہن میں میں نے طے کئے ہیں۔ اگر تمہیں بھی ان میں شریک کر لیا جائے تو کوئی خرچ نہیں بلکہ تمہاری شرکت کے بلکہ تو یہ معاملات طے ہو ہی نہیں سکتے۔“

”کیسے معاملات، کیسی شرکت؟ پورے مجھے حل کراتے ہیں آپ۔“

”تمہیں نوکری چاہئے نا۔ میرا مطلب ہے، اگر نوکری مل جائے تو کرو گی؟“

”نی الحال تو کار چاہئے۔“

”اگر نوکری کا مددالی ہو تو؟“

”کیا ڈرائیوری دلو اور ہے ہیں کہیں؟“

”میرے دفتر میں سیلز پوزیشننگ جگہ خالی ہے۔ اس پوسٹ کے لئے تجربے کی ضرورت ہے لیکن میں یہاں موجود ہوں اور میرے لوگ ہیں جو تمہاری مدد کریں گے۔ تھوڑے دن میں تمہیں تجربہ ہو ہی جائے گا۔ نی الحال ہم تمہیں سات ہزار روپے اور آنے جانے کے لئے گاڑی کی سہولت دے سکتے ہیں۔“

اس پیش کش کو سن کر اس کا خوش ہونا لازمی تھا۔ کچھ دیر اس نے اسے میرا احسان قرار دیا۔ اس پیش کش کو قبول کرنے سے مخدوری ظاہر کی۔ بالآخر وہ رضامند ہو گئی۔

”کل سے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو سکتی ہو؟“

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے ملازمت کی یہ پیشکش اسس لئے کی تھی کہ اس طرح اس سے روز ملاقات کی خواہش بھی پوری ہو سکتی تھی اور مسلسل ملاقاتوں سے اسے سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی تھی۔ میں نے اسے شریک حیات بنانے کا قصد کر لیا تھا۔ اس لئے اچھی طرح چھان بھنگ کر لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں صرف اس سے ملا تھا، اس کے بھائی سے مل کر مزید اندازے لگانے تھے۔ زبیدہ کے دل میں گھمبائے بغیر ان میں سے کوئی بھی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ دل میں جگ پیدا کرنے کے لئے قربت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قربت کے بنانے میں نے زحمت لئے تھے۔

وہ بڑی باقاعدگی سے دفتر آتی۔ جب تک دفتر میں رہتی کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ بہت جلد اس نے اپنے کام میں

تھا کہ میں کتنے دن میں تمہارے دل میں آباد ہوتا ہوں۔ میری سوچ تمہاری سوچ کی جتنی ہے۔ تم میری آنکھوں سے خواب کب دیکھتی ہو؟ آج ایک ہی موسم ہم دونوں پر طاری ہے۔ اب سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ میں تمہارے بھائی سے تمہیں مانگ لوں گا۔“

اس نے دوبارہ میرے شانوں پر سر رکھ دیا۔ میں نے گاڑی اشارت کی۔

دفتر پہنچنے کے بعد میں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔  
”زیادہ! آج شام تم اپنے بھائی اور بھالی کے ساتھ میرے گھر آؤ، میرے ساتھ چائے پیو۔“  
”ہم لوگ آئیں! آنا تو آپ کو چاہئے“ وہ کھٹکھٹا کر فیس پڑی۔

”مجھے معلوم ہے۔ لیکن ایسا میں ایک مصلحت کے تحت کر رہا ہوں۔ ابھی کوئی بات نہیں چھیٹنی ہے۔ ابھی تو محض یونسی تعلق خاطر کے لئے۔ دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مل لیں۔ میں بالکل تمہارا ہوں“ اس سے انہیں واقفیت ہو جائے۔۔۔ مطلب یہ کہ کسی وقت میں ان سے اپنی خواہش کا اظہار کروں تو وہ میرے بارے میں پہلے سے کوئی اچھی بری رائے رکھتے ہوں۔“  
”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں گھر میں آپ کا اتنا ذکر کرتی ہوں کہ وہ کوئی نہ کوئی رائے قائم کر چکے ہوں گے۔“

پھر بھی جو میں نے سوچا ہے، وہی مجھے کرنے دو“ میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ اس نے سوال کیا۔  
”تم ابھی گھر چلی جاؤ اور بھائی جان کو میری دعوت پہنچا دو۔“

”نا بابا نا۔ یہ کام تم ہی کرو، مجھ سے یہ سب کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

”پائل مت بنو۔ اچھا ایسا کرو، تم گھر جا کر ذکر تو کرو۔ شام کو میں بھی ٹیلی فون کر لوں گا۔“

میں اور زیادہ ایک ساتھ دفتر سے نکلے۔ وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی، میں اپنے گھر کی سمت مڑ گیا۔

شام کو نوکروں کو انتظامات کی ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے زیادہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو“ ایک نسوانی آواز میرے کانوں سے گرائی۔  
”یوسف علی خاں صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟“ میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

”آپ ہاں صاحب بات کر رہے ہیں؟“  
”ہلیب علی خاں۔“

میرے جواب پر ایک قہقہے کی آواز سنائی دی۔ قہقہے سے میں بچاؤ۔ ٹیلی فون زیادہ نے اٹھایا تھا۔

صارت حاصل کر لی تھی۔ میں شروع ہوا اور اسے کام کے لئے مجھ سے رجوع کر لی تھی، پریشان حال تھی لیکن اب اسے اصرار حاصل ہو گیا تھا حالانکہ ابھی صرف ایک سید گزرا تھا۔

ہم دونوں لہجے کے لئے ساتھ ہی پابہر جاتے تھے۔ اب ہمارے درمیان تکلف کی کوئی دیوار نہیں تھی۔ البتہ ان بے مغلخانہ مدتیوں سے دفتر والوں میں چہ چگوئیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔

عورتوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ لیتی ہیں۔ میں نے اپنے سامنے ہونے والے کسی مظاہرے پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا لیکن زیادہ نے عورت ہونے کے ناتے ان چہ بیگوئیوں کو محسوس کر لیا تھا۔ ایک روز لہجے سے واپس آتے ہوئے راستے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ہلیب! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“  
”کیا برداشت نہیں ہوتا، کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”تم تو ایم ڈی صاحب ہو، دروازہ بند کر کے آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہو، دفتر والوں کی نگاہوں کا سامنا تو مجھے کرنا پڑتا ہے۔“

اس نے یہ الفاظ کہتے ہوئے میرے شانے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ اس کی آواز میں بہت درد تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ کوئی تشویش ناک بات ہے۔

”میں سمجھا نہیں زیادہ! کھل کر بات کرو، کیا کہا ہے تم سے دفتر والوں نے؟“

”مجھ سے کیا کہا ہے۔ دن بھر میرے اور تمہارے بارے میں طرح طرح سے اشارے کنایوں میں باتیں ہوتی ہیں۔ میری مدح دن بھر زخمی ہوتی ہے۔ کیا مجھے اسی تماشے کے لئے تم اس دفتر میں لائے تھے؟ کل سے میں تمہارے ساتھ لہجے کے لئے نہیں آؤں گی۔ اگر پھر بھی لوگ کہانیاں گھڑتے اور سناتے رہے تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔“

”کیا بد تمیزی ہے۔ حالات کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جاتا۔“ میں نے اسے پار سے ڈانٹا۔

”نہیں ہلیب میری تمہاری محبت صرف محبت نہیں کہلاتی۔ ہم دونوں میں اتنا فرق ہے کہ لوگ اسے لہجے کہتے ہیں۔ اور مجھے ایسی کسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ تم ان سب کا منہ کیوں بند نہیں کر دیتے؟“

”میں لوگوں کے منہ کیسے بند کر سکتا ہوں؟“  
”تم بھائی جان سے کیوں نہیں ملتے؟“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے پاؤں گاڑی کے بریک پر چلے گئے۔ گاڑی آہستہ ہوئی اور پھر رک گئی۔

”کیوں گاڑی کیوں روک لی؟“ وہ گھبرا گئی۔  
”اس لئے کہ آج وہ بات میں نے کہو الی ہے جو میں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا تم اپنے منہ سے یہ بات کہو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا

”میں۔ میں ان کا بیٹا ہوں“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ لاوا ولد تھے۔“

”میں ان کا حقیقی بیٹا نہیں“ ان کے دوست کا بیٹا ہوں۔

والد کے انتقال کے بعد میں عمانہ گیا تھا۔ میری والدہ کا انتقال

پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے سیٹھ صاحب نے مجھے اپنا بیٹا مان لیا۔

اسی وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ میرے والد یوسف زکی پٹھان تھے

جبکہ سیٹھ صاحب کمال زکی تھے۔ باپ کی نسبت سے میں اپنے

آپ کو یوسف زکی ہی کہتا ہوں“ میں نے اپنے نسب کا ذکر جان

بوجھ کر کیا۔ مجھے زبیدہ کی نصیحت یاد تھی کہ ”بھائی جان

انسانوں کو ذات برادری پر تو لیتے ہیں۔“ مجھے اس وقت اپنی غلطی

کا بے حاشا احساس ہوا کہ میں نے یہ کہہ کر اب تک فروخت

کیوں نہ کر دی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ اس شہر میں سیٹھ صاحب

کے شناسا یقیناً ہوں گے جو کہیں نہ کہیں اس کو غلطی پر آہمی چکے

ہوں گے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ تیرے کمان سے نکل چکا تھا۔ میں

نے کن انہیوں سے زبیدہ کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے چائے

پی رہی تھی۔ یوسف صاحب بھی بظاہر خاموش ہو گئے تھے لیکن

لگتا تھا وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے البتہ ان کی

بیگم پر اس گفتگو کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اسی

طرح چمکنے لگیں۔

تھقل بے لطف ہو گئی تھی لیکن زبیدہ کی بھائی کے دم سے

کچھ نہ کچھ رونق بحال ہو گئی۔ میں بھی زبردستی ہنستا مسکراتا رہا

حالانکہ میرا دل اس وقت کہیں اور تھا۔ کچھ دیر کی خوش گھوٹوں

کے بعد یوسف صاحب نے مجھ سے اجازت چاہی۔ ان کی بیگم کی

تربیاتی کہ انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر میرا دل

برہایا۔

وہ رات میں نے اپنی قیمتی خواب گاہ میں جمنازی پنک پر

اکڑوں بیٹھ کر احساس جرم کے بوجھ سے رتب کر گزاری۔ اس

رات مجھے اپنے کئی گناہ یاد آئے مگر انسان بڑا بہانہ ساز ہے۔

میری منگھٹوں نے پھر بہانے تراش لئے۔ تھوڑی جادوگری کے

بہانے، مستغنی کی خوش اثری کے بہانے۔ صبح تک میں ہر

احساس سے آزاد ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج دفتر میں سب

سے پہلا سوال زبیدہ کی زبان پر کل کی پردہ داری سے متعلق ہو گا۔

میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر کے دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہی وہاں جو سوچا تھا۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی میرے خیال

نے مٹی جاسہ پہن لیا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو

میں نے زبیدہ وہاں بیٹھی تھی۔

”ارے زبیدہ تم کہاں؟“

”سر، کل آپ کا پہلا فریب مجھ پر کھلا۔ بتائیے آپ نے ایسا

کیوں لیا؟“

”دیکھو زبیدہ! پہلے تو تم اپنا لہجہ درست کرو اس کے بعد مجھ

”آپ میری آواز بھی نہیں پہچانے؟“

”کبھی ٹیلیفون پر تمہاری آواز سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس

لئے۔ اچھا بتاؤ بھائی جان سے بات ہوئی؟“

”ہاں میں نے کہہ تو دیا تھا۔ آپ بھی بات کر لیں۔ میں

انہیں بلاتی ہوں“ دوسری طرف سے ہماری مردانہ آواز میری

سماعت سے ٹکرائی۔

”یوسف علی خاں اسپکنگ۔“

”میں ٹیلیفون بول رہا ہوں۔ کیسے مزاج ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”زبیدہ نے میری درخواست آپ تک پہنچا دی ہوگی۔“

”ہاں! ذکر تو کر رہی تھی۔“

”تو آپ آ رہے ہیں؟“

”ہیں۔ ہم ایک گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ ویسے اس کلف

کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”کلف کیسا یوسف صاحب۔ میں تو کاروباری بھائیوں میں

پھنسا رہا ورنہ آپ سے بہت پہلے ملاقات کرتا۔ چلے اب سہی“

بھائی جان وقت کے بہت پابند نکلے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد

نئی مزد کو غلطی میں داخل ہوئی۔

یوسف علی خاں چھریوں سے بدن، معمولی فٹنس اور پکی رنگ

کے مالک، زبیدہ سے قلمی کلف تھے البتہ ان کی بیگم روپ رنگ

کا بھروسہ تھیں۔ ایسا بھروسہ کہ زبیدہ بھی چمکی معلوم ہوتی تھی۔

یوسف صاحب نہایت تپاک سے ملے۔ بہت بولنے والے آدمی

ثابت ہوئے، بیٹیتے ہی شروع ہو گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں اور بے

ہتک گفتگوں سے پورے لان کو سر رہا اٹھالیا۔ وہ قیامت تک نہ

رکتے، اگر ان کی بیگم انہیں ڈانٹ نہ دیتیں۔ ان کی بیگم کی زبانی

مجھے معلوم ہوا کہ زبیدہ میرا ذکر کئے بغیر نوالہ نہیں توڑتی۔ اس گھر

میں میرا نام نہ نہاد طرف اتنا زیادہ ہوا تھا کہ میں ان کے لئے انہیں

نہیں رہا تھا لیکن شاید انہیں میری دولت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔

میرے غمناک بات، دیکھ کر یوسف صاحب کی بیگم خاص خاص نظر

آتی تھیں۔ بات بات پر زبیدہ کی خوشامد انہیں نہیں کر کے مجھے

خوش کرنے، کمر بستہ نہیں۔

انہی گھنٹہ باری تھی کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ چائے

تیار ہے۔ ہم سب چائے کی نیز کی طرف روانہ ہو گئے۔ چائے

نوشی کے درمیان یوسف علی خاں نے ایک ایسا سوال کر دیا کہ

مجھے جکا آگئے۔

”کیوں ٹھیک صاحب! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ

کو غلطی سیٹھ بھائی علی خاں کی نہیں؟“

”نہی ہاں یہ کو غلطی اٹھی کی ہے۔ آپ قلمی غلطی پر نہیں ہیں“

میں نے صوفی نکلے ہوئے جواب دیا۔

”آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟“

سے کسی جواب کی توقع رکھو۔" [www.dawnnews.com](http://www.dawnnews.com)  
 "مجھے جواب چاہئے"

"زیادہ! بعض فریب ایسے ہوتے ہیں جو اگر انسان عدسوں کو نہ دے تو آدمی کا دم نکل جائے، پہاڑی زندگی کا نئی دور ہو جائے" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں دوسری کب سے ہو گئی۔ تم میں ہوں، میں تم ہو۔ پھر یہ پرہ فریب کیا؟ تم نے آج تک مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟ میرے احقاد کو قتل کیوں کیا؟"

"بے احمادی کی بات نہیں ہے میری جان! میرے خیال میں یہ کوئی قابل ذکر واقعہ تھا ہی نہیں جو میں تم سے کہتا اور کہتا تو کیا ہو جاتا۔ وقت کا پیہہ لٹا چلنے لگتا، حال ماضی میں بدل جاتا۔ کیا ہو جاتا۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں بات کو سنبھال لیتی۔ تمہیں ہوشیار کر دیتی۔ کچھ نہ کچھ کر لیتی۔"

"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ بھائی جان کو نہیں جانتے۔ وہ کسی ایسے آدمی کے حوالے مجھے نہیں کریں گے جو کسی کالے بالک ہو۔"

"مگر میرا باپ ایک انٹلی نسب کا آدمی تھا، تمہاری طرح پٹھان تھا۔ یوسف زلی تھا۔"

"بھائی جان کو یہ بات کون سمجھائے گا۔"

"زیادہ! اگر اس واقعے کے بعد میں تمہاری نظر میں میرے سے نکلیں، یہاں تو ٹھیک ہے۔ اور اگر اب بھی میرا ہوں تو ہر مخالفت کے باوجود میں تمہیں مانگوں گا۔ تمہارے یوسف زلی بھائی سے مانگوں گا۔ بولو، تم مجھے برا نہیں سمجھتیں؟"

"نہیں، وہ بغیر سنے سے کمرے سے نکل گئی۔"

اس کے جانے کے بعد میرا ذہن تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا اور آج ہی اسی وقت بلکہ ابھی۔ لیکن شام تک تو انتظار کرنا ہی ہو گا۔ یوسف علی خاں اس وقت گھر کماں ہوں گے۔ میں نے سوچا۔

اتنے بوجھ لے کر میں دفتر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ضروری کام نمانے کے بعد میں نے سوچا، زیادہ کولے کر کہیں چلا جاؤں، کچھ راز اور بتادوں یا یوں ہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھروں۔ میں نے پی۔ اے سے کہا "س زبیدہ کو بھیجئے۔"

"سراوہ تو گھر چلی گئیں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"اچھا!" میں نے ریسورر رکھ دیا۔ بریف کیس اٹھایا اور شام کے انتظار مند دفتر پہنچا۔

شام کو زبیدہ کے گھر جانے سے پہلے میں نے دو چائے ٹیبلٹوں کو ہر ایسا کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ نہ معلوم یوسف صاحب نے میرے بارے میں کسی رائے قائم کی ہو، نئے سے انکار ہی

کریں لیکن اگر پہنچ ہی جاؤں گا تو گھر آئے مہمان کو کوئی نہیں بھگاتا۔ میں نے ڈائری سے ایڈریس نکالا اور زبیدہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ معمولی سی تلاش کے بعد مجھے منزل مل گئی۔ یہ کنکشن کے علاقے میں اوسط درجے کا اپارٹمنٹ تھا، یوسف صاحب کسٹم میں ہوتے ہوئے اس اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے رشوت سے گریز کرتے ہیں۔ ایسا آدمی بعض اوقات بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ بھلا بتائیے جو آدمی اپنا بھلا نہ چاہے دوسرے کا کیا چاہے گا، میں نے سوچا۔ میں نے سوچوں کے دائرے سے باہر قدم رکھا اور کال نبل پر انگلی رکھ دی۔ دوواڑے پر زبیدہ کی بھالی نمودار ہوئیں۔ مجھے دیکھ کر ایسے کھل اٹھیں جیسے میرے ہی انتظار میں تھیں۔ انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے مجھے اندر بلایا۔ میں پوچھتا ہی رہ گیا کہ یوسف صاحب گھر پر ہیں۔ انہوں نے مجھے ذرا تنگ دم میں بٹھادیا۔ "آپ تشریف رکھتے ہیں یوسف کو اطلاع کرتی ہوں۔"

باہر سے یہ اپارٹمنٹ اتنا شاندار نظر نہیں آتا تھا۔ کمرے بہت کشادہ اور شاندار تھے۔ نفیس سجائو بھی اہل خانہ کی خوش ذوقی کی گواہی دے رہی تھی۔ ابھی میں اس سے ماحول سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ یوسف صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میری آمد پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا موڈ خوشگوار تھا۔ میرے تمام اندیشے باطل ہو گئے۔ میں خواہ مخواہ ڈر رہا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"آپ نے تو بڑی جلدی وعدہ لہمایا اور وہ بھی اتنی خاموشی سے۔ کم از کم اطلاع ہی کر دی ہوتی، بھائی نے اپنے میاں کے برابر نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ لوگوں سے بھی مل لیا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں آنے کا کوئی پروگرام تھا ہی نہیں، میں نے صفائی پیش کی۔"

مجیب بات یہ تھی کہ اس تمام ہنگامے کے دوران زبیدہ نے کمرے میں آکر جھانکا تک نہیں۔ مجھے اس کی اس بے مروتی پر غصہ تو بہت آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ شاید اس گھر کی تہذیب میں یہ پردہ داری شامل ہو۔

ادھر ادھر کی باتوں میں جب خاص دیر گزر گئی تو میں اصل مطلب پر آ گیا۔

"یوسف صاحب! آپ کے بارے میں میرا مشاہدہ یہ ہے کہ آپ حقیقت پسند ہیں اس لئے بغیر تمہید کے آپ کی اور بھائی کی اجازت سے چھ کتنے کی جسارت کر رہا ہوں، میں نے دیکھ لیجئے میں بات کا آغاز کیا۔"

"ارے ارے! تم تو اچھا خاصا ماکلف کرنے لگے۔ خیریت تو ہے کیا بات ہے؟" یوسف صاحب نے میری بہت برہمائی۔

"بات تو یہ بزرگوں کے کرنے کی ہے لیکن آپ کو معلوم ہے"

خون کا ریا۔ شاید بھالی کو منع کیا گیا تھا ورنہ ان سے اس بے رخی کی توقع مجھے نہیں تھی۔ میں اتنی سندر میں قطرے کی زندگی گزارنے کا قائل نہیں۔ مہوں کی طرح بھونا میری فطرت ہے۔ اب میں اس وقت ٹیلیفون کیوں گا جب یوسف علی خاں گھر پر موجود ہوں اور ان سے اپنی اپنی محبت مانگوں گا ورنہ میں چھیننا بھی جانتا ہوں۔ میں نے پتہ اندازہ کیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آج میں دفتر کی کرسی کے بعد بھی دفتر میں رکھا رہا۔ جیسے ہی مجھے یقین ہوا کہ اب زبیدہ کے گھر میں چراغ جل چکے ہوں گے میں نے نمبر ڈائل کیا۔ مواد آواز نے میرا استقبال کیا۔

”زبیدہ کہاں ہے۔ وہ کیسی ہے؟“ میں نے براہ راست پوچھا۔

”تم کون ہو؟“ وہ میری طرف سے بھی وہی لہجہ تھا۔

”میں گلپ علی خان۔“

”تم کون ہوتے ہو زبیدہ کا اس طرح پوچھنے والے؟“

”میں اس کا مالک ہوں۔ وہ میرے دفتر میں ملازم ہے۔“

”چارون ہو گئے دفتر نہیں چلتا۔“

”اس کا استعفا بھیج جائے گا۔“

”وہ میری محبت ہے۔“

”وہ بہت تمہاری اس خوشی کو توڑ دے گی۔“

”میں نے ایک سوال کیا تھا اس کا کیا جواب ہے؟“

”ایک لے بالک میرا بہنوئی نہیں بن سکتا۔“

”میں لے بالک ضرور ہوں لیکن ایک باعزت باپ۔“

”تم ایک گھراؤ سے لائے گئے تھے، مجھے اس کا علم ہے۔“

انہوں نے میری بات کٹھری۔

”لیکن زبیدہ ہے کہاں؟“

”میں پابند نہیں اس بات کا جواب دینے کا۔“

”ٹھیک ہے میں گھر آ رہا ہوں اس سے خود بات کر لوں گا۔“

”خبردار! یہ نارانی نہ کرنا۔ یہاں بے عزتی کے سوا تمہیں

کچھ نہیں ملے گا۔ ابھی صرف اتنا جان لو کہ وہ گھر میں تو کیا کراچی

شہر میں بھی کہیں موجود نہیں۔ لاہور گئی ہے اور اپنی خوشی سے کئی

ہے۔ بہت جلد اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا وضاحت نامہ تمہیں مل

جائے گا۔“ یوسف علی خاں نے اس وضاحت کے بعد ریسیور ہٹ

دیا۔ یوسف نے تو ایسا کر بھی لیا میں تو ریسیور ہاتھ سے رکھنا ہی

بھول گیا۔ نہ جانے کتنی دیر ریسیور کو اس طرح کھتا رہا جیسے ابھی

زبیدہ کی آواز آئے گی۔ وہ مجھے یقین دلائے گی یہ سب جھوٹ

ہے۔ بھائی جان کی تو عادت مذاق کی ہے۔ وہ تمہارا دل دیکھ رہے

تھے۔ میں تو یہیں ہوں تمہارے خیالوں میں تمہارے خوابوں

میں تمہارے شہر میں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہوا تو یہ ہوا کہ

ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں کرسی پر ایک طرف

بھول گیا۔

میرا کوئی بڑا موجود نہیں۔ بات یہ ہے کہ زبیدہ کو میں پسند کرتا ہوں اور زندگی کے سفر میں اسے ساتھ لے کر چلنے کی خواہش مجھے یہاں تک لائی ہے۔ جیسا کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کی رضامندی میرے خوابوں کو تعبیر دے سکتی ہے۔“

یوسف صاحب نے میری اس جسارت کو حیرت سے سنا اور

مجھ سے مخاطب ہوئے ”گلپ صاحب آپ کی صاف گوئی مجھے

پسند تو بہت آئی لیکن مجھے اس مسئلے پر کچھ سوچنا ہوگا۔ آپ کو کچھ

انتظار کرنا پڑے گا اور ہاں صرف اقرار کی امید نہ رکھنے میں

انکار بھی کر سکتا ہوں۔“

”وہ آپ کی مرضی۔“

”آئیے چائے پی لی جائے“ انہوں نے زبیدہ کو چائے کی

ٹرائی لاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

لڑکیاں کسی بات کا کتنی جلدی اڑتی ہیں اس کا اندازہ

مجھے اس وقت زبیدہ کو دیکھ کر ہوا۔ اس کا رنگ سہید ہو رہا تھا۔

چوہا ایسا بچھا ہوا تھا جیسے خوشی نے اس چہرے پر کبھی رنگ جمایا ہی

نہ ہو۔ اس نے مجھے رٹا سلام کیا اور ٹرائی کو درمیان میں رکھ کر

ایک طرف بیٹھ گئی۔

چائے پینے کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی۔

زبیدہ ٹرائی لے کر جا چکی تھی۔ یوسف صاحب اور بھالی نے مجھے

دروازے تک آکر خیرباد کہا۔ میں ان سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ

میرے سوال کا جواب کب تک ان سے بن پڑے گا۔ مجھے پہلی

دفعہ اندازہ ہوا کہ ضروری نہیں کہ پوری دنیا دولت مندوں سے

مربوب ہوتی پھرے۔ کچھ لوگ اپنے جذبات چھپانا بھی جانتے

ہیں۔

دوسرے دن زبیدہ دفتر نہیں آئی۔ میں نے کوئی اہمیت نہیں

دی لیکن جب وہ مسلسل چار روز تک غیر حاضری تو مجھے تشویش

لاحق ہوئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو گئی ہو لیکن کوئی

درخواست کوئی پیغام کوئی خط کچھ بھی تو نہیں۔ کم از کم ٹیلیفون

ی کی کرسی۔ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے بیدار

کیا۔ اب اس کا حصول میری محبت نہیں میری ضد بننا جا رہا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر زبیدہ کے گھر کا نمبر ملایا کہ اس وقت یقیناً

یوسف صاحب گھر پر نہیں ہوں گے۔ یا تو زبیدہ خود ٹیلیفون

اٹھائے گی یا بھالی لہذا صحیح صورت حال کا علم ہو سکے گا۔

ٹیلیفون بھالی نے اٹھایا۔ میں نے جتانی سے زبیدہ کو پوچھا۔

”کون زبیدہ زبیدہ تو یہاں نہیں ہے۔ آپ کون صاحب بول رہے

ہیں؟“ بھالی کی آواز آئی۔

”بھالی! میں گلپ بول رہا ہوں۔ کہاں ہے زبیدہ؟“

کچھ دیر خاموشی رہی میں ہیلو ہیلو کرتا رہا۔ ٹیلیفون رکھ دیا گیا۔

اس کے بعد میں مستقل نمبر ڈائل کرتا رہا۔ بل ہوتی رہی مگر

کسی نے اٹھانے کی زحمت ہی نہ کی۔ اس ناگمانی افتاد نے مجھے



چاہتے ہیں۔ پہلے میں بھی تیار ہو گئی تھی مگر اب میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم نے پالک کیا، اگر فقیر بھی ہو تو مجھے قبول ہے۔ تم ہیرا ہو، نگر نہیں بنے۔ میں کراچی آ رہی ہوں۔ بھائی جان سے گزرا کر تمہاری بھیک مانوں گی۔ اگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئے تو میں ان کو بے عزت کرنا نہیں چاہتی لیکن ان کا ایک ایسا راز میرے پاس ہے جس کو افشا کرنے کی دھمکی کے ساتھ ہی وہ تم سے رابطہ کریں گے۔ میری تم سے ایک ہی گزارش ہے، ان کی بے عزتی مت کرنا، یہ مجھ سے بدداشت نہ ہوگا۔

نہ جانے تم پر کیا گزر رہی ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور انتظار کرو۔

تمہاری گناہگار۔ زبیدہ

یہ تمہارا ہی طرف ہے زبیدہ کہ تم مجھے فقیر کے روپ میں بھی قبول کرنے کو تیار ہو۔ اگر مجھے پناہ مل جائے کہ تم فقیر ہو تو میں اپنی محبت کے باوجود تمہیں اپنی ٹھوک میں رہنے کی جگہ بھی نہ دوں۔ تم کراچی لوٹ آؤ، میں انتظار کروں گا اور بھائی جان کی عزت بھی۔ خط کا جواب میں نے اپنے دل پر تحریر کر لیا۔

اس خط کی مہارت نے زبیدہ کی عزت اور محبت میری نگاہوں میں اور بھی بڑھادی۔ اب میں بے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب یوسف علی خاں کا غور مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ اس گھڑی کے آتے دیر نہیں لگی۔ نہ جانے زبیدہ کے علم میں وہ کون سا راز تھا جسے سنتے ہی یوسف علی خاں صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ ابھی تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یوسف نے ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ کیا۔

”کلیب اسپیکنگ“ میں نے ٹیلیفون کی گھنٹی کے جواب میں کہا۔

”میں یوسف بول رہا ہوں“ ادھر سے آواز آئی۔ میرے دل نے کودت لی۔ کونسا پیاسے کے پاس آیا تھا۔ سورج مغرب سے نکل آیا تھا۔ پٹھان ڈھیر ہو گیا تھا۔

”فرمائیے خانصاحب“ میں نے کات دار لہجے میں کہا۔

”تم جیت گئے ہو سب۔ شام کو میرے گھر آؤ، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ میں فاتحانہ ہنسی نہ افس دوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں شام سے پہلے ہی اس کی ایک جھلک دیکھنے اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ محبت کے بل پر ایک فقیر، پٹھان زاوی کو بیا بنے خود اس کی دعوت پر اس کے گھر جا رہا تھا۔ وہی اپارٹمنٹ، وہی مانوس بیڑھیاں۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ یوسف علی خاں پہلی گھنٹی پر دروازے پر موجود تھے جیسے دروازے سے لگے کھڑے تھے۔

”السلام علیکم“ میں نے ان کی عزت کی۔

میری آنکھ کھلی تو اپنی خواب گاہ میں تھا۔ ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر ماحول کا جائزہ لیا پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”ہاں، ہاں۔ لیٹے رہئے۔ حرکت آپ کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے“ ڈاکٹر نے مجھے پھر لٹا دیا۔ میرا ڈرائیور اور تمام نوکر کمرے میں موجود تھے۔

”مگر میں تو دفتر میں تھا“ میری آواز کہیں دور سے آئی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جی ہاں۔ آپ دفتر میں ہی تھے۔ آپ پر بلا سا انیک ہوا تھا۔ وہ تو شکر کیجئے جو کیدار بروقت کمرے میں پہنچ گیا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اب گھر کی کوئی بات نہیں، آٹھ دس روز کے آرام کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

ایک ہفتے کے لئے میں بنگ سے لگ کر رہ گیا۔ پہلی۔ اسے سے میں نے کھلوادیا کہ مس زبیدہ کا کوئی پیغام آئے تو مجھے ضرور اطلاع کرے لیکن یہ ایک ہفتہ خاموشی سے گزر گیا۔ طوفان کا زور ایک ہی طرف تھا دوسری طرف مکمل خاموشی، مسلسل سناٹا! ایک ہفتے کے بعد میں دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تو آئینہ مجھے اجنبی لگا۔ یہ دل لگانے کی سزا ہے کہ ملد کھانے کی یہ عقدہ حل کرے تو کون اور کیسے؟ بہر حال ایک انتہائی امید کی بہرائی میں میں نے دفتر میں قدم رکھا۔ زبیدہ کے کمرے پر لگی گھنٹی نے میرے قدم پکڑ لئے، میں نے لاشعوری طور پر اس کے کمرے میں جھانکا۔

”سراہ تو آج بھی نہیں آئیں۔“ میرا بریف کیس تمام کر چلنے والے چہرے نے مجھے اطلاع فراہم کی۔

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر تک دفتر کے لوگ میری خیریت دریافت کرنے آتے رہے اور پھر وہی تھائی، وہی خاموشی۔ میں نے اپنے آپ کو قافلوں میں گم کرنے کی ناکام کوشش کی مگر خیالوں کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں۔ کیسے ڈھونڈوں، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، سی او ڈیٹرن میں دو دن اور گزر گئے۔۔۔۔۔ اسے گئے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے کہ ایک روز ڈاک میں ایک لفافے پر نظر پڑی۔ تحریر جانی پہچانی تھی۔۔۔ دل نے کہا زبیدہ، دماغ نے کہا نہیں۔ لفافہ چاک کیا تو دل بیت گیا۔ اس کا خط میرے ہاتھ میں تھا۔

ڈیر کلیب!

مجھے بھائی جان نے لاہور اس لئے بھیجا تھا کہ میں تم سے دور رہ کر فیصلہ کروں اور تمہیں بھلانے کا اعلان بھی۔ میں بھی اس ارادے سے یہاں آئی تھی کہ دھوکے کا جو زخم تم نے میری روح پر لگایا ہے اس کے بعد تم پر بھروسہ فصول ہے۔ میرا خیال تھا میں تمہیں بھول جاؤں گی لیکن یہ میری بھول تھی۔ میں تمہیں بھلا نہیں سکتی۔ بھائی جان میری شادی کسی سی ایس پی انسر سے کرنا

و علیکم السلام۔ آپ نے یہ آئے اس طرح کنا  
 جیسے کوئی پتھر اوردے۔ ان کی ہال سے گھٹت نمایاں تھی۔ میں  
 ان کے اشارے پر ڈرائنگ روم کی طرف چل رہا۔ میری نگاہیں  
 زبیدہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے کڑکی سے دو آنکھیں  
 مجھے سلام کر رہی ہیں۔ یہ زبیدہ ہی ہوگی اور کون ہو سکتا ہے۔ میں  
 نے یہ بات آج پہلی مرتبہ محسوس کی کہ ان کے گھر میں بچے موجود  
 نہیں۔ غالباً یوسف علی خاں کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے  
 یہ بات اس لیے محسوس کی کہ بچے بڑے اچھے خبر اور پیغام رساں  
 ہوتے ہیں۔ میں زبیدہ کی خبر کس سے معلوم کروں اور میرا سلام  
 کون پہنچائے۔ اس سناٹے میں چھٹا کون پیدا کرے؟ یوسف  
 علی خاں مجھے کمرے میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ دو بارہ آئے تو بھائی  
 ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے چہرے پر وہی روشنی تھی لیکن شوہر  
 کا مزان اکیلو کران کی شکستگی نے پاؤں سمیٹ لئے۔ یوسف علی  
 خاں نے ایک کمری سانس لی اور سلسلہ کلام آناز کیا۔

”تکلیب صاحب! میں اس شادی پر تیار نہیں تھا اور نہ ہوں  
 مگر تم جانتے ہو کہ اولاد کے لئے انسان چوری کرنے پر بھی تیار  
 ہو جاتا ہے۔ زبیدہ کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب اس کی  
 خوشی میری خوشی ہے۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ وہ تمہیں اچھا  
 سمجھتی ہے تو میں بھی تمہیں اچھا سمجھوں گا۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ وہ  
 میری زندگی ہے۔ اسے دکھ نہ دینا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ تم اسے  
 دکھ دو گے۔ کیوں؟ اس کی وجہ تم خود جانتے ہو۔ میں بتاؤں گا تو  
 بات دہریں آجائے گی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔“

انہوں نے مجھے اچھا خاصا لپکھردے ڈالا۔ وہ ذرا سانس لینے  
 کوڑکے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں ”انسان کے اندیشے بعض  
 اوقات اسے کیس کا نہیں چھوڑتے۔ آپ ان اندیشوں کو ذہن  
 سے کھینچ ڈالئے۔ زبیدہ میری محبت ہے۔ اسے خوش رکھنا میرے  
 دل کی دھڑکن کی ضمانت ہے۔“

”خدا کرے زیاسانی ہو۔ میں یہ شادی بہت سادگی سے کرنا  
 چاہتا ہوں۔ زبیدہ بھی یہی چاہتی ہے۔ ابھی بارہ دن ہیں اس  
 مہینے اور پھر وہ کو آپ بارات لے کر آجائے گا۔ چائے آتی ہوگی  
 چائے پی کر پائے گا۔“ انہوں نے بڑی آسانی سے تمام معاملات  
 پاٹے کر لئے۔

”مجھے نظر ہے۔ لیکن اس درمیان میں میں ایک بار  
 زیادہ سے ناچاہتا ہوں۔“

”یہ نہیں زبیر تو ممکن نہیں۔ ہماری چند روایات ہیں جن کی  
 پاس داری نسواں کی ذاتی فرض ہے البتہ میں اتنا کر سکتا ہوں  
 اتنے کچھ بھی دیتا ہوں۔ آپ ہمیں فرمائیں۔“ اس نے بے ساختہ  
 ہی وہ اور بھائی کمرے سے چلے گئے۔

تعمیرات کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہ کیا گیا۔ زبیدہ کا تعلق  
 سٹراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی لیکن مجھ پر نگاہ پڑتی

یہ جیسے کہ میں آئی۔  
 کیا ہو گیا ہے گلپ تمہیں یہ کیا حالت بنا کر رکھی ہے؟  
 کیا ہو گئے؟

”تم میری بھالی کا ایسا نام کوئے مجھے علم نہیں تھا۔ تب  
 مجھے اپنی محبت پر گھپنے حسن پر اور تمہاری نکال داری پر یاد پڑا  
 ہے۔ ہم نیت گئے ہیں گلپ۔ اب ہم ایک ہی ذمہ کی شہد  
 کریں گے۔ تم کیا ہو یہ میں تم سے کبھی نہیں پوچھوں گی لیکن تم  
 اپنے عمل سے ثابت کرنا کہ تم وہ نہیں ہو جو بھالی جان تمہیں  
 کچھ رہے ہیں اس کی آنکھوں میں آنسو بھرتے۔ باتیں کرنے  
 کے لئے عمر بڑی تھی اس وقت تو میں لے کر بھرتے۔ باتیں کرنے  
 تھا پھر بھی کتنی ہی دیر ہم سر جوڑے سرگوشیوں میں ایک  
 دوسرے کا نوجو بنا کرتے رہے۔ کبھی نہیں کبھی سسکیوں کے  
 درمیان نہ جانے کتنا وقت گزر گیا اور ہم پھر لے کے لئے جدا ہو  
 گئے۔ جیسے تیرہوں کی ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ بھالی کی  
 توازن نے ہمیں چھٹا دیا۔ ہم اندر آسکتے ہیں؟“ اوڑھ اندر  
 آگئیں۔ زبیدہ کسی کھپتی کی طرح اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ بھالی  
 چائے کی ٹرائی کے ساتھ اندر آئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں بھالی  
 جان بھی آگئے۔ زبیدہ چائے پر موجود نہیں تھی مگر اس وقت  
 چائے اچھی لگی۔ چائے کے بعد حسب ساقی یوسف صاحب پور  
 بھالی مجھے خدا حافظ کہنے دوازے تک آئے۔ میں نے پلٹ کر  
 دیکھا۔ ٹی وی لائونج سے زبیدہ نے مجھے تھکے تھکے سپو کیا اور میں  
 نے گھر کی دہلیز چھوڑی۔

ملاقاتوں پر پابندی تھی، ٹیلی فون نہیں۔ ان پندرہ دنوں  
 میں تقریباً روز زبیدہ کے ٹیلی فون آتے رہے۔ چیلوں اور  
 انتظامات کے جمیلوں میں یہ پندرہ دن پندرہ منٹ کی طرح گزر  
 گئے۔ محض پندرہ دن کی محفل مدت میں میں کھل ہو گیا۔ شادی  
 بیاہ کے گیت گانے والا میرے گھر میں کون تھا۔ نہ مندی ہوئی نہ  
 آٹن۔ چند دوستوں اور ملازموں کی معیت میں علاج کے مراحل  
 طے ہوئے۔ زبیدہ عوسی جوڑے میں، حنا کے رنگ میں بھی  
 میرے گھر میں داخل ہوئی۔ کوٹھی کے باہر لگی میرے نام کی تختی  
 آج بد شہینوں میں نماگنی۔ آج مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی ماں یاد آئی،  
 وہ نور میں یاد آئیں جو میری ماں کو مڑھ ستاتی تھیں۔ ”نذیرن“  
 تیرا منٹا بڑا بھانگوان ہے۔ میں نے آج کائنات کو چھوڑی تھی۔  
 میں فقیر کی اولاد نہیں، پھان زادی بیاہ کر لایا تھا۔ میرا باپ جب  
 کراچی بھیک مانگتے آتا تھا تو بہت سارے نوٹ لے کر جاتا تھا  
 لیکن میں نے کراچی کی ساری دولت کللی مگر بھیک سے نہیں  
 زیانت سے۔ اب کوئی فقیر یہاں سے کچھ نہیں لے جائے گا۔  
 اب کوئی نذیرن جیسے کے ایچ میں کراچی کا منٹ نہیں کرے گی۔  
 اب میرے بچے فقیر کی اولاد نہیں، عید کی اولاد نہیں، تکلیب علی  
 خاں کی اولاد نہیں۔ میں نے اس کی انٹی تمام کر ”اندھے سناہوں“

کی بعد کہ "کی صدا نہیں گائی گے۔ اب میرے بچوں کے گھر  
 مدد مانی ہے گی۔ کسی شکرانی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں  
 آئے گی "میں نے سوجھے گھر مانی نہیں ہے؟" اب میرا کوئی بچہ  
 کو ڈھونڈنے کے لئے نہیں بلکہ گا "دور دور کی ٹھوکرین نہیں  
 کھائے گا" لے پاک نہیں کھائے گا۔ اب کوئی پوسٹ علی خاں  
 پورا نہیں ہو گا جو انہیں طعنہ دے سکے۔

خیالوں کے اس بھنور سے نکلتا تبہاں نہ ہوتا "اگر خواب  
 گاہ میں موجود میری تقدیر میرا انکار نہ کر رہی ہوتی۔ میں خوش  
 بختی کے ساتھ ہی تے تو ام کرنے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔  
 صبح نمودار ہوتے ہی بھالی چھ مورتنوں کے ساتھ "کلیب ہالا"  
 میں قہقہے بکھیرنے آ موجود ہو گئی۔ میری تقدیر میرے پہلو میں  
 تھی کہ کسی ملازم نے اعتراف کیا مجھے ان کے بچنے کی اطلاع دی۔  
 آج تو بھالی کارنگسی لود تھا۔ ان کے شرر جھلپوں نے بار بار مجھے  
 خقیق کیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بھالی کا وجود کسی گھر میں کتنا  
 دھان پور لود کتنا ضروری ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ  
 رشتوں کی حرمت سے اس کے جس سے ہوا سنگی میں کتنی دور  
 چلا گیا تھا۔ بھالی مجھ سے دن بھر کے لئے میری تقدیر مانگ کر لے  
 گئی۔ دن چھپنے تک وہ تقدیر بھر میری طبیعت میں تھی۔

زبیدہ کو پانے کے بعد میں فطری طور پر نہایت خوش تھا۔  
 زبیدہ نے بھی اپنی نہایت اور نہ مت گزاری سے میرے گھر کو  
 جنت بنا دیا۔ وہ ایک ذہین لڑکی ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے میری  
 تمام خامیوں سے قہقہے قہقہے میں خود غرض تھا "میں نے  
 اس کے اعلیٰ نسب ہونے کے ذریعے سے اپنا شجوقب درست  
 کرنا چاہا تھا۔ اس کے ظلموں نے مجھے بے دام خرید لیا۔ بھالی  
 جان کچھ دن کچھ کچھ سے رہے لیکن پھر بہت بہت ان کی شکل  
 دور ہو گئی۔ تمام معاملات درست ہو گئے تھے۔ میری کشتی حیات  
 پر بھنور سے سلامت گزر آئی تھی اور اب باطل مراد کی جانب  
 سبک دہی سے خراماں خراماں گھس رہی تھی کہ پھر بھنور اٹھنے لگے۔  
 سو جس آنکھیں دکھانے لگیں۔ یاد چلتے چلے گی۔ پہنچ کج  
 رفتار کب کسی کو ایک حال پر رہتا ہے۔

ایک روز میں دفتر سے گھر وقت سے پہلے آیا۔ زبیدہ گھر میں  
 موجود نہیں تھی میں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہو سکتا ہے اپنے  
 بھائی کی طرف ہلی گئی ہو کسی سہیلی سے ملنے کی طلب ہوئی ہو یا  
 کوئی شاپنگ وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ٹھیک اس وقت واپس  
 آئی جو میرے دفتر سے گھر لوٹنے کا وقت تھا۔ آتے ہی اس نے  
 معذرت کہی کہ وہ ایک سہیلی کی طرف گئی تھی۔ بات آئی گئی  
 ہو گئی لیکن ایک مرتبہ پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے بھالی جان کی  
 طرف ٹیل فون کیا۔ معلوم ہوا وہاں نہیں پہنچی۔ تب میرے دل  
 میں ایسے ٹھنڈے نے سر اٹھایا۔ ذرا سوچ رہے معلوم کیا تو اس کا بیان  
 عجیب تھا "صاحب! بیگم صاحبہ انہوں دوسری دن کس جاتی ہیں۔

کہاں؟ معلوم نہیں۔"  
 "تم ان کے ذرا سوچو ہو گاڑی تم کیوں نہیں چلائے؟"  
 "ایک مرتبہ میں نے کہا تھا تو مجھے ڈانٹ دیا کہ ہر جگہ تمہیں  
 لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

میں نے نوکروں سے زیادہ پوچھ بچھ کو مناسب نہیں سمجھا  
 لیکن اس کا اس طرح وقتے وقتے سے پراسرار طوڑ پر قابض ہونا  
 اچھا لگتا نہ تھا اس لئے اسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔  
 اس روز وہ واپس آئی تو پھر مجھے موجود پایا۔  
 "ارے آپ کب آئے؟ آج کل آپ دفتر سے جلدی  
 کیوں آجاتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ جلدی کب آیا بس ابھی پہنچا ہوں، کپڑے بھی  
 تبدیل نہیں کئے۔ اور تم کہاں گئی تھیں؟" میں نے نہایت  
 ملاحظت سے پوچھا۔  
 "ذرا بھالی جان کی طرف گئی تھی۔"

اس کے اس جھوٹ نے میرے اندیشوں کو ہمیشہ دی۔ آدمی  
 جھوٹ صرف جرم چھپانے کے لئے ہوتا ہے۔ مجھے صرف جھوٹ  
 کا علم تھا "جرم کا نہیں۔ میں نے اس جھوٹ کا پردہ چاک نہیں  
 کیا۔ اس طرح وہ ہوشیار ہو جاتی۔ میں نے مناسب موقع کی  
 تلاش شروع کر دی لیکن زبیدہ کے اس رویے نے مجھے ایک مرتبہ  
 پھر توڑ پھوڑ دیا اور لطف تو یہ ہے کہ میرے اس طرح ٹوڑنے کا  
 اسے احساس بھی نہیں ہوا۔

میں نے ذرا سوچ کر احساس میں لینے کی مجھوری قبول کر۔ میں  
 نے اس سے کہا "اب جس روز بیگم صاحبہ باہر جائیں تو مجھے ٹیلی  
 فون کرنا اور انہیں کسی طرح باتوں میں لگا کر روک لینا۔ بس  
 اتنی دیر کے لئے کہ میں یہاں پہنچ جاؤں۔ دفتر سے گھر تک بہ  
 مشکل دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔ میں اپنی گاڑی لے کر دس منٹ  
 میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ گھر کے قریب گاڑی پارک کر کے ان کے  
 نکلنے کا انتظار کروں گا۔ جیسے ہی وہ نکلیں گی میں ان کا تعاقب کر  
 کے یہ دیکھنا چاہوں گا کہ وہ کہاں جاتی ہیں۔"

گئی۔ ان گزر گئے لیکن زبیدہ کے باہر جانے کی اطلاع مجھے



"پلو وہ حتمہ شاید خالی ہے"

میں ملی۔ اب تو مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ کیسے ڈرائیج رہی اس سے ملا ہوا تو نہیں ہے، دانستہ مجھے اطلاع ہی نہ کرتا ہو۔ بالآخر ایک روز مجھے یہ اطلاع ملی۔ میں نے اپنے نمبر کی گاڑی ملی تاکہ اگر وہ جتنی آہنے سے دیکھے بھی تو اسے شک نہ گزرے۔ میں دفتر سے نکلا اور گھر سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد اس کی گاڑی کو ٹھی کے مرکزی دروازے سے نمودار ہوئی۔ ڈرائیجنگ سیٹ پر وہ خود موجود تھی۔ میں نے ایک مناسب فاصلے پر رہتے ہوئے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا لیا تھا تاکہ وہ اچھٹی سے بھٹک پر مجھے پہچان نہ لے۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہی تھی، جیسے اسے کیسے پہنچنے کی یا واپس آنے کی جلدی ہو۔ کئی مرتبہ وہ میری نگاہوں سے قائب ہوئی لیکن میں نے کمال ہوشیاری سے اسے جالیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ کوئی اس کا تعاقب بھی کر سکتا ہے۔ اس کی گاڑی شہر کی حدود سے نکل کر مضافات کی طرف دوایں دوایں تھی۔ میں نے دیکھا اس کی گاڑی نے بائیں طرف مڑنے کا سگنل دیا، رفتار دھیمی ہوئی اور بالآخر رک گئی۔ میں نے بھی کچھ فاصلے پر گاڑی کو روک لیا۔

سامنے چند جھکیاں تھیں۔ ان جھکیوں میں زیادہ تر فقیر پیشہ اور نئے باز لوگوں کا بڑاؤ تھا۔ میں نے اس بہتی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، دیکھ آج رہا تھا۔

زیدہ نے گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے پارک کیا۔ گاڑی لاک کر کے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جھکیوں میں کہیں قائب ہو گئی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہاں وہ کس سے ملنے آئی ہے؟ وہ نشے کی عادی تو نہیں کہ نشہ اسے یہاں کھینچ لانا ہو۔ میں اس قسم کی جھکیوں کے اسرار سے خوب واقف تھا کہ میری فقیر اسی خیر سے ہوئی تھی۔ میں ہمتا سوچتا جاتا تھا ابھن بڑھتی جاتی تھی۔ تہہ پتا ایک کھنڈے کے بعد وہ ایک پتلی سی گلی سے برآمد ہوئی۔ ابھن تو کیا رہ گیا تھا۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس آ گیا۔ اب میں کسی کا تعاقب نہیں کر رہا تھا بلکہ ہر گاڑی میرا تعاقب کر رہی تھی۔ ہر گاڑی مجھ پر تھوکتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں سیدھا دفتر پہنچا اور وقت متعینہ پر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچنے پر اس نے میرا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو وہ۔ فقیرا کی ہوئی تھی، نہ نشے میں لگتی تھی اور نہ خیر معولی خوش۔ بس عام دنوں کی عام سی زیدہ تھی وہ!

”کہاں گئی تھیں تم؟“

اس اچانک سوال سے وہ بوکھلا گئی، ”کیسے بھی نہیں، میں ہوں میں۔ کہاں جاتی۔“

”مجھے فریب نہ دو، بس اتنا بتا دو کہ آج اب سے کچھ دیر پہلے تم کہاں تھیں۔“

”میں نے کہا نا، کہیں نہیں گئی تھی۔“

”مجھ سے جھوٹ نہ یو لو، مجھے فریب مت دو۔“

”کیسے جھوٹ نہ یو لو، مجھے فریب کیسے فریب نہ دوں۔ یاد ہے تم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا، ”زیدہ! ابھن فریب ایسے ہوتے ہیں جو اگر انسان دو سولہ گونہ دے تو آوی کا دم نکل جاتے۔“

”مگر میں دو سرا نہیں ہوں۔“

”یہی اس وقت میں نے کہا تھا۔“

”اس وقت تم میری ہی نہیں تھیں۔“

”بس یہی میں سنا چاہتی تھی کہ اب میں تمہاری محبوبہ نہیں

صرف ہوئی ہوں ہی!“

”مجھے بیکار باتوں میں نہ الجھاؤ۔ مجھے سچ چاہئے ہے۔“

”سچ چاہئے ہے تو سنو! میں اپنے باپ سے ملنے گئی تھی۔“

میرا نہ حیرت سے نکل گیا۔ ”باپ سے! مگر تمہارا باپ تو“

”مرا نہیں، ابھی زندہ ہے۔ بس یہی کافی ہے یا تفصیل بھی

سنو کے؟ لو سنو تفصیل، ٹیکسٹ علی خان، سنو تفصیل۔ میرا باپ

ایک ہدی پستی فقیر ہے۔ جن جھکیوں کے پاس ابھی تم نے مجھے

دیکھا تھا انہی غلیظ جھکیوں میں میری پودرش ہوئی۔ یہاں ہمارے

جیسے کلی اور گھر بھی آباد تھے۔ چاہتی جھیرن، چاہتی خیرائی اور ماسی

وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی ماں بھی یاد ہے جو میرے

کنڈے پر ہاتھ رکھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔ بھیا کو اس کام سے

نظرت تھی۔ وہ گھر سے بھاگ گئے۔ پڑھ لکھ کر ابھی تو کئی

ڈھونڈی۔ ابابھیک کے ٹکڑے چھولنے کو تیار نہیں تھے۔ بھیا کیا

کرتے، مجھے اس جوہڑ سے نکال لائے۔ ماں کب کی مرکھپ گئی

تھی۔ میں وہاں کس کے سارے رہتی۔ جب تک بھائی کے گھر

میں رہی ابا کو صرف خواب میں دیکھتی رہی۔ اب اپنے گھر کی ہوئی

تو سوچا، خود مختار ہو گئی ہوں، صاحب حیثیت بھی ہوں، کبھی کبھی

باپ کو دیکھ بھی آیا کروں گی اور اس فقیر کی مدد بھی کر دیا کروں گی۔

بانیوں کے دل بیٹوں کی طرح تھوڑی ہوتے ہیں، پھر اس نے

میری لدلی کو کاہل حاضریں دیا، میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، مجھے

پینے سے لگا کر دو آنسو نہ بھاسا مگر ہے تو میرا باپ ہی نا۔ کیا صرف

مٹلے دو مٹلے والے ہی باپ ہوتے ہیں، فقیر باپ نہیں ہوتے۔“

وہ نہ جانے کیا کچھ اور کب تک کہتی رہی۔ مجھے تو اتنا یاد ہے

کہ میرے خواب لوٹ گئے تھے۔ میرے سامنے زیدہ نہیں ایک

بھکانا بیٹی تھی جس کی آنکھیں اندر کی طرف دھکی ہوئی تھیں،

جس کے جسم پر کونڈے کے بد نما داغ تھے۔ ہونٹوں پر صدا، ہاتھ

میں کھکھول تھا۔

میں پھر سے فقیر ہو گیا تھا۔ خیرین بھکانا کی انگلی تھامے

مدد مانگا رہا تھا، ”اندھے اندھوں کی مدد کرو، اندھے اندھوں پر رحم

کھاؤ۔“



آج کے مہذبہ دور میں ایسے لوگ جس اور بچے ہیں  
 لوگوں کی کسی نہیں جو بے اندازہ دولت رکھتے ہوں  
 مزید دولت کے لیے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو  
 زہر پلا رہے ہیں۔ ان ہست ذہنیت، سنگ دل لوگوں  
 کی ہوس اور زبردستی معصوموں کو زندگی جیسی نعمت  
 سے محروم کر دینے کا سبب بنتی ہے۔ انہیں کچھ  
 احساس نہیں۔

## کاروبار اجل

یہ فیورٹی میں عجم اقتصادیات کی کلاس لیتا تھا۔ ماہر  
 اقتصادیات تو نہیں تھا تاہم اس مضمون میں اس کی استعداد  
 بہت اچھی تھی۔ حتمی کے بعد ہم دونوں نے اپنی آئندہ زندگی  
 کی منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے بچے ہوں جن  
 پہ میں بھروسہ تو جہاں۔ یورپ میں عام ماؤں کے دیوں  
 کے برعکس مجھے بچوں کی پرورش، نگہداشت، تعلیم اور تربیت  
 بلا اولاد است اپنی نگرانی میں کرنا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے مجھے  
 ہر وقت گھر پر رہنا ہوگا جبکہ معاش کی تمام تر ذمہ داری عجم  
 اٹھانے پر رضامند تھا۔ میں نے عجم کے منصوبے سے اتفاق کیا تھا،  
 لیکن اس میں اتنی تبدیلی کر دی تھی کہ ہم دونوں کے صاحبزادے  
 ہونے تک میں ملازمت کروں گی اور اپنی آمدنی اپنے بچوں  
 کی خاطر جمع کروں گی

چنانچہ میں نے اپنے والدین اور منگیتر کی اجازت سے  
 ایک نئی کمپنی میں شام کے وقت دو گھنٹوں کے لیے کلرک کی  
 حیثیت سے ملازمت کر لی۔ کمپنی نے مجھے بڑا اچھا معاوضہ دینا  
 منظور کیا تھا۔ یہ کمپنی جس کا نام ٹریڈ انٹرنیشنل تھا۔ آمد اور  
 برآمد کا کاروبار کرتی تھی۔ اس کے پانچ ڈائریکٹر تھے جن میں  
 تین ڈچ اور دو بھارتی تھے۔ ان دونوں بھارتیوں کی قومیت  
 انگلش تھی۔ یعنی یہ دونوں پیدا تو ہندوستان میں ہوتے تھے  
 لیکن پچیس برس پہلے ترک وطن کر کے انگلستان آ گئے تھے  
 اور وہیں کی قومیت اختیار کر لی تھی۔ اب وہ یورپ کے مختلف  
 ملکوں میں درآمدی و برآمدی کاروبار کر رہے تھے۔ فرانس میں  
 بھی انہوں نے اسی نام سے ایک فرم قائم کی ہوئی تھی جس میں  
 ان دونوں کے علاوہ تین فرانسیسی ڈائریکٹر بھی تھے۔

اس فرم کا ایک منیجر تھا جو میرا ہم وطن تھا اور مجھ پر بہت  
 مہربان تھا۔ اس دفتر میں میرے علاوہ متعدد لڑکے اور لڑکیاں  
 پارٹ ٹائم ملازمت کرتے تھے۔ مستقل ملازموں کی تعداد بارہ  
 تھی جن میں چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ میرے ذمے فیر ملکی  
 فرموں اور افراد سے خط و کتابت کی فائلوں کی دیکھ بھال اور

## میسرا نام جنی طور ہے میری عمر آئندہ اکتوبر کی چار

تاریخ کو پچیس پچیس برس کی ہو جائے  
 گی۔ میں بالینڈ کے دارحکومت ایسٹروم کے ایک نوٹر گریڈ  
 اسکول میں ٹیچر ہوں۔ میرے والدین جو بہت ضعیف ہیں بقید  
 حیات ہیں۔ دونوں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرے والد  
 اور والدہ کو جو پاشن ملتی ہے اس میں وہ بجز لڑا کر بیٹے ہیں،  
 کیونکہ ان کے اخراجات بہت محدود ہیں۔ میں ان کی واحد  
 اولاد ہوں جس پر ان دونوں نے دل کھول کر خرچ کیا تا کہ میری  
 پرورش، تعلیم اور تربیت میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔ تاہم انہوں  
 نے میری ذات میں وہ کمزوریاں پیدا نہیں ہونے دیں، جو  
 والدین کے بے جالاؤگی وجہ سے اکلوتی اولاد میں اکثر پائی  
 جاتی ہیں۔ میری گھر بولونڈنگ ایک خاص نظم و ضبط کی پابند  
 رہی۔ جب میں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر لی تو ہمارے ملک  
 میں حکومت کے خرچ پر ہر شہری کو مفت فراہم کی جاتی ہے  
 تو میرے والد نے خود ہی یہ فیصلہ کیا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل  
 کر کے تعلیمی کا پیشہ اختیار کروں۔ میری والدہ ایک تربیت یافتہ  
 لرس تھیں اور والد ڈاکٹر تھے، لیکن انہوں نے میرے لیے ان  
 تینوں کو پسند نہیں کیا۔ جب میری عمر تیس سال کی تھی اور میں  
 بیورسٹی میں پڑھ رہی تھی تو مجھے اپنے ایک نوجوان پیکر پر، عجم  
 بیویزی گریڈوں سے محبت ہو گئی۔ جو عام طور سے عجم بی کھانا  
 تھا۔ میری اکیسویں سالگرہ پر ہم دونوں نے باقاعدہ منگنی کا اعلان  
 کر دیا۔ میری اتنی اور ڈیڑھی نے اس اعلان پر بڑی خوشی کا  
 اظہار کیا اور ہم دونوں کو قیمتی تحائف دیے۔

ہر چند کہ میرے والدین نے بڑی بھروسہ اور پڑا سائش  
 زندگی گزار دی تھی، لیکن ہمارا تعلق ہمیشہ متوسط طبقے سے رہا۔  
 میرے والدین کا بنک بیلنس کبھی اس حد کو عبور نہ کر سکا جس  
 کے بھان کا شمار امیروں میں ہو سکتا۔ یہی بات کیا کہ تھی کہ بالینڈ  
 جیسے منگے ملک میں وہ مجھے اپنے خرچ پر یونیورسٹی کی تعلیم دلا  
 رہے تھے اور وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد۔



Eqb J/MEhdj

انہیں جلنے والے خطوط کی نقلوں کو صحیح فائلوں میں ترتیبی  
نہیں کے ساتھ لگانے کا کام تھا۔ اس دفتر سے ہر روز  
تقریباً دو درجن خطوط جلتے تھے اور لگ بھگ اتنے ہی  
موصول ہوتے تھے۔

یہ فرم دنیا کی ہر شے درآمد کرتی تھی۔ اسی طرح ہالینڈ  
سے برآمد ہو سکنے والی ہر چیز دوسرے ضرورت مند ملکوں کو  
برآمد بھی کیا کرتی تھی۔ اس میں کسی خاص جنس کی تخصیص نہیں  
تھی۔ البتہ مختلف چیزوں کے لیے علیحدہ علیحدہ شعبے ضرور قائم  
تھے۔ ان میں ایک شعبہ ادویات کا بھی تھا۔ اس شعبے کے ذمے  
ہالینڈ میں ..... ستیار ہونے والی ادویات کی برآمد اور  
دوسرے ملکوں میں تیار ہونے والی دواؤں کی درآمد دونوں  
ہی کام تھے۔ ایک دن اتفاق سے شعبہ ادویات کا اطالوی  
نژاد سربراہ مائیکل مہرینو ایک فائل لے کر میرے پاس آیا اور  
کہنے لگا کہ افغانستان کی ایک فرم ایک خاص قسم کا سیال جو  
کھانسی کے شربت میں بہتر اثر انگیزی کے لیے شامل کیا جاتا  
ہے برآمد کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ یہ ایک تجارتی راز ہے اور  
کھانسی کا شربت تیار کرنے والے فارماسیوٹیکل ادارے اسے  
ہاتھوں ہاتھ میں گئے لہذا میں اس فائل اور اس میں موجود تمام  
خط و کتابت کو انتہائی احتیاط اور رازداری کے ساتھ اپنی  
تحویل میں رکھوں۔ اس فائل کو کبھی کسی غیر متعلق شخص کو نہ  
دکھایا جائے خواہ وہ اس کمپنی کا ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ مائیکل  
یہ ہدایات اور فائل دے کر چلا گیا اور میں اپنے فطری عجب سے  
سے مجبور ہو کر فائل میں موجود خطوط کو غور سے پڑھنے لگی۔

فائل کے مطالعے سے مجھے پتہ چلا کہ پاکستان کے  
شمال میں افغانستان کی سرحد پر سنگلاخ پہاڑی دندوں میں  
جدید ترین آلات سے مزین ایک فیکٹری قائم ہے جو اس  
علاقے میں پیدا ہونے والی ایک مخصوص بوٹی کا عرق کشید  
کر کے ایک ایک پونڈ کی بوتلوں میں بیک کرتی ہے۔ اس  
ایک پونڈ سیال کی قیمت پانچ ہزار امریکی ڈالر ہوتی ہے۔  
اسی فائل میں منسلک ایک خط سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ امریکہ  
میں اس سیال کی زبردست مانگ ہے اور وہاں کے تجارتی  
ادارے دس ہزار ڈالر میں ایک پونڈ سیال خریدنے کی پیشکش  
کر چکے ہیں۔

فطری طور پر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی ملک میں ایسی  
عجیب غریب بوٹی پیدا ہوتی ہے جس کے خواص اس قدر  
عیران کن ہیں اور اس کی قیمت جو اہرات سے بھی زیادہ ہے۔  
پھر یہ کہ اس سیال کی بلدیاری اور نقل و حمل بھی عید آسان

اور سستی ہوگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری فرم پانچ ہزار  
ڈالر میں یہ سیال خرید کر دس ہزار ڈالر میں امریکہ برآمد کرنا  
چاہتی ہے۔ ظاہر ہے اتنے کثیر منافع والا کاروبار ایک ایسا  
تجارتی راز ہے جو اعلیٰ درجے کے حفاظتی انتظامات کا تقاضا  
کرتا ہے۔ فائل پڑھ کر میں نے ایک محفوظ الماری میں  
مقفول کر دی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

میں برسہا برس پہلے بچے دفتر جاتی اور پانچ بجے تک کام  
کرتی۔ میری پڑھائی بھی جاری تھی اور ہم سے ملاقاتیں بھی۔  
یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا جس  
کے بعد مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ میں نے اپنی جزوقتی ملازمت  
سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ایک مخصوص بینک اکاؤنٹ  
میں جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بینک میں اکاؤنٹ  
کھولنے کے لیے ہم خود میرے ساتھ گیا تھا۔ اس نے ہی بینک  
کے فارم بھرے تھے۔ اس دن میں بے حد خوش تھی۔ مجھے  
اپنا مستقبل بہت تابناک نظر آ رہا تھا۔

ہر ہفتے جمعہ سے پوچھتا رہتا تھا کہ بینک میں پیسے  
جمع کر لے یا نہیں۔ میں اپنے اکاؤنٹ کو زیادہ سے زیادہ  
بڑھانے کی فکر میں مبتلا رہتی تھی۔ اگرچہ جمعہ کو بھی کچھ کم کرنے  
تھی۔ میں ہر ہفتے اپنی تنخواہ کا چیکسے کر بیٹے بینک جاتی  
پھر گھر آتی تھی ایک سال اسی انداز سے گزر گیا، اور میں امتحان  
دے کر فارغ ہو گئی۔ نتیجہ آنے میں کئی ہفتے تھے۔ میں چاہتی  
تھی کہ جب تک نتیجہ آئے اور میں کسی اسکول میں بطور ٹیچر  
کام شروع کروں فرصت کے ان دنوں میں بھی کام کر کے مزید  
پیسے کمائوں۔ چنانچہ میں نے اپنی فرم کے مینجر سے بات کی۔

وہ مجھے کل وقتی ملازمت دینے پر رضامند ہو گیا اور میں  
جلد سو گھنٹہ کی ہفتہ پر ملازم ہو گئی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں  
تک نہ چل سکا۔ نتیجہ آنے کے بعد مجھے لازمی طور پر سرکاری  
اسکول میں ملازمت کرنا پڑی۔ بطور ٹیچر میری تنخواہ خاصی  
اچھی تھی اور کام بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اب میں  
جزوقتی ملازمت نہیں کر سکتی تھی۔ ہالینڈ میں سرکاری ملازمین  
پر اس قسم کی پابندی ہوتی ہے۔ مجبوراً مجھے پرائیویٹ فرم  
سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران میں متواتر  
یہ سوچا کرتی تھی کہ میں اپنے ناقص وقت کو کیش نہیں کر سکتی۔

مجھے صرف اپنی تنخواہ پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے جو میرے  
اپنے اخراجات کے لیے تو بہت کافی تھی لیکن مستقبل کے  
لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے والا منصوبہ معطل  
ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تک میں پانچ ہزار گڈر کے لگ بھگ

ہی جمع کر پاتی تھی کہ حالات بدل گئے۔ میں نے جم سے مشورہ کیا تو اس نے سختی کے ساتھ میری اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ میں اسکول کی نوکری چھوڑ کر اپنی پہلی ملازمت پر واپس چلی جاؤں جہاں میری آمدنی میں اضافے کے بہت امکانات تھے۔ جم نے مجھے متنبہ کیا کہ وہ سوتدریس کا معزز پیشہ چھوڑ کر میں عام نوکریوں کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں خواہ اس میں کتنا ہی فائدہ نظر آئے۔ جم کا مشورہ اولیٰ طور پر صحیح تھا۔ ڈیج معاشرے میں جو توجیر استاد کی ہوتی ہے وہ کسی کپنی کے بڑے سے بڑے افسر کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جم چونکہ خود بھی اسی پیشے سے وابستہ تھا اس لیے اب بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کی ہونے والی شریک حیات بھی اس کی ہم پیشہ ہو اور یوں سوسائٹی میں شامل ہونے والے اس نئے خاندان کی قدر و منزلت مثالی ہو۔

جم کی مخالفت سے میں مجبور ہوئی اور خاموشی کے ساتھ اسکول کی ملازمت کرتی رہی۔ ملازمت کے ایک سال بعد جم نے شادی کا ذکر چھڑو دیا۔ اب ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ اپنی شادی کو مزید ملتوی کرتے۔ میرے ضعیف والدین بھی یہی چاہتے تھے کہ میں اب رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر باقاعدہ وقتے دار زندگی میں داخل ہو جاؤں۔ میں خود بھی اب شادی کر لینا چاہتی تھی۔ دو ڈھائی سال کے عرصے میں جم نے میرے ساتھ جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا تھا اس نے میرے دل میں اس کے لیے اچھے نقش ابھار سکے تھے۔ لیکن ابھی میں اتنی رقم جمع نہیں کر سکی تھی کہ شادی کے اخراجات کے بعد آئندہ کے لیے کچھ بچ سکے۔ ایک دن جم کے تعلق کے جواب میں میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو اس نے مجھے حیران کر دیا۔ جم نے بتایا کہ اس تمام عرصے میں وہ بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا رہا ہے اور اب اس کے پاس پندرہ ہزار گلڈر سے بھی زیادہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ جم نے کہا کہ شادی کے بعد آخر اس رقم کا کیا مصروف ہوگا۔ ظاہر ہے ہمارے ہی کام آئے گی۔

مارچ ۱۹۷۷ء کا ذکر ہے اسی سال ہمارے موسم میں ہم شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ ایک دن مائیکل مورینو نے مجھے فون کیا۔

”بے بی! تم مجھے بھول تو نہیں گئی ہو نہ؟ میں اسے یہ جان تو گئی تھی لیکن کئی برس بعد اس کی آواز سنی تھی اس لیے تیزی سے یقین کے لیے پوچھا۔“  
”تم ٹریڈ انٹرنیشنل کے شعبہ ادویات کے انچارج

مائیکل ہونا؟“  
”ہائیکل ٹیک سمجھیں میں فون! اب یہ بتاؤ پھر تم کون سے بلڈے میں کیا خیال ہے؟“  
”نا ممکن مٹر مائیکل! اب میں سرکاری ملازم ہوں۔ نئی ملازمت نہیں کر سکتی۔“

”تم سمجھ نہیں۔ میرا مطلب ہے تمہیں مشرق کا سفر کرنا ہوگا۔ کپنی ایک مزید سی کام کے لیے اپنا نمائندہ بھیجا چاہتی ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جسے عارضی طور پر فارغ کر کے بھیجا جاسکے۔ تم ہمارے لیے اجلسی نہیں ہو۔ پھر یا تیار ہو۔ ایک ہفتے کی چھٹی تو تم لے سکتی ہو۔ بڑا معقول معاوضہ ملے گا اور سفر خرچ اٹک۔“

مائیکل کی پیش کش مجھے خاصی پرکشش معلوم ہوئی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”ہائیکل ہائیکل مٹر مائیکل! ایک ہفتہ کیا ایک ماہ کی چھٹی بھی مل سکتی ہے، مگر مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

”تھوڑا صبر سے کام لو بے بی! اگر تم تیار ہو تو کل صبح دفتر آ جاؤ۔ آئے سارے بیٹھ کر بات ملے ہو جائے گی۔“

”میں ضرور آ جاؤں گی۔ بائی بائی مٹر مائیکل!“  
فون بند کرتے ہی میں سیدھی جم کے فلیٹ پہنچی۔ وہ گھر میں بیٹھا کچھ کھینے پڑھنے کا کام کر رہا تھا۔ مجھے خوش میں بھرا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”خیریت تو ہے جین! تمہارا سانس کیوں پھول رہا ہے؟“

”جم! مزہ آ گیا۔ مجھے صرف ایک ہفتے کے لیے کسی شرتی ملک جانے اور وہاں ٹریڈ انٹرنیشنل کی نمائندگی کرنے کی پیش کش کی گئی ہے۔ بہترین معاوضہ اور سفر خرچ علیحدہ۔ مزہ آ گیا نہ؟“  
جم آنکھیں جھپکانے لگا، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ وضاحت سے بات کر و جین! معاملہ کیا ہے۔ کہیں کوئی چکر بازی تو نہیں ہے اس میں؟“

”کوئی چکر و کر نہیں ہے۔ یہ وہی کپنی ہے جہاں میں پہلے بارٹ ٹائم کرتی تھی۔ وہ لوگ مجھ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے پاس فوری طور پر کوئی کارکن فارغ نہیں ہے جسے وہ بھیج سکیں لہذا انہوں نے ابھی ابھی فون کر کے مجھے آفر کی ہے۔“  
”اور تمہیں کرنا کیا ہوگا، میرا خیال ہے تم تجاسقی مذاکرات وغیرہ کی تکنیک سے تو واقف نہیں ہو۔“

”کل صبح مجھے کپنی بلایا گیا ہے۔ وہیں بتایا جائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آخر وہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے ضرور یہ جان لیا ہوگا کہ میں ان کا کام کر سوں گی۔ یہی لیے



مجھے آفری ہے انہوں نے۔

۰ بات بھی ٹھیک سے خیر تم کل جاؤ اور معلوم کروندہ کیا چاہتے ہیں مگر جہن ظفر سنگھ نامہ سے مشورہ کیے بغیر من سے کوئی تھی وعدہ دکر آنا۔

میں ایک چھوٹی سی بی بی کی مانند اس پیش کش پر خوشی سے اچھلنے کودنے لگی تھی تھی لکھنؤ کی کو تیار تھی تو خوش

ہم گیس سڈی ہی اجتہ عم کی طرح جو کونے لگے۔ انہوں نے بھی سعادت لکر کے میرا تک میں دم کر دیا۔ ڈیڈی بلر بار ہی کہتے تھے کہ اتنی دھکا سفر میں تنہا کیسے کوفل گی؟ میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ مجھے ہمیشہ چھوٹی سی بی بی سمجھتے رہیں گے؟

لگے دن میں نے اسکول سے چھٹی کر لی اور مقننہ وقت پر ڈیڈی انڈر نیکل کے دفتر پہنچ گئی۔ مائیکل میرا منتظر تھا مجھے دیکھتے ہی خوشیوں سے مسکرایا اور سانس کی خشک ت پر بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے میز کی دلاز سے وہی فائل نکالی جو کبھی اس لیے مجھے عموماً مفضل کر کے رکھنے کے لیے ہی تھی۔

۰ مس ظفر اہلیاں یہ فائل یاد ہے؟ اس نے فائل میز سے ایک فٹ بلند کر کے مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

میں مصلحتاً انجان بن گئی۔ میں کبھی نہیں مٹرا مائیکل! میری تحویل میں تو وہ جنوں فائلیں رہتی تھیں۔

۰ میرا مطلب ہے یہ وہ خصوصی فائل ہے جس کے لیے میں نے تمہیں کچھ ہدایات دی تھیں۔ شکر میری اجادت کے بغیر کسی کو یہ فائل نہ دکھانی جائے خواہ وہ دفتر کا آدمی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے دوسری فائلوں سے الگ مفضل کر کے رکھا جائے۔

۰ ہاں مٹرا مائیکل ایسا آ گیا۔ یہ شاید کسی جڑی بوٹی کے عرق کے بارے میں ہے۔

مائیکل نے مجھے تیز لنگھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو گویا تم نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔

میں گھبرائی، لیکن فوراً خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی۔ جی ہاں کچھ سرسری طور پر دیکھا تھا، اسے مطالعہ تو نہیں کر سکتے۔ چونکہ یہ ایک عجیب و غریب چیز کے بارے میں تھی اس لیے اتنی بات مجھے یاد رہ گئی۔ تفصیل کا بچے کوئی علم نہیں۔

۰ کیلئے خیر، تفصیل کا علم اب ہو جائے گا۔ مائیکل کچھ توقع کر کے دفتر میں موجود اساتذہ کا جائزہ لینے لگا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ ہماری طرف توجہ دینے کی کسی کو بھی فرصت نہیں تھی۔

مائیکل نے فائل میری طرف بڑھائی۔ یہ ٹواب اس

کا مطالعہ ذرا غم سے کرو میں باس سے مل کر آتا ہوں۔

باس سے مراد فرم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیرمین

سے تھی جو برطانوی قومیت کا بھارتی نژاد شخص تھیں بلکہ تھا۔

یہ شخص زیادہ تر غیر ملکی وعدوں پر رہتا تھا۔ میری ملازمت

کے دوران وہ صرف دو بار ہالینڈ آیا تھا۔ میں اسے پہچانتی

تھی۔ وہ طویل قامت تقریباً پینتالیس سالہ صحت مند شخص تھا۔

اس کے ہر سے ہر وقت بے پناہ سنجیدگی طاری رہتی تھی

جس میں قد سے تھی بھی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا اور اپنی فرم

کے مختلف شعبوں کے سربراہوں سے بھی عورت طلب کی

بات کرتا تھا البتہ کارکنوں سے براہ راست اسے بات کرتے

کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

وہ جب بھی ہالینڈ میں ہوتا بڑی پابندی سے صبح

ہونے دفتر آتا اور اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھتا۔ کوئی شخص

اجازت کے بغیر اس سے مل نہیں سکتا تھا اس کی سیکرٹری تو

ان کے ساتھ سفر میں بھی رہتی تھی۔ اس کے تمام پرانے کمرے

کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اس کا ایک ایک منٹ گنا ہوا ہوتا

تھا۔ ملاقاتوں اور ملاقاتیوں کے بارے میں وہ بہت محتاط

تھا کسی بھی طے دلے کو پہلے اس کی سیکرٹری سے ملنا پڑتا

تھا۔ اسے ہمیشہ یہ مشورہ دیتی کہ دفتر کے مقامی انچارج سے مل

کر اپنا مسئلہ حل کرے۔ جب وہ محسوس کرتی کہ باس سے ملاقات

ضروری ہے تو وہ پہلے کرنشن سنگھ کو تمام معاملہ سمجھاتی۔ وہ فائل

ہو جاتا کہ فاقصی یہ ایک ضروری ملاقات ہے تب کہیں جا کر

وقت مقننہ ہوتا۔ کرنشن سنگھ کے اس سخت رویے کی وجہ سے

فرم کے تمام ملازمین پر اس کا رعب طاری رہتا تھا اور اساتذہ

کے رکھنے یا نکلنے میں وہ کبھی دخل نہ دیتا۔ یہ کام اس کی فرم

کا منیجر خود اپنی صوابدید پر کرتا تھا۔ اس کا پارٹنر منوہر شاہا کبھی

کرنشن سنگھ کی طرح برطانوی قومیت رکھتا تھا اور زیادہ تر لندن

میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ کرنشن سنگھ کے ساتھ ہالینڈ آجاتا۔

لیکن کاروبار کے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

اس کے لیے کوئی کمرہ یا کیمین مخصوص نہیں تھا۔ وہ آتا تو کرنشن سنگھ

کے کمرے میں ہی بیٹھتا تھا۔ جب میں اس کیمپنی میں ملازم

تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ فرم کے لندن آفس کا کرتا دھرتی ہے

اور برائے نگوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ یہ کام صرف

چیرمین کرنشن سنگھ کے ذمے تھا۔ ہالینڈ میں اس فرم کا رجسٹریشن

ایک آزاد تجارتی ادارے کی حیثیت میں ہوا تھا جس میں ان دو

بھارتیوں کے علاوہ تین مقامی ڈائریکٹر بھی تھے۔ یہ تینوں

طرح ڈائریکٹر جنہوں نے فرم کے کاروبار میں کافی سرمایہ لگا رکھا تھا، کبھی کبھار دفتر آتے تھے۔ کٹن بنگلہ ان تینوں کو ان کے جھبھ کے مطابق منانے اور کرنا تھا لیکن عملی طور پر ان سے کوئی کام نہیں لیتا تھا۔

تفتیشی انسپکٹرز کا نوٹ ۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سزا پانے میں ہمدن ڈائریکٹروں کو اس کیس میں توث ہونے سے بچانا چاہتی ہے۔ یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بحیثیت ڈائریکٹر انہیں فرم کی کاروباری سرگرمیوں سے بالکل ہی لائق رکھا گیا ہو اور انہیں یہ علم ہی نہ ہو کہ جس فرم میں ان کا سرمایہ لگا ہوا ہے، اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں۔۔۔۔ (انچیکر)

مائیکل مجھے فائل دے کر چلا گیا تھا۔ میں اس کی میز پر فائل کھولنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اب اس فائل میں متعدد خطوط کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان خطوط میں ایک خط کابل کے کسی خیال خاں کا بھی تھا جس نے لکھا تھا کہ اس فرم کا نامزدہ اس سے ذاتی طور پر ملا تھا اور اس کی ٹیکسٹری کا معائنہ بھی کیا تھا جہاں اس مخصوص ہرب (بونی) کا عرق کشید ہوتا ہے جو ایلوپیتھی سسٹم آف میڈیسن میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ اس خط کے مطابق لندن اور نیویارک کے کئی لوگوں نے اس عرق کا استعمال کیا ہے اور اسے بہت مفید پایا ہے۔ خیال خاں نے پیش کش کی تھی کہ وہ ایک ہزار امریکی ڈالر میں ایک پونڈ عرق فراہم کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ خریدار کا نامزدہ خود کابل آکر ڈیکوری حاصل کرے۔ وہ کابل سے باہر کسی بھی جگہ بند بند ٹوک یا ہوائی جہاز یہ قیمتی عرق نہیں بھیج سکتا۔ یہ خط انگریزی میں تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نیم خواندہ شخص نے اسے لکھا تھا۔ بچوں اور گرامر کی متعدد غلطیوں کے علاوہ اس کی تحریر بھی بہت بھونڈی تھی۔ اس کا لیسٹریٹڈ چھاپا ہوا تھا جس پر خیال خاں اینڈ کمپنی۔ ایکسپورٹرز اینڈ ایمپورٹرز تحریر تھا۔ اس کمپنی کا پتہ چھاپا ہوا نہیں تھا، بلکہ مختصراً اسٹریٹ، کابل کے پتے کی تحریر ہوتی تھی۔

میں اس خط کے مندرجات اور اسے بھیجنے والے کے متعلق سوچنے لگی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں اس بارے میں بارے میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ کوئی اچھا کاروباری ادارہ نہیں ہے کیونکہ اس کے لیسٹریٹڈ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا کوئی

مستقل پتہ نہیں ہے۔ پتے کی مہر لگانے کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس فرم کا پتہ بدنام ہوتا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ عرق کشید کرنے والی ٹیکسٹری کا مالک ہونے کے باوجود یہ شخص یا ادارہ اب قائم کیا گیا کیوں ہے کہ غیر مالک کمپنیوں سے خط و کتابت کے لیے معقول ڈیکلری کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا؟

مائیکل کی والدی سے پہلے میں یہ اندازہ کر چکی تھی کہ مجھے کمپنی کا نامزدہ بنا کر کابل بھیجا جائے گا تاکہ میں ذاتی طور پر مال کی ڈیکوری لیں اور طیارے کے ذریعے اسے لایٹلے آؤن بظاہر بہت آسان کام نظر آتا تھا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر اس کام سے پچھا آواہ کر لیا۔ مائیکل باس سے بات چیت کے لیے جب واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ میں نے فائل بند کر کے اس کی طرف بڑھا دی جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے مجھے لٹھنے کا اٹھارہ کیا اور ایک ٹکٹہ کیمین میں لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے اس میں نے تمہارے کام کا مطالعہ کیا ہے تم ایک فیمن اور ذہنی دار لڑکی ہو۔ اصل تعلیم یافتہ ہو اور ہر قسم کے حالات کا بھاری سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو میرا مطلب ہے غیر مالک کے سفر میں اکثر غیر متوقع حالات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تمہاری ان صلاحیتوں کے پیش نظر میں نے باس سے تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں فرم کا نامزدہ بنا کر کابل بھیج دیا جائے۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں یہ کام انجام دے سکتی ہو کیا خیال ہے؟

میں نے اپنا اندرونی جوش دبا کر مائیکل سے پوچھا۔ مجھے تمہارا جانا ہو گا؟

یقیناً۔ یہ کوئی پیرس یا جینوا کا سفر نہیں ہے۔ یہ شرق کا سفر ہے جس پر بہت خرچ آتا ہے۔ ایک ہی کام کے لیے دو افراد کو بھیجے گا مطلب دو گنا خرچ ہے۔ پھر مسئلہ تمہارے معاوضے کا بھی ہے۔ ہر مہینہ زائد خرچ بچا کر تمہارے معاوضے میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

مجھے کیا معاوضہ ملے گا؟ آخر میں نے تمہارا ہاتھ بچکا کر پوچھ ہی لیا۔

میرا نام باس سے سفارش کی ہے کہ تمہیں دو ہزار ڈالر علاوہ اخراجات کے دیے جائیں۔ میرا خیال ہے باس اس تجویز کو منظور کرے گا۔

دو ہزار ڈالر؟ میں نے دل میں دہرایا۔ خدا نے میری کن ل تھی۔ اس رقم سے میرے بہت سے کام نکل سکتے تھے

پھر میں پورے اطمینان کے ساتھ جم سے شادی کر سکتی تھی۔ میں اپنے سفر خرچ میں بھی کفایت کر کے مزید رقم نہیں انداز کر سکتی تھی۔ مجھے سوچتے دیکھ کر مائیکل نے ٹکر مندی سے پوچھا: کیوں۔ کیا معاوضہ کم ہے؟

جواب میں میں ہنس دی۔ مائیکل! میں معاوضے کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہوں۔ وہ تو آپ نے جو تجویز کیا ہے مناسب ہی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ صرف ایک ہفتے میں میں مشرقی ملکوں کی کیا سیر کر سکوں گی؟

مائیکل نے تھکے لگا کر کہا: تاوان لڑکی! اس سفر میں سیر پلٹنے کی بات نہ کرنا۔ اس مقصد کے لیے ابھی بہت وقت بڑا ہے اس مرتبہ تو تمہیں مال لے کر فوراً واپس آنا ہے۔ ہمیں امریکی فرموں سے مقابلہ پیش ہے۔ اگر انہوں نے ہم سے پہلے سودا طے کر لیا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس سوڈے میں کمپنی کو لاکھوں ڈالر کے منافع کی توقع ہے۔ اگر تم نے کامیابی سے اس کام کو انجام تک پہنچا دیا تو... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں پورے ایک ماہ کے لیے مشرق کی سیر کا موقع فراہم کر دوں گا۔

وہ تو یہ بات ہے مائیکل! میں مفردت چاہتی ہوں۔ اب آپ اطمینان رکھیں میں مال لے کر ایک ہفتے بھی بلا ضرورت نہیں ٹھہرے گی اور فوراً واپس آ جاؤں گی۔ مائیکل خوش ہو گیا: ہاں بے بی! ہم ہی چاہتے ہیں کہ تم ایک فلائٹ سے جاؤ اور دوسری سے واپس آ جاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟ میں نے سوال کیا۔

”تمہیں روانگی کی تیاری شروع کر دینا چاہیے۔ تم سے بات کرنے کے بعد اب یہاں سے کابل ٹیلی گرام جلتے گا جس کا جواب آئندہ اڑتا لیس گھنٹوں میں آ جانا چاہیے۔ اس کے فوراً بعد تمہاری روانگی ہے، سمجھ گئی؟ میں مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی: میں چلی ہوں۔ جب ضرورت ہو آپ مجھے فون کر کے طلب کریں۔“



ٹریڈ انٹرنیشنل کے دفتر سے پہلے میں جم کے پاس گئی اور اسے مائیکل سے ہونے والی تمام گفتگو سنانی۔ میں نے محسوس کیا کہ جم فکرمند ہو گیا ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر مجھے غصہ سا آ گیا۔ کیا بات ہے جم! کیا تم مجھے ملنے والے اس چانس سے خوش نہیں ہو رہے؟ کیا اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی آسانی کے ساتھ اتنی رقم کسی اور ذریعے سے کمانا ممکن ہے؟ تم جانتے ہو جم دونوں کے لیے اس وقت رقم کی کیا اہمیت ہے۔ پھر بھی تم اس چانس پر خوش نہیں ہوتے۔“

جم مجھے بدستور سوچتی ہوئی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ پھر بولا: ڈیئر مین! میری فکرمندی کی وجہ صرف یہ ہے کہ آخر ایسی کیا خاص بات ہے کہ اتنے سے کام کا اتنا بھاری معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اپورٹ کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ مال بیچنے والا خریدنے والے کے نمائندے کو ذاتی طور پر ڈیوڑھی دے گا۔ دنیا بھر میں وہ آمدنی اور برآمدی تجارت محسوس اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔ بنکوں کے ذریعے رقم کی ترسیل عمل میں آتی ہے اور مال باقی ایتریا بحری جہازوں کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ میری خوشی یا ناخوشی کا سوال نہیں ہے میں تو معاملات کے اس فیئر منطقی پہلو سے پریشان ہوں۔

”ارے جم! تم مجھے کی کوشش کرو۔ مال بیچنے والی اپنی قطعی جاہل ہے۔ انگریزی کے دو جملے تو صحیح لکھ نہیں سکتی۔ تم جانتے ہو مشرقی مالک میں لوگ ہمارے جیسے نہیں ہوتے وہاں تو بے شمار لوگ کھڑے ہونے کے باوجود بنکوں میں ڈپوز نہیں رکھتے۔ بس یہی سمجھ لو کہ یہ پارٹی بھی ایسی ہی ہے۔ لہذا ہماری فرم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی شرائط پر ہی معاملہ طے کیا جائے۔ پھر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ منافع کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کمپنی آسانی کے ساتھ اپنا نمائندہ کابل بھیج سکتی ہے۔ اس طرح وقت بھی بچے گا اور امریکی فرموں سے مقابلہ بھی آسانی سے ہو سکے گا۔“

”تم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ جو مال تم لے کر آؤ گی اس کی نوعیت غیر قانونی نہیں ہے؟“

”ارے بھئی ظاہر ہے کہ باقاعدہ خط و کتابت ہو رہی ہے۔ صاف صاف لکھا جا رہا ہے کہ افغانستان کے پہاڑوں میں دارالمقدار میں پائی جانے والی بوٹی کا عرق ہے جس کی کثرت کے لیے وہاں ایک کارخانہ بھی نصب ہے۔ اس کارخانے کا معائنہ بہت سے مغربی مالک اور امریکی فرموں کے نمائندوں نے بھی کیا ہے۔ اگر یہ کوئی غیر قانونی کام ہوتا تو اتنے کھلے بندوں یہ فیکٹری کام کر سکتی تھی؟“

”بظاہر تو تمہاری ذیل وزنی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ کب مدانگی ہے؟“

”بظاہر چلے گا۔“

جم سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچی جہاں میرے ڈیڈی نے بھی جرح کرتے میرا ناک میں دم کر دیا۔ وہ اس پہلو پر زیادہ زور دے رہے تھے کہ ایک نوجوان تنہا لڑکی مشرق کے دیشوں پر کس طرح محفوظ رہے گی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں اپنے

ٹیڈی اور جی کو بھی رخصت کرنے میں کامیاب ہو گئی۔  
میں اس قدر خوش تھی کہ مجھے اپنی مدد ہواؤں میں اڑتی  
عسوں ہو رہی تھی۔ میں ایک ایک لمحہ گن رہی تھی۔ جب  
بھی فون کی گھنٹی بجتی میں لپک کر اٹھا تھی مبادا مائیکل نے  
طلب کیا ہو۔

میں نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی کے لیے درخواست  
بھی تیار کر لی تاکہ اگلے دن اسے منظور کرا لوں۔

میری توقع کے عین مطابق تیسرے دن ہی مائیکل کا  
فون آ گیا۔ اس نے ہدایت کی کہ میں اگلے دن کے ایل ایم کی  
فلائٹ سے کابل روانگی کے لیے تیار رہوں۔ اس نے بتایا  
کہ میرے لیے ویزا اور زر مبادلہ وغیرہ کا انتظام ایئر لائن کے  
اٹاٹھ نے کر دیا ہے۔ مائیکل کی ہدایت کے مطابق مجھے فون  
طور پر اپنا پاسپورٹ کے ایل ایم کے دفتر میں سیلز منیجر کو  
پہنچانا تھا۔

فون پر ضروری ہدایات ملنے کے بعد میں بڑے جوش و خروش  
میں گھر سے نکلی اور سب سے پہلے کے ایل ایم کے مقامی دفتر  
جا کر انہیں اپنا پاسپورٹ دیا اور سلیٹوں کے کاغذات پر دستخط کیے۔  
وہاں سے فارغ ہو کر اپنے اسکول پہنچی اور سٹریٹس کو دوڑنے  
کی چھٹی کے لیے درخواست دی۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ آخر  
مجھے اتنی طویل چھٹی کی کیا ضرورت پیش آئی لیکن میں نے بیٹ  
سٹریٹس اور اسکول میں اپنی دوسری ساتھی شیچول کو اپنے سفر  
کے بارے میں کہہ نہیں بتایا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں پھر جمع کے پاس گئی۔ وہ  
میری اتنی جلد روانگی کا پروگرام سن کر حیران رہ گیا۔ ٹارگٹ  
میرا خیال تھا تمہاری روانگی ہفتہ دس دن میں ہوگی اتنی جلدی  
تمہارے سفر کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے ہوں۔ انقالتان  
کے ویزے اور ہالینڈ کی ویزا سے داخلہ سے اجازت پھر  
زر مبادلہ کی منظوری... آخر اتنے اہم کام اتنی جلدی کیسے  
ہو گئے؟ یا پھر..."

"یا پھر کیا جمع؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں نے جمع کے  
اشتباہ کو محسوس کر کے سوال کیا۔  
"یا پھر یہ کہ تم کافی دنوں سے سفر کی تیاریوں میں خاموشی  
سے مصروف تھیں؟"

"خدا کے لیے جمع ایسی کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ نہ  
دو۔ دراصل ایئر لائن ولے میرے سفر کے تمام انتظامات خود  
کر رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی اپنا پاسپورٹ دے کر آئی ہوں۔  
انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ دوپہر تک ویزا مل جائے گا اور شام

تک یہاں سے روانگی کی اجازت، مکمل جہاز کی روانگی سے  
پہلے پہلے زر مبادلہ کی منظوری بھی حاصل ہو جائے گی ٹارگٹ  
کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ اتنی اجازت میں تم سے  
چھپاتی رہی ہوں۔ مجھے تو بونٹی مر مائیکل نے یہ آفر ہی تھی  
میں گھر جانے سے پہلے تمہارے پاس آئی تھی۔ دنیا میں تیرہ  
سب سے پہلے شخص ہو جسے میں نے اپنے سفر کے بارے میں  
بتایا تھا۔ جی اے ٹیڈی کو بھی بعد میں بتایا۔ میں نے قدم سے  
نہ ہانسی ہو کر جذباتی انداز میں جمع سے کہا۔

"ارے ارے میری گڑبگڑ یا ناراض ہو گئی؟ جمع نے مجھے  
مناتے ہوئے کہا، اللہ پھر وہ بھی میرے سفر کی خوشی میں برابر کا  
شریک ہو گیا۔

اگلے دن اسی ترتیب سے پروگرام مکمل ہو گیا۔ مجھے اے ٹیڈی  
پر رخصت کرنے صرف مائیکل آیا تھا جس نے ایئر پورٹ پر  
ہی ہنگ سے مقامی کرنسی کو امریکی ڈالروں میں تبدیل کرایا۔  
اس نے مجھے پندرہ سو امریکی ڈالر دے دیے تھے اللہ کا دل میں اعلیٰ  
درجے کے ہوٹل میں کمرہ بھی رینڈو کر کے مجھے کارڈ سے دیا  
تھا۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ بتانی گئی تھی کہ میرے  
کابل پہنچنے کے چند گھنٹوں کے اندر مجھے پچیس ہزار امریکی  
ڈالر نقد مل جائیں گے۔ یہ رقم میں خیال خاں اینڈ کمپنی کو پانچ  
پندرہ سڑق کی قیمت کے بطور ادائیگی اور ان سے پانچ توپوں  
لے کر کے ایل ایم کی اگلی فلائٹ سے جو تیسرے دن مجھے ملے گی،  
واپس پہنچ جاؤں۔ مائیکل نے مجھے بطور خاص یہ ہدایت بھی  
دی کہ میں مال کی ڈیویڈی عین اس دن لوں جس دن واپس  
روانگی کے لیے میری ایڈٹ کنفرم ہو جائے۔ پہلے سے مال بیکر  
اپنے کمرے میں نہ رکھوں۔

"آخر کیوں؟ میں نے پھر اچھے ہوتے مائیکل سے پوچھا۔  
"اوہ بے بی! تم نہیں جانتیں۔ وہ مشرق ہے، وہاں  
اچھے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس بہت قیمتی  
مال ہو گا۔ اس کی حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر  
طریقہ کار یہی ہو گا کہ تم عین روانگی کے وقت مال کی ڈیویڈی لو۔  
بات میری سمجھ میں آگئی۔ میرے ذہن میں مشرقی ممالک  
کی بہت خراب تصویر نقش کر دی گئی تھی۔ جہاز کی سیرٹھیاں  
چڑھتے چڑھتے میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ مال سے زیادہ  
خطرناک تو پچیس ہزار ڈالر کا کیش ہو گا جو مجھے کابل جلتے  
ہی مل جائے گا اور جسے میں دن تک مجھے حفاظت سے رکھنا  
ہو گا۔ جہاز میں اپنی نشست پر بیٹھ کر بھی میں ہی سوچتی  
رہی کہ اتنی بڑی رقم کی حفاظت میں کس طرح کروں گی۔ تمام

جہانک دماغی کے بعد مشرق دیکھنے کا جوش و خروش میرے  
تکرات پر غالب آ گیا۔



کابل ایئر پورٹ پر کے ایل ایم کے دفتر سے مجھے ایئر کمان  
میں ایک کمرکار نیشنل کارڈ دیا گیا اور ایئر لائن کی  
وین کے ذریعے ہی مجھے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ میں جب اپنے  
کمرے میں پہنچی تو رات کے نو بجے تھے۔ موسم خاصا گرم تھا چنانچہ  
میں نے ڈز سے پہلے غسل کیا اور پھر اٹھان کے ساتھ چار  
کونسی کا ڈنر کرایہ زندگی میں اتنا طویل سفر اوندہ بھی تنہا پہلی  
مرتبہ کیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے میں نے باہر کا نظارہ کیا تو مجھے  
لبے لبے باسول اور بھاری بھاری پتھروں میں طوس افغان  
نظر آتے جو ہم یورپی باشندوں کے معیار کے لحاظ سے خاصے  
مضحکہ خیز تھے۔ مجھے افغان عورتیں بھی نظر آئیں جو سیاہ برقعوں  
میں تھیں۔ کچھ نے اپنے سرخ و سپید پیرے نقابوں سے شہناپ  
رکھے تھے اور بعض کے منہ کھلے ہوتے تھے جو سیاہ برقعوں  
کے پس منظر میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ سڑکوں  
پر مختلف جانوروں کے ذریعے چلنے والی گاڑیاں اور موٹریں  
بھی تھیں۔ اندر و تیز روشنی میں جگمگاتی دکانیں تھیں جو ہر  
فتر کے سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ میں گیارہ بجے تک  
کھڑکی میں بیٹھی باہر کا نظارہ کرتی رہی پھر یہ سوچ کر بستر پر  
ہزار ہو گئی کہ رقم پہنچانے والا جو بھی ہو گا اب صبح ہی آئے گا۔  
میں عجیب و غریب خیالات میں ڈوبی لیٹ گئی۔ غسل کر  
لینے سے طبیعت میں کافی مشکستگی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر کوئی  
بات کرنے والا ہوتا تو یقیناً اس وقت میں بہت غلطوٹ ہوتی۔  
ہرچہ کہ مجھے کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی پھر بھی مجھے نیند نہیں  
آ رہی تھی اور میں آنکھیں بند کیے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس  
عالم میں مزاج گئے۔ میں نے تہی روشن کی اور سوٹ کپس سے  
پڑھنے کے لیے ایک ناول لکالا جو میں نے چلتے وقت ساتھ  
رکھ لیا تھا۔ ابھی میں نے ناول کے ابتدائی چند صفحات ہی  
پڑھے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

• مادام! مشر فون آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔  
کیا انہیں آپ کے پاس بھیج دیا جائے؟  
میں سمجھ گئی کہ یہ شخص رقم لے کر آیا ہو گا۔ پھر بھی میں  
نے پوچھا مناسب سمجھا۔ یہ صاحب کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ میرا  
نام ہے؟  
• جی ہاں! یہ مس جین ٹرسے لٹا چاہتے ہیں کہتے ہیں  
اخضر مدی کا مہیے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ آپ کے استقبال

کے لیے ایئر پورٹ نہیں جاسکے۔  
میں نے کہا: "ٹھیک ہے مگر کیا یہ صبح نہیں آسکتے؟"  
بولنے والے نے چند ثانیوں کے بعد جواب دیا: "وہ  
کہتے ہیں کہ زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ آپ سے اسی وقت  
ملاقات کریں، یہ بہت اہم ہے۔"  
میں نے ذرا تامل کے بعد اجازت دے دی۔

ہوٹل کے ایک اینڈ ٹنٹ کی معیت میں ایک جاپانی  
جو میری طرح ایک کراگریزی بونا تھا میرے کمرے میں  
داخل ہوا۔ اسے پہنچا کر ہوٹل کا آدمی سلام کر کے واپس چلا  
گیا تو میں نے مشر فون کو مخاطب کیا: "میں مشر فون! بلائیے۔"  
میں نے ہاتھ بٹھا دیا۔

اس نے اپنے کوٹ کی اندر دنی جیبوں سے ڈالروں کی  
موتی گولڈ بیل بواہدیں اور انہیں میز پر رکھ کر کہنے لگا۔  
"یہ پیرے پچیس ہنڈریڈ ہیں۔ ایک ایک سو ڈالر کے ڈھائی سو  
نوٹ ہیں گن لیجیے۔"  
میں نے اس کی موجودگی میں رقم گنی اور اسے شخصت  
کر دیا۔

روٹی کے جلنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم  
کمرے میں رکھنے کے بجائے اسے ہوٹل کی انتظامیہ کے پاس  
بطور امانت رکھ دینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ چنانچہ میں  
نے فون کر کے نائٹ ڈیوٹی مین کو کمرے میں طلب کیا اور  
اسے پچیس ہنڈریڈ ڈالر سے کرامانت کی رسید حاصل کر لی۔

میں دوبارہ بستر پر گئی تو تین بجنے میں ہیں منٹ باقی  
تھے۔ کتاب میز سے سرھانے پڑی تھی لیکن اب اس طرف  
طبیعت راغب نہیں ہو رہی تھی۔ میں بستر پر پیرٹکا کر  
بیٹھ گئی اور اگلے دن کا پیر و گرام فون میں ترتیب دیتی رہی۔  
اب مجھے خیال خاں اینڈ کمپنی کے دفتر جانا تھا اور معاملات  
طے کرنا تھے۔

میں ۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو کابل پہنچی تھی اور ہر مارچ  
کی فلائٹ سے واپسی تھی۔ اس سے پہلے صرف بی او اے  
سی کی فلائٹ تھی جو ۱۸ مارچ کو صبح ۹ بجے روانہ ہوتی۔  
نا معلوم کیوں میں نے فیصلہ کیا کہ کے ایل ایم فالوں سے کہہ  
کر میں اپنی بنگا بی او اے سی کی فلائٹ میں ٹرانسفر کر لوں  
اور ایئر ڈوم میں مائیکل کو دو دن پہلے پہنچ کر سر پر آزادوں۔  
لیے بھی کابل ایئر پورٹ سے ہوٹل تک اور پھر کمرے کی  
کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر کے میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت  
خشک جگہ ہے۔ یہاں کی سیر کے لیے دو دن بہت ہیں۔ میرے

دل پر عجیب قسم کی جھڑپٹ بھی طاری تھی جس کی میں کوئی سمجھا نہیں کر سکتی تھی۔

لگے دن میں نے باہر جانے کا پروگرام بنا کر ایک خوبصورت لباس کا انتخاب کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ معلوم ہوا کہ خیال خاں خود ہوٹل پہنچ چکا ہے اور نیچے ڈانگہ ہال میں میرا منتظر ہے۔ میں نے اسے اوپر آنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ مجھ سے نیچے ہی ملنا چاہتا تھا۔ میں دس منٹ کے اندر تیار ہو کر میچے اتری اور ہال میں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں خیال خاں کا تصور وہی تھا جیسا کہ میں گزشتہ شب سے اب تک افغانوں کو دیکھ سکتی تھی، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب نہایت جدید وضع کے تقری بیسی سوٹ میں جلوں ایک خوبصورت پینتیس سالہ شخص مجھ پر جان کر میرے قریب آیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد مجھے اپنی میز پر لے گیا۔ وہ انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔

”مس ٹر! آپ کو یہاں کوئی تکلیف کوئی پریشانی تو نہیں؟“

”شکر ہے مسٹر خاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب آپ

یہ بتائیے مال کی ڈیوٹی کب دے رہے ہیں؟“

میرا سوال سن کر وہ کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا۔ پھر تھوڑے تامل کے بعد بولا: ”ابھی لے چکے۔ میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہے۔ رقم تیار ہے؟“ اس نے تقریباً سرگوشی میں جواب دیا۔ ”جی ہاں پوری رقم تیار ہے۔ میرا خیال ہے آپ پر سونے صبح چھ بجے مجھے بائو تو لیں دے دیں۔“

”صبح چھ بجے؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”نوبے میری فلائٹ ہوگی اس لیے آپ چھ بجے ہی سٹا

بجے تک دے دیں۔ میں آٹھ بجے ہوٹل سے رخصت ہو جاؤں گی۔“

”مس ٹر! بکے ایل ایم کی فلائٹ تو ۲ بجے کو شام بائو بجے ہے۔ اس کی معلومات پر حیران ہونے کی اب میری باری تھی۔ میں نے اسے بتا دیا۔ دراصل میں نے جلد سے جلد واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں اپنی نشست بی او اے سی میں ٹرانسفر کر رہی ہوں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ پھر ٹھیک ہے مس ٹر! آپ مجھے کل کسی وقت ادائیگی کریں۔ دراصل ہم مال کی ڈیوٹی سے ایک دن پہلے رقم وصول کر لیتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ چاہیں تو آج بھی آپ کو ادائیگی کی جا سکتی ہے۔“

”آپ کی مرضی، آج دے دیں۔“

میں نے پرس سے امانت کی رسید نکالی اور اس خیال سے ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ ہوٹل کے کسی ملازم سے متعلقہ شخص کے بارے میں معلوم کر کے رقم واپس لے لوں۔

خیال خاں نے میرے ہاتھ سے رسید لے لی اور اسے فوراً لے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا: ”رات کو ہی آپ نے یہ رقم ہوٹل کے سوائے کی ہے۔ مگر آپ نے ایسا کیوں کیا مس ٹر! کیا آپ اتنی سی رقم اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھیں؟“

”مسٹر خاں! میں مسافر ہوں اور بالکل ہی نئی جگہ ہوں اس لیے حفاظت کے خیال سے ایسا کیا۔ دراصل یہ تو آپ کی امانت تھی جس کی اچھی طرح حفاظت کرنا میرا فرض تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مس ٹر! مگر یہ بات کچھ احتیاط کے خلاف ہے۔“

”احتیاط کے خلاف ہے؟ میں نے چونک کر اس کا جملہ دہرایا۔ خیال خاں نے مجھ کو دیکھ کر بڑھی تشریح سے کہا: ”معلوم ہوتا ہے آپ کو نا مکمل معلومات کے ساتھ یہاں بھیجا گیا ہے۔“

”وضاحت سے بات کرو مسٹر خاں! میں سمجھی نہیں۔ تمہاری گفتگو سے میں کچھ پریشان ہو رہی ہوں۔“

”مس ٹر! میں آپ سے زیادہ فکر مند ہو رہا ہوں۔ مسٹر مائیکل کا فرض تھا کہ وہ آپ کو ہماری اور سچے سچے بھانجے کے ساتھ چلیے اب آپ سمجھا دیجئے۔“

خیال خاں خاموش بیٹھا کچھ سوچا رہا اور میں بے چینی کے ساتھ اس کی شکل دیکھتی رہی۔ جب کافی دیر تک وہ کچھ نہیں بولا تو میں نے تقاضہ کیا: ”مسٹر خاں! آپ کی خاموشی سے مجھے اور زیادہ پریشانی ہو رہی ہے۔“

خیال خاں پھر بھی خاموش رہا۔ پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے ایک گہری سانس لے کر کہنے لگا: ”بات یہ ہے مس ٹر! اس کام میں صلاحیت بہت ہے۔ دنیا بھر کے مالک ہماری اس ایجاد کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں، لیکن ہم صرف اس پارٹی کو اپنا مال دیتے ہیں جس کے ساتھ ہمارا اطمینان بخش معاہدہ ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے برآمدی قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ باقاعدہ ایک سیورٹ لائسنس حاصل کرنے کے لیے ہمیں چھ مہینے کا عرصہ درکار ہوگا۔ پھر ہر کفایت منٹ کے لیے علیحدہ لائسنس کی ضرورت ہوگی۔ ہم اب تک یوں کرتے رہے ہیں کہ اس عرق کو جلال آباد کی ہاٹریوں میں واقع ایک چٹے کا پانی ظاہر کرتے ہیں۔ اس پانی میں

چھکے بیٹھے کافی پیتے رہے۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا: مس  
 ظرا آپ ابھی یہ رقم واپس نہ لیں۔ اسے کل شام ڈھول کریں  
 امدادات میں کسی وقت مجھے ملے دیں۔ اگلی صبح میں پانچ بوتلیں  
 اچھی طرح پیک کر کے ہوٹل سے باہر ایئر پورٹ کے راستے

میں آپ کو دے دوں گا۔ آپ اپنے سوٹ کیس میں اتنی  
 محتاش رکھیں کہ پانچوں بوتلیں اس میں آجائیں۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر خیال خاں چلا گیا اور میں اٹھ کر  
 اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آرام کر سی پر بیٹھ کر میں سوچنے لگی۔  
 کیا میں واقعی کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہو چکی ہوں۔ مائیکل  
 نے مجھے یہ ساری باتیں نہیں بتائی تھیں۔ اس کا خیال ہو گا  
 کہ اگر وہ مجھے اس کام کی حقیقی نوعیت سے آگاہ کر دے گا تو  
 شاید میں رضامند نہ ہوں گی۔ میری بے خبری میں وہ یہ کام مجھ  
 سے کرا لینا چاہتا تھا۔ اب میں بالکل محسوس جکی تھی۔ میں چاہتی  
 تو مال کی ڈیوری یہ بغیر بھی واپس جاسکتی تھی اور مائیکل سے  
 کہہ سکتی تھی کہ چونکہ اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی  
 تھی اس لیے میں نے اپنی عزت اور آزادی کے بچاؤ کی خاطر  
 مال کی ڈیوری نہیں لی۔ میں اس کے بچیس ہزار ڈالرز اس کے  
 منہ پر مار دیتی اور سکون کے ساتھ اپنی ملازمت پر واپس چلی  
 جاتی۔ مجھ سے شادی کر کے یہ تمام واقعہ ایک بھیانک خواب  
 کی مانند فراموش کر دیتی۔

لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ خیال خاں نے جو پروگرام  
 ترتیب دیا تھا میں اسی کے مطابق میں پانچ بوتلیں اپنے  
 سوٹ کیس میں رکھے۔ کابل ایئر پورٹ پہنچی اور بی او اے  
 سی کے طیارے سے ۸ مارچ کو صبح ۹ بجے واپس ایئر پورٹ  
 کے لیے روانہ ہو گئی۔ یہ غائب میری خوش بختی تھی کہ کابل  
 ایئر پورٹ پر کوئی خاص چیکنگ نہیں ہوتی اور پھر ایئر ڈوم  
 کے ایئر پورٹ سے بھی میں بھلائی نکل آئی۔ ایئر پورٹ  
 سے باہر آنے کیس میں بیٹھنے سے پہلے میں نے مائیکل کو فون کیا  
 میری آواز سن کر وہ پریشان ہو گیا۔

”یہ تم ہو جین! کہاں سے بول رہی ہو؟ کیا واقعی  
 ایئر ڈوم واپس پانچ چکی ہو؟ کیا تم ناکام واپس آئی ہو؟  
 اس نے کہا کہ ابھی سانس میں پے درپے سوالات کی  
 بھاری بھاری

”تھوڑا عرصہ سے کام لو مائیکل! میں سب کچھ بتا دوں  
 گی۔ میں تمہارے پاس کیس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔  
 ”سنو بے بی! تم سیدھی دفتر نہ آؤ، اپنے گھر جاؤ، میں  
 رہیں پانچ رہا ہوں۔ اتنا کہہ کر مائیکل نے فون بند کر دیا اور

قدتی کمیائی اجاڑا شامل جاتے ہیں جو بہت سے جلدی  
 امر امن اور مصدے کی تکالیف میں کام آتے ہیں اس قدرتی  
 چھکے کے بانی کو بہت سی جگہوں کے لوگ مقدس بانی سمجھ  
 کر بھی منگواتے ہیں۔ وہ اصل یہ چشمہ ہم مسلمانوں کے ایک بزرگ  
 کے منزل کے قریب واقع ہے۔ ہماری ایجاد (عرق) کا کوئی  
 رنگ بواؤد مزہ نہیں ہوتا۔ بالکل قدرتی بانی کی طرح ہوتا ہے  
 اس لیے جب تک متعلقہ حکام کو کوئی خبری نہ کرے اس  
 کو یہ خبری ہی چیک نہ کیا جائے۔ یہ چشمہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کیا  
 چیز ہے۔ احتیاط اور خاموشی کی وجہ سے۔

میں نے خیال خاں کی طرح تقریریں کر پڑھانی سے پوچھا  
 اگر ایئر پورٹ پر حکام نے مجھ سے حال کیا کہ ان بوتلوں میں کیا  
 ہے اور میرے جواب پر وہ مطمئن نہیں ہوئے تو کیا مجھے گرفتار  
 کر کے تھوڑے چلایا جائے گا؟

خیال خاں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”لیکن یہی  
 وقت ممکن ہو گا جب کوئی شخص حکام کو باقاعدہ اس کی اطلاع  
 دے۔ بصورت دیگر ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”مستر خاں! اب تم مجھے صبح سے بات بتاؤ کہ ہمیں  
 اس عرق کے حصول کے لیے اور کون کون سے ملکوں کے لوگ  
 یہاں کابل میں موجود ہیں جن کی طرف سے یہ خطرہ ہو سکتا ہے؟  
 ”میں تقریباً حوصلے سے کام لے رہا ہوں۔ کابل میں اکثر پانچیاں اس  
 مقصد کے لیے آتی رہتی ہیں، لیکن ایک بار ڈیوڈ سیرا سے  
 واقف نہیں ہوتی۔ میں جب تک خود نہ بتاؤں کسی کو تو نہیں  
 چل سکتا۔ میری ٹیکسٹری یہاں سے ہر تار و پود ہے اور بڑے  
 دشوار گزار اور سنگین علاقے میں واقع ہے۔ اس ٹیکسٹری میں  
 کام کرنے والے صرف پچھ آدمی ہیں جو سب کے سب میرے  
 اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ ان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ یوں  
 مجھے یقین تیار کر کے کابل لایا جاتا ہے پھر میں اسے فروخت  
 کرتا ہوں جس کا علم سوائے میرے کسی کو نہیں ہوتا لہذا تم مطمئن  
 رہو۔ احتیاط سے میری مراد یہ تھی کہ اتنی بڑی رقم تم نے  
 ہوٹل کی انتظامیہ کے پاس بطور امانت رکھ دینی۔ تو یوں چاہا جا  
 سکتا ہے کہ تم نے یہ رقم کہاں خرچ کی؟ ہوٹل والے بھی سوچ  
 سکتے ہیں کہ اتنی بڑی رقم تم بنک کے ذریعے کیوں نہیں لائیں  
 کیس کیوں نالی ہو؟

خیال خاں کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ رقم رات کو ہی مجھے  
 کسی نے پہنچائی تھی میں اسے ایئر ڈوم سے اپنے ساتھ نہیں  
 لائی ہوں۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسے یہ بات نہ  
 بتاؤں چنانچہ میں خاموش رہی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں

میں ڈیڑھ انٹرنیشنل کے دفتر کے بجائے اپنے گھر آجاتی۔  
 ڈیڑھ کی لگتی میری خلاف توقع واپسی پر میری والدہ  
 گئے۔ جیم کو میں نے دائرہ اطلاع نہیں دی۔ سوچا تھا کہ  
 مائیکل سے فارغ ہو کر اسے بتاؤں گی کہ میرے اور پریکٹس کی  
 مائیکل میرے گھر پہنچا تو میں نے پانچوں بوٹوں میں بڑے  
 سہانی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔  
 ”جیم! تم نہیں جانتیں تمہارے کتنا بڑا معرکہ سر کیا ہے  
 بے بی! تم نے میری زندگی بنادی ہے۔ تم کمال کی لڑکی ہو۔  
 میں تمہیں تمہاری توہمات سے بڑھ کر اس کام کا معاملہ لگاؤں  
 گا۔ کیشن سگھرا بھی نہیں ہے۔ وہ بھی بہت خوش ہو گا۔ ہاں  
 تم شید دل سے مدد مل سکتے کیسے آگئیں؟“  
 میں نے بڑی سنجیدگی سے مائیکل کو وہ سب کچھ بتا دیا  
 جو خیال خاں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا۔ میری والدہ وہ  
 بڑے خود اورد کسی قدر اطمینان سے گفتگو رہا پھر کہنے لگا ”مجھے  
 اسوں ہے جین! کہ میں نے تم سے یہ باتیں چھپانی تھیں۔  
 اصل مجھے یقین تھا کہ تم اپنی ذہانت اور صلاحیت کے  
 بل بوتے پر یہ معرکہ ضرور سر کر لو گی لیکن میں پہلے سے نہیں  
 یہ تمام باتیں بتا دیتا تو تمہارا اعتماد بالکل ختم ہو جاتا۔ پھر  
 شاید تم یہ کام نہ کر سکتیں۔“

لیکن مرٹن مائیکل! تم نے یہ کتنا بڑا غضب کیا کہ اس  
 کام میں پیش آنے والے توقع خطرات سے مجھے آگاہ  
 نہیں کیا اور نہ ہی اس کا ردبار کی قانونی حیثیت پر کوئی روشنی  
 ڈالی۔ تم خود دیکھ لو! انجانے میں میں نے کسی کسی بے احتیاطی  
 کی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ایسا نہیں کرتی۔“

”اوہ، تم نہیں سمجھیں۔ اصل تمہاری بے احتیاطیاں  
 اور فطری انداز میں کام کرنا ہی ہمارے لیے خاتمہ عند ثابت  
 ہوا۔ اور کسی کو کوئی شک نہیں ہوا۔“  
 ”یہ کوئی کون تھا مائیکل؟ میں نے سوال کیا۔  
 ”یہ شخص کیشن سگھرا کا جا پانی دوست ہے جو محض تمہیں  
 رقم پہنچانے کے لیے ہانگ کانگ سے کابل پہنچا تھا۔ اس  
 کا بیڈ کوآرڈر ہانگ کانگ ہے اور وہ اسمگلنگ کے ایک  
 بہت بڑے گروہ کا چیف ہے۔“

”اچھا اب تم مجھے صاف صاف بتاؤ آخر یہ عرق  
 ہے کیا بلا ہے؟“  
 ”کیا تم اب تک نہیں سمجھیں؟“  
 ”ہاں مائیکل! مجھے اعتراض ہے۔ مجھے خیال خاں کی  
 یہ بات بھی جھوٹ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک مقامی بوٹی کا

عرق ہے جو عاتق بنانے کے کام آتا ہے سب سے تم لوگوں کی  
 اس بات پر اب بالکل یقین نہیں رہا۔  
 ”نہیں بے بی! کسی حد تک یہ بات بالکل حقیقت  
 ہے کہ یہ عرق افغانستان میں پیدا ہونے والی ایک بوٹی  
 کا عرق ہے اور وہ بوٹی ہے حیش۔“

”حیش! میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تو کیا میں یہ  
 چرس کا عرق لے کر آتی ہوں؟“  
 ”بالکل درست مس جیم! تو کیا

میں میرے باؤں تک کا نہیں گئی۔ میرے خدایا! یہ  
 انجانے میں میں کیا کر چکی۔ اتنی خطرناک ہمت تک جس کی  
 سزا جیل عکوں میں موت ہے۔ میں سن ہو کر مائیکل کی شکل  
 دیکھنے لگی جو فاطمہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میرا دل جا ہا کہ سنانے میں بچ پڑی ہوئی پانچوں بوٹوں  
 کو ایک ایک کر کے دیوار پر مار کر توڑ دیا اور مائیکل اور  
 کیشن سگھرا کو ان کی چالاکی کا صحیح جواب دیا لیکن میں نے  
 اپنے جذبات پر قابو پایا اور شکست خود لے لی۔ میں مائیکل سے  
 کہا ”مرٹن! بڑا بہتر ہے آپ اس مصیبت کو جلد سے جلد  
 یہاں سے لے جائیں اور اس بچے کو تنہا چھوڑ دیں تاکہ اپنی  
 حماقت پر ماتم کر سکیں۔“

”اور کسے جین! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بے بی! تم  
 نے اتنا بڑا کام کیا ہے اس پر ماتم کیا۔ تم اپنے منہ سے جو عاتق  
 طلب کر لو گی، وہی دیا جائے گا۔ میں نے ابتدا میں اس کی قدر  
 قیمت تمہیں جان بوجھ کر نہیں بتائی تھی لیکن اب سب کچھ  
 کھل کر سامنے آچکا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ پانچ بوٹوں  
 کتنی بڑی دولت ہیں۔ تم یوں سمجھو کہ ان پانچ بوٹوں میں  
 تم دس کن چرس لے کر آتی ہو اور دس کن چرس کی قیمت پورے  
 میں ایک ملین ڈالر امریکہ میں پندرہ لاکھ ڈالر کے ٹک  
 جگ ہے۔ اس عرق کے دس قطرے ایک پونڈ تبا کو میں  
 چرس کا سیرنش پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ امریکہ میں چرس  
 کا ایک گریٹ ایک ڈالر میں فروخت ہوتا ہے۔ اب تم  
 اندازہ کر سکتی ہو کہ ان پانچ بوٹوں میں کتنی عظیم دولت  
 بند ہے۔“

میں لائق سی ہو کر مائیکل اور بونی کی گفتگو سنتی رہی۔  
 جب اس نے مجھے مطلع کیا کہ وہ مجھے دس ہزار ڈالر شام  
 تک اٹا کر دے گا۔ تب بھی میرے احساسات میں کوئی تبدیلی  
 نہیں ہوئی اور وہ ان بوٹوں کو میرے ہی سوٹ کیس میں بند  
 کر کے روانہ ہو گیا۔



دوسرے کمرے میں میرے ڈیڑھی اندھ لڑکی خاموش بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ میرا اترتا ہوا چہرہ لکڑی کر ڈیڑھی کھٹکے۔ میں اچھے تم پر فخر ہے۔ چیک بکنم غلطی سے ان لوگوں کی آواز کا دین نہیں تاہم مجھے خوشی ہنس بات کی ہے کہ تم اس غلط کام پر افسردہ ہو اور بڑائی پر فخر کرنے کے بجائے اسے بڑا ہی سمجھتی ہو۔ میں اندھ ہماری لڑکی تم سے قطعی ناراض نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں کہ جو سنی تمہیں اپنی غلطی کا علم ہوا تم نے اسے دست ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

خدا کے لیے ملٹی ای جیم کو کچھ دبتا ہے گا اس نے مجھ سے پہلے ہی اس شے کا اظہار کیا تھا کہ مجھے کسی فیضانی کام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن میری دلجوئی کی خاطر اس نے اپنے شہر پر اصرار نہیں کیا اور محض میری خوشی کی خاطر وہ خاموش رہا۔

ڈیڑھی نے میری بات سے اتفاق کیا۔ واقعی مجھ سے کچھ نہیں کہا چاہیے بلکہ اسے یہی بتاؤ کہ تم اپنا مقصد حاصل کیے بغیر وقت سے پہلے واپس آگئی ہو۔ اس مطالبے اہلیان ہو جانے کا۔

میں نے افسردگی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی تاکہ مجھ کو اپنی واپسی سے مطلع کر دوں۔



شام سے پہلے پہلے مائیکل پھر میرے پاس آیا۔ میں اس وقت جہم کے پاس جا سنے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں تڑپا ہنگامہ سے کے مطابق تمہارا بولس نہیں دینے آیا ہوں۔ اس نے دس ہزار امریکی ڈالر کے بقدر ڈیج گڈر کا چیک مجھ سے دیا۔ میں نے یہ سوچ کر یہ چیک لے لیا کہ واپسی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ بطور احتجاج واپس کر بھی دیتی تو مائیکل یا کیشن سنگھ اپنا کالا کارڈ بار بند تو نہیں کرتے اٹا میلا ہی نقصان ہوتا۔ پھر مجھ میں نے بدولی کے ساتھ چیک لے کر ایک طرف ڈال دیا اور رہی فخر یہ بھی انا نہیں کیا۔ اس طرح میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ مائیکل بڑے کیسیال سے ہنسی ہنس کر کھڑا ہوا۔ اچھلے بی بگڑکت اور پھر وہ چلا گیا۔



میں نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی جو میں نے فروغ نہیں کرائی۔ میں بقیہ دنوں میں آرام کر کے اپنی نفسیاتی

کیفیت ناز کرنا چاہتی تھی۔ مجھے جب یہ خیال آتا کہ میں کتنے بڑے خطرے سے نکل کر آئی ہوں تو میرا دل ٹٹل کانپ جاتا۔ میں سوچتی اگر اخراجات میں بکری جاتی تو وہاں اجنبی لوگوں کے درمیان بالکل تنہا ہوتی۔ کوئی غلطی امداد کمانے والا نہ ہوتا۔ ڈیج سفارخانہ ایسے اخلاقی قزموں کی کوئی مدد نہیں کرتا اور انہیں ان کے حالی پر چھوڑ دیتا ہے میں مشکل طور پر ان وحشیوں کے رحم و کرم پر ہوتی اور پھر وہ جلتے میرا کھٹکتے ہوتے۔

میری چھٹیوں ختم ہونے میں چند دن باقی تھے کہ ایک دن شام کو مائیکل کا فون پھر آیا۔ بیلو بے بی! امید ہے اب تم نارمل ہو گئی ہو گی تو اس سے خوشی سے پوچھا۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے شرمائیکل! مجھے اسوس پیاب میں آپ کے کسی کام دہا سکوں گی۔

دوس بیس ہزار ڈالرز یہ کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے تو یہ سنتے ہی میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس مقام سے میری زندگی ایک خطرناک محلہ پر مڑ گئی، لیکن میں مجبور تھی یا مجبور بنا دی گئی تھی۔

تفتیشی افسر کا نوٹ۔ گرفتاری کے بعد طرمان کی نفسیات ایک ہی خج بیکام کرتی ہے۔ ہر عزم واقعات مقدمہ میں کچھ ایسی کمائیاں بھی شامل کر دیتا ہے جن کے ذریعے وہ قانون کا نفاذ کرنے والوں، ججوں اخبار نویسوں اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیس فیصد معاملات میں طرمان ایسی کمائیاں اپنے دل سے گھر کر لیتے ہیں جبکہ بقیہ تیر فیصد سب سے واقعات میں تھوڑی تھوڑی جھوٹ کی آمیزش کر کے اپنے لیے بھلا دیاں جتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذریعہ تفتیش طرمان نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ متعلقہ اخبارات مجھے فراہم کر کے اپنی منظوری کا ثبوت دے گی لیکن وہ مجھے اخبارات فراہم نہ کر سکی، اس لیے میں نہیں کر سکتا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ پلڑ

۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے ان تمام اخبارات میں جو ڈیج زبان میں لائبریری سے شائع ہوتے ہیں ایک خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی جس کا تعلق یہ تھا۔

دوبارہ نہیں سمجھیں گے۔ البتہ سوچئے اور فیصلہ کرنے کی مدت  
ہمارے چھہہ ہٹنے ہونا چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں  
اسی ظلم ہم گھبراہٹا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ  
میں اخبارات کا پلندہ تھا۔

”لیبر آف نئے راج کے اخبارات دیکھے تھے  
ہاں، مگر میرا اس خبر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔  
واقعی، سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھ نے مقصد سے یہ نہیں  
ہم کیا میں تم سے صوفٹ ہوا سکتی ہوں تو میں نے  
جذبائی ہو کر کہا۔“

”یقینی تو نہیں لیکن سوچ رہا تھا کہیں لالچ میں نہ  
آگئی ہوں۔“

”نان سنس۔ کسی ہنگامات سوچی ہے تم نے؟  
خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ہم انہی تک مشتبہ تھا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں دروازہ  
بند کر کے بیٹھ گئی۔ تنہائی ہوتے ہی طرح طرح کے خیالات  
نے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اچھلنے میں  
کیسے بے رحم لوگوں کے شکنجے میں چھنس گئی ہوں۔ کتنی  
خوبصورتی سے مجھے ہلیک ہیل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے  
ان لوگوں نے اپنا ایک آدمی بھی بھیج دیا ہے کہ ہاتھوں گزار کر آیا  
اور پھرتے فائنٹ بھی کروا دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر لڑ رہی  
تھی کہ پولیس اگر پاب ہے تو تھوڑی سی کوشش سے یہ پتہ چلا  
سکتی ہے کہ ایئر سٹریٹس کی کون سی لیڈی ٹیچر گزشتہ دنوں مشرقی  
مالک کے سفر سے واپس آئی ہے۔ ایئر پورٹ کے پیکارڈ  
سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس جہاز پر سولہ مارچ کو کے ایل ایم کے  
ہیار سے سے کابل گئی اور اٹھارہ کوئی اولے سی کی پرواز سے  
واپس آگئی۔ صرف مدین کے لیے کابل کا سفر جس پر میں ہزاروں  
سوڈا خرچ کیے گئے، آخر کیوں کیا گیا تھا؟

واقعات ایسا رخ اختیار کرتے تھے کہ میں کچھ تھکے  
میں بندھی ایک بلڈ پھر مائیکل بورنیو کے دفتر میں بیٹھی تھی۔ اس  
مرتبہ میرے چہرے پر شادابی کے بجائے سافردگی تھی۔ میں ایسا  
کام کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی جسے کرنے میں میری راج پر بھی  
لنڈہ ظہری تھا۔ تاہم میں مجبور تھی۔

اس مرتبہ مجھے پاکستان جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ ملک  
افغانستان کا ہمسایہ ہے اور سیکریٹریل سرحد علی خٹک ہے۔  
پاکستان کا تمام شمالی علاقہ سہاڑی ہے اور وہاں کی معاشرت،  
تہذیب اور ثقافت حتیٰ کہ کچھ علاقوں کی زبان بھی افغانستان

مقامی پولیس نے ایک بھارتی لڑکھن مندر  
کو میں اس وقت گرفتار کیا جب وہ ایک تاجر  
کے ہاتھ دو اونٹن سیرال طیفیل فروخت کرنے کی  
کوشش کر رہا تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد مندر  
نے پولیس کو بتایا ہے کہ ایک مقامی اسکول کی لیڈی  
ٹیچر نے جس کا نام وہ نہیں جانتا، سیرال طیفیل بطور  
نمونہ دیا تھا تاکہ وہ ایئر گراڈ پڑھا کر کیت میں اس  
کا رخ معلوم کرے اور بڑی مقدار میں اس کی  
سیدنی کا اسٹیک کرے۔ طرز پولیس کی سہاڑی  
پوچھ گچھ کے باوجود کورہ لیڈی ٹیچر کی شناخت  
اور اس کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے  
سے قاصر رہا۔ طرز مندر ضمانت پر رہائی کے بعد  
سہاڑی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے پولیس اس  
مقدمے کی مزید تفتیش میں ناکام ہو گئی ہے۔  
مندرجہ کی تلاش جاری ہے۔“

جس دن اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں ای دن  
دوپہر کو مائیکل نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔  
”مس نظر آتم نے آج کے اخبارات دیکھے تھے؟  
ہم گورنمنٹ مائیکل! یہ کیا قصہ ہے؟  
قصہ تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ مندر کون تھا،  
جسے تم نے نمونہ دیا تھا؟“

”میں نے نمونہ دیا تھا، تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟  
”بے بی! ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔  
کشن سنگھ کو کہہ دو کہ تم کابل سے زیادہ مال لے کر آئی ہو اور  
اب اسے سہاڑی چاہی ہو۔ کیوں ہے ناپی بات؟“

میں اکر رہ گئی۔ سہاڑی ہو کر تمہیں کھا۔ نے لگی کہ  
کسی طرح مائیکل کیشن سنگھ کو میری بے گناہی کا یقین دلادے۔  
لیکن مائیکل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے ہلیک  
ہیل کرنے پر تڑپ گیا۔

”اب صورت یہی ہے مس نظر! کہ تم وہی کچھ کرو جیسا  
کشن سنگھ نے۔“

”وہ تو میری کہنے کا کہ میں پھر کابل جاؤں اور اس کے لیے  
کاہ کروں ہے ناپی بات؟“

”تو اس میں سہاڑی کیا ہے؟ تھوڑی سی تکلیف  
اٹھا کر تو ہزاروں ڈالر کما سکتی ہو، اور ہمارا بزنس بھی چل سکتا ہے۔“  
”مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”مقامی پولیس نے ایک بھارتی لڑکھن مندر  
کو میں اس وقت گرفتار کیا جب وہ ایک تاجر  
کے ہاتھ دو اونٹن سیرال طیفیل فروخت کرنے کی  
کوشش کر رہا تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد مندر  
نے پولیس کو بتایا ہے کہ ایک مقامی اسکول کی لیڈی  
ٹیچر نے جس کا نام وہ نہیں جانتا، سیرال طیفیل بطور  
نمونہ دیا تھا تاکہ وہ ایئر گراڈ پڑھا کر کیت میں اس  
کا رخ معلوم کرے اور بڑی مقدار میں اس کی  
سیدنی کا اسٹیک کرے۔ طرز پولیس کی سہاڑی  
پوچھ گچھ کے باوجود کورہ لیڈی ٹیچر کی شناخت  
اور اس کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے  
سے قاصر رہا۔ طرز مندر ضمانت پر رہائی کے بعد  
سہاڑی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے پولیس اس  
مقدمے کی مزید تفتیش میں ناکام ہو گئی ہے۔  
مندرجہ کی تلاش جاری ہے۔“

جس دن اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں ای دن  
دوپہر کو مائیکل نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔  
”مس نظر آتم نے آج کے اخبارات دیکھے تھے؟  
ہم گورنمنٹ مائیکل! یہ کیا قصہ ہے؟  
قصہ تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ مندر کون تھا،  
جسے تم نے نمونہ دیا تھا؟“

”میں نے نمونہ دیا تھا، تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟  
”بے بی! ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔  
کشن سنگھ کو کہہ دو کہ تم کابل سے زیادہ مال لے کر آئی ہو اور  
اب اسے سہاڑی چاہی ہو۔ کیوں ہے ناپی بات؟“

میں اکر رہ گئی۔ سہاڑی ہو کر تمہیں کھا۔ نے لگی کہ  
کسی طرح مائیکل کیشن سنگھ کو میری بے گناہی کا یقین دلادے۔  
لیکن مائیکل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے ہلیک  
ہیل کرنے پر تڑپ گیا۔

”اب صورت یہی ہے مس نظر! کہ تم وہی کچھ کرو جیسا  
کشن سنگھ نے۔“

”وہ تو میری کہنے کا کہ میں پھر کابل جاؤں اور اس کے لیے  
کاہ کروں ہے ناپی بات؟“

”تو اس میں سہاڑی کیا ہے؟ تھوڑی سی تکلیف  
اٹھا کر تو ہزاروں ڈالر کما سکتی ہو، اور ہمارا بزنس بھی چل سکتا ہے۔“  
”مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”ہاں یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوڈ آئی  
کے لیے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”کیا خیال تھا مجھے اس سرحدی علاقے میں ملے گا؟“  
 ”بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ خیال تھا ہی  
 ملے گا اور اس مرتبہ وہ ہمیں دس بوتلیں دے گا۔ ان بوتلوں  
 پر عربی زبان میں لیکلے ہوں گے۔ تمہارا فرض ہے کہ ان  
 بیبلیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس علاقے کے مسلمان بڑے کیٹر  
 مذہبی ہوتے ہیں اور اپنے مذہب کی ذرا سی بے حرمتی پر قتل  
 تک کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں جانا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“  
 ”اس جگہ کا نام کیا ہے جہاں خیال تھا مجھے ملے گا؟“  
 ”یہ جانا تمہارے لیے بالکل ضروری نہیں تمہارے  
 ساتھ اس علاقے کے چتے چتے سے واقف ایک رہبر ہوگا۔  
 وہ تمہیں کسی وقت کے بغیر منزل تک لے جائے گا اور واپس  
 بھی لے آئے گا۔“

میں گردن ہلا کر خاموش ہو گئی۔  
 کوئی نے مجھ سے کوئی غیر متعلق بات نہیں کی۔ اس نے  
 مجھ سے کسی ضرورت کے بارے میں پوچھا اور یہ اطمینان کر کے  
 کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، وہ کھڑا ہو گیا۔  
 ”اچھا مس طر! میں جا رہا ہوں۔ پنڈی جانے کے  
 لیے ٹکٹ تمہیں بروقت مل جائے گا۔“

انگلے ہی دن مجھے ہوٹل کے کاؤنٹر سے کراچی سے پنڈی  
 تک کے لیے پی آئی اے کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مل گیا۔  
 ٹکٹ کے ساتھ کوئی پیغام نہیں تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ  
 اب میرے ساتھ جو کوئی بھی رابطہ قائم کرے گا، پنڈی میں  
 ہی کرے گا۔ فلیٹمین ہوٹل میں کرے گی ریزرویشن سلیپ بھی  
 ٹکٹ کے ساتھ منسلک تھی۔

کراچی میں قیام کے دوران میں خوب گھومی پھری۔ میں  
 نے تمام تفکرات ذہن سے جھٹک لیے تھے اور سوچ لیا  
 تھا کہ جب ایک اتنا آہی بڑی ہے تو پھر دیر سے اس  
 کا مقابلہ کروں گی۔ اور اسی اور ٹائیو سی کی کیفیت میرے اعتماد  
 کو مجروح کر دے گی اور میری قوت کار بھی ختم ہو کر رہ جائے  
 گی۔ معاملات جس پرامرار انداز میں چل رہے تھے انہوں  
 نے مجھے ضرورت سے زیادہ چونکا بنا دیا تھا۔ میں اپنے سائے  
 سے بھی محتاط رہتی۔ بلا ضرورت کسی جلسے سے کوئی بات  
 نہ کرتی۔ کراچی کالیشن آف سٹاپنگ سینٹر الفنسٹن اسٹریٹ  
 میرے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں شام کے وقت  
 چلتی ہوئی وہاں جاتی اور بلا ضرورت سٹاپنگ کرتی رہتی۔  
 رقم کی میرے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ امریکی ڈالر ہوٹل  
 والے ہی مقامی کرنسی میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ کراچی

سے ماٹل ہے۔ مجھے تو ان دنوں ملکوں میں کوئی خاص مسرت  
 محسوس نہیں ہوا۔ البتہ پاکستان کا جنوبی علاقہ شمالی علاقے  
 سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کے لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور  
 مہذب ہیں۔ غربت البتہ دونوں ہی ملکوں میں عام ہے۔

میں میں ستمبر ۱۹۷۷ء کو ایئر ڈوم سے کے ال ایم کے ذریعے  
 کراچی پہنچی۔ یہاں ہوٹل ملان میں ٹھہری۔ کراچی میں کابل جیسی  
 نشکی اور ویرانی نہیں تھی۔ مجھے یہ شہر بہت سے یورپی شہروں  
 سے بھی خوبصورت اور بارونق معلوم ہوا۔ اپنے کابل کے تجربے  
 کے برعکس پاکستان، خصوصاً کراچی اگر مجھے واقعی ملی خوشی  
 ہوئی۔ کچھ عرصے کے لیے میری وہ اندر کی بھی جاتی رہی جو مجبوراً  
 حالات میں یہ سفر اختیار کرنے کی وجہ سے میری روح تک پر  
 چھائی ہوئی تھی۔

اکیس ستمبر، ۱۹۷۷ء کو صبح ۹ بجے کے قریب ابھی ملی بس میں  
 ہی تھی کہ ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر سے مطلع کیا گیا کہ ایک  
 صاحب مشرفی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر وہی کابل کا سبق  
 رہا یا جا رہا تھا۔ میں نے ملنی کو اپنے کمرے میں بلوایا۔  
 ”وہ مجھے دیکھ کر سکرایا؟ تم سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی  
 ہوئی مس طر!“

”شکر یہ سر ہوئی آ میں۔ نے چھٹی مسکراہٹ سے جواب  
 دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ کر خاموش ہو گئی۔  
 وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھا رہا۔ پھر بڑی رواں اور  
 شستہ ڈنچ زبان میں مجھے میرے شن کے بارے میں ہدایات  
 دینے لگا۔

”دو دن بعد ۲۳ ستمبر کو ہمیں راولپنڈی جانا ہے۔ وہاں تم  
 فلیٹمین ہوٹل میں قیام کرو گی اور اس وقت تک وہیں رہو گی  
 جب تک کہ میرا آدمی مع ٹرانسپورٹ کے تم سے رابطہ قائم  
 نہ کرے۔ اس ٹرانسپورٹ میں تم پہلے پشاور چھرو جاؤں گے  
 چالیس میل دور ایک سرحدی مقام تک جاؤ گے۔ تم میرے  
 آدمی کے پاس ہو گی اور تمہارے ذاتی تحفظ کا ذمے دار  
 بھی ہو گا۔ اس سرحدی مقام پر پہنچ کر تمہیں اپنے  
 ایک پرانے دوست سے ملنا ہو گا۔ پھر  
 خود بخود تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہارا یہ سفر  
 پانچ دن میں پورا ہو گا۔ واپسی میں تم پھر پنڈی کے اسی ہوٹل  
 میں ٹھہری اور وہاں لوگوں کو بتاؤ گی کہ تم نے شمال کی سیاحت  
 کی اور تم بہت محظوظ ہوئیں۔ تم ہر جگہ غیر متعلق افراد سے  
 اپنا تعارف سیاحت طلبہ کی حیثیت سے کرو گی اور اپنے موجود  
 حسن کو تعلیمی اور تیحامی سفر کا نام دو گی۔ سمجھ گئی مس طر!“

میں متعدد تفریحی مقامات وہی جہاں میں کراتے کی کار سے  
گئی۔ چونکہ تنہا تھی اس لیے ہادی طرح بظن امداد  
ہوئی۔ میرا وقت گھونٹنے پھرے اور خاکچنگ کرنے میں گزرتا  
تھا۔ میں دن رات ہوٹل کے کمرے میں بھی تو مقید۔۔۔  
نہیں رہ سکتی تھی۔

جس دن مجھے راولپنڈی روانہ ہونا تھا اس سے ایک  
دن پہلے میں نے ایک ٹیکسی لی اور لاہور سے کہا کہ وہ مجھے  
شہر کی ایسی بستیوں میں لے چلے جہاں غریبوں کی آبادی ہو۔  
ٹیکسی ڈرائیور میری شکل دیکھنے لگا جیسے اسے میری مالی حالت  
پر شبہ ہو۔ میں نے بھراہنی بات دہرائی اور ایک ترجمان کی مدد  
سے اسے سمجھایا کہ میں یورپ کی ایک یونیورسٹی کی ریسرچ  
اسکار ہوں اور مطالعے و مشاہدے کی غرض سے پاکستان آئی  
ہوتی ہوں جو ٹکڑے بالکل ناواقف ہوں اس لیے ٹیکسی ڈرائیور  
کی مدد سے شہر کی ایسی بستیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں کم آمدنی  
والے لوگ رہتے ہیں۔

میری وضاحت سے ڈرائیور نے مطلع کیا اور میرے  
کندھے پر ٹکا ہوا کیمرو فورسے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے  
پوچھا کہ کیا میں ان بستیوں کی تصویریں بھی اتاروں گی۔ میرے  
اجابی جواب کے بعد اس نے مجھے مطلع کیا کہ میں ان بستیوں میں  
رہنے والی عورتوں کی تصویریں ہرگز نہ اتاروں کیونکہ معاشی  
لوگ اسے بہت معیوب خیال کرتے ہیں اور اپنی پردہ نشین  
عورتوں کی تصویریں کسی غیر کے ہاتھوں اتارنے سے یہ ہرگز  
تیار نہیں ہوتے۔ اگر میں نے اصرار کیا یا جبری چھپے ایسی کوئی  
کوشش کی تو وہ تشدد پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ اس تبصرے کے  
بعد ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مختلف سڑکوں اور گلیوں  
سے گزرتا ہوا ایک ایسی بستی میں پہنچا جہاں بڑی بدبو تھی چھوٹے  
چھوٹے بچے تنگ و دھڑنگ پتلی پتلی گلیوں میں کھیل رہے  
تھے اور ان کی مائیں جو چھپے پرانے عینٹل کیرٹوں میں طبوس تھیں  
اپنے تنگ و تاریک مکانوں کے دروازوں کے سامنے زمین پر بیٹھی ہوئی  
تیز تیز آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایک  
دوسرے کے سر میں جوئی دیکھ رہی تھیں۔ میں ٹیکسی سے اتر  
کر ان عورتوں کے قریب گئی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی بائیں بند  
کوری اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ ان کے بچوں نے مجھے  
چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بعض میری اسکرٹ پکڑ کر کھینچنے کی  
کوشش کرنے لگے لیکن جلد ہی ان کی ماؤں نے ان بچوں کو  
ڈانٹ کر مجھ سے دور کر دیا۔

کچھ عرصے میں نے میم صاحب میم صاحب کہہ کر اپنی زبان

میں مجھے قاطب کرنے اور قابا یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ  
میں وہاں کیوں آئی ہوں یہ ٹیکسی ڈرائیور جو میرے ساتھ تھا اور  
کوئی چھوٹی انگریزی بول لیتا تھا ان عرصے میں کہتا تھا کہ  
میں۔۔۔ ان بستیوں کی سیر کرنے آئی ہوں اور میرا مقصد صرف  
ان لوگوں کو دیکھنا اور یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھروں  
میں رہتی رہتی ہیں۔ ڈرائیور کی وضاحت سے وہ جوش و خروش  
ختم ہو گیا جو مجھے دیکھ کر ان عرصے میں اچھا لگا پیدا ہو گیا تھا۔

تاہم میں نے غور کیا کہ اب بھی بعض بڑی عمر کی عورتیں مجھے  
ٹیکسی کے نظروں سے دیکھ رہی تھیں جبکہ جوان عورتیں وہاں  
میں دیکھی گئیں۔ غابا ان کی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے باتیں کریں اور پوچھیں کہ کیا میرے  
ملک میں بھی غریب لوگ اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں؟

میری معلومات کے مطابق دنیا کے ترقی یافتہ اور امیر  
ملک میں بھی چھوٹے شہروں اور قصبوں میں کم آمدنی والے  
افراد اور خاندان تقریباً اسی انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔  
وہاں بھی چھوٹے چھوٹے مکانات ہوتے ہیں جہاں عورتیں  
اپنے ہسپاؤں سے حسد کرتی ہیں اور ذرا سی بات پر آپس میں  
لڑتی ہیں۔ ان کے بچے بھی اسی طرح تنگ و دھڑنگ گلیوں  
میں خاک و دھول کھاتے پھرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ترقی یافتہ  
ملک میں غریبوں کی بستیوں میں سڑکیں اور گلیاں بنتے ہوئی  
ہیں جن کی وجہ سے غلاظت زیادہ کم نظر آتی ہے۔ وہاں ہر محکمہ  
بجلی کی سہولت موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ بستاں قطعی  
تاریک نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ عام غریبوں کی جو نفیست  
ہوتی ہے وہ دنیا بھر میں ایک ہی جیسی ہے۔ خود میرے تنگ  
ہالینڈ میں بعض قصبوں میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی ہے  
وہاں محنت مزدوری کرنے والے لوگ تنگ و تاریک  
مکانوں میں رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی ایک دوسرے سے  
حسد کرتی ہیں اور ذرا سی بات پر آپس میں لڑتی رہتی ہیں  
لازمی پرائمری تعلیم کے قانون کی وجہ سے ان لوگوں کے بچے  
اپنے علاقے کے سرکاری اسکول ضرور جاتے ہیں لیکن اسکول  
سے واپس آ کر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ بہت کم بچے ایسے ہوتے  
ہیں جو سرکاری اسکولوں کی مفت تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ  
تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لیں۔ وہ اصل  
ان کے والدین کے وسائل لیتے نہیں ہوتے کہ اپنے نوٹھالوں  
کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکیں۔

کراچی کی ان بستیوں میں گھوم پھر کر مجھے ایک دلچسپ  
تجربہ بھی ہوا کہ یہاں رہنے والے قدامت پرست والدین

کے فوجان لڑکے تھے تعلیم پانچ اور دس خیال میں۔ میں ایسی ہی ایک بستی میں ایک کھنگلی سے گزر رہی تھی کہ ایک ٹوٹے بھوٹے مکان سے ایک فوجان برآمد ہوا وہ جدید وضع کے لباس میں بیوس تھا اور اپنے ماحول کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑی رواں انگریزی میں مجھے مخاطب کیا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کس ملک سے تعلق رکھتی ہیں؟“  
 ”تم سے میرانی کے ساتھ میں نے اس فوجان کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں شہر ہوں اور تعلیمی طور سے پر آپ کے ملک آئی ہوں۔“  
 ”کیا آپ کو کسی بین الاقوامی تعلیمی ادارے نے اس مقصد کے لیے کوئی وظیفہ دیا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ میں“

”وہ کون سا ادارہ ہے؟“ فوجان نے تجسس سے پوچھا۔  
 ”میرا میری یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرقی نے مجھے پاکستان کے مطالعاتی دورے پر بھیجا ہے۔“ میں نے بڑی مغفالی سے جھوٹ بولا۔

”کیا آپ کہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جو مشرقی ممالک کے طالب علموں کو مغربی ممالک کے تعلیمی اور مطالعاتی دوروں پر بلائے اور ان کا خرچ برداشت کرے؟“  
 ”ایسے ادارے تو کئی ہیں جو اقوام متحدہ کے تحت مختلف منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ یونیسکو کے مقامی دفتر سے اس سلسلے میں آپ کو مفصل معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے جواب دیا۔

وہ فوجان جواب تک گلی میں کھڑے کھڑے مجھ سے گفتگو کر رہا تھا، بڑے اخلاق سے کہنے لگا: ”میرا گھر اس قابل تو نہیں ہے کہ آپ جیسی معزز خاتون کو بٹھا سکوں تاہم اب جبکہ آپ ہم فریبوں کی بستی میں آ رہی ہیں تو ہمارے گھروں کے اندر بھی جھانک کر دیکھ لیں۔ اس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہی ہوگا۔“

”اوہ شکریہ، مسٹر! میں تمہاری دعوت بڑی خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ مجھے صرف تمہارے خلوص کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔“

فوجان جسے شاید میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی خوش ہو گیا اور اپنے گھر کے دروازے پر ٹکٹا ہوا گندہ پردہ ایک طرف ہٹاتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔  
 گھر کے اندر داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ صحن کچھلے اور

ساننے کے رخ دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ان میں سے ایک کمرے میں وہ مجھے نے کیا جہاں ایک چار پائی، ایک پھوٹی سی میز اور ایک کرسی موجود تھی۔ کرسی کو ایک کپڑے سے چھانٹتے ہوئے فوجان نے نہ امدت کے ساتھ مجھے بٹھایا جیسے محسوس کر رہا ہو کہ میرے قابل کرسی کہاں سے لائے۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ بغیر پلاسٹر کی دیواروں جن پر مقامی اخبارات سے کالی ٹیوٹی رنگین تصویریں چپکائی ہوئی تھیں۔ ان میں پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی بھی۔  
 میں نے اس سے پوچھا: ”تمہارا نام کیا ہے مسٹر! اور تمہارے ساتھ گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟“

”میرا نام محمد شریف ہے مس! میری بیوہ ماں اور ایک ملحقہ بہن رہتی ہیں۔ میں نے تین سال پہلے بی۔ اے کیا تھا اور دو سال تک سخت جدوجہد کی تھی جس کے بعد چار سو روپے ماہوار پر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہو سکا ہوں۔ تعلیم کے دوران میں نے بڑی کوشش کی کہ مجھے غیر جانکاب علم حاصل کر کے اسے کوئی وظیفہ مل جائے مگر بہترین تعلیمی دیکارڈ کے باوجود میں اپنے مقصد میں اس لیے ناکام رہا کہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی اور نہ ہی میرا کوئی قریبی عزیز اتنا بااثر تھا کہ مجھے وظیفہ دلا کر باہر بھجوا سکتا۔“

”اوہ، تو تم اس لیے مجھ سے ایسی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بڑا افسوس ہے مسٹر شریف، کہ فوری طور پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ البتہ میں واپس اپنے وطن جا کر تمہارے لیے کوشش ضرور کروں گی۔“

”کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟“ آپ مجھ پر اتنی مہربانی... کر سکتی ہیں؟“

”کیوں نہیں! میں تمہارے خلوص سے بہت متاثر ہوتی ہوں۔“

کمرے کے باہر محلے کی بہت سی عورتیں اور بچے جمع ہو گئے تھے جن کی آوازیں میں برابر سن رہی تھی۔ میرا تینکسی ڈرائیوڈ باہر گلی میں میرا منتظر تھا۔ شریف میری پیش کش کے بعد میرے آگے بھجا جا رہا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے اپنے گھر میں بنی ہوئی چائے پلائی اور جب تک میں چائے پیتی رہی وہ متواتر مثنوی کی کا اظہار کرتا رہا کہ اس کے پاس مناسب کراری بھی نہیں جس میں مجھ جیسی یورپی خاتون کو باعزت طریقے سے چائے پیش کر سکے۔ اس نے مجھے اپنا نام اور پتہ

جی ٹکھ کر دیا تاکہ ہالینڈ پہنچ کر میں اسے مطلع کر سکوں کہ اس کے وظیفے کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔  
جاتے پھینکے بعد شریف نے ایک بڑی دلچسپ بات بتائی جسے سن کر مجھے حیرانی کے ساتھ تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

”مس ٹرا! جب مجھے بچوں نے بتایا کہ ایک گوری میمپل گلیوں میں گھوم رہی ہے تو پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا، وہ کسی نشے کی عادی ہوتی لڑکی کا تھا۔ وہ اہل ہمارے علاقے میں آپ کے یورپ کے ہوتے والے نوجوان لڑکے کے بعد لڑکیاں جس کی تلاش میں اکثر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کئی جوڑے تو گزشتہ کئی برسوں سے اسی غلیظ ماحول میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے جس بے حد اہمیت رکھتی ہے جس کی خاطر انہوں نے اپنا وطن، گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور یہاں بھی انہوں نے اپنی عزت اور وقار کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ انہیں ہر قیمت پر نشہ چلبیسے۔ کبھی کبھی تو ان بے چاروں کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ جس خریدنے کے بعد پیٹ بھر کر دینی بھی کھا سکیں۔ ایسے موقع پر ہم غریبوں میں سے کوئی انہیں اپنا مہمان بنا لیتے ہیں سوچ رہا ہوں کہ آپ جو اس وقت میرے پاس میرے گھر میں بیٹھی ہیں تو میرے محلے والے ہی سوچ رہے ہوں گے کہ کسی نشہ باز ہوتی لڑکی کو میں نے کھانا کھلانے کے لیے مہمان بنا لیا ہے۔“

”اوہ مسٹر شریف! یہ بات تو واقعی بڑی افسوسناک ہے کہ ہم مغربی لوگوں کے بارے میں اتنا ہتک آمیز تاثر آپ لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اہل اس کی ذمہ داری بھی مغربی ممالک کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے پر ہی عائد ہوتی ہے جس نے اتنے کچھ مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ نئی نسل روحانی سکون سے بالکل محروم ہو چکی ہے۔ اس سکون کی تلاش میں یہ لوگ نشے کے عادی ہو جاتے ہیں اور اسی کی خاطر اتنے طویل سفر اختیار کرتے اور ذلتیں برداشت کرتے ہیں۔“  
مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ایک ریسرچ اسکالر ہیں اور ہماری گندی بستیوں میں جس کی تلاش کے بجائے ایک محسوس اور عملی معلومات حاصل کرنے آئی ہیں آپ سوچ سکتی ہیں کہ آپ کے بارے میں ابتدائی سوچ کے برعکس جب حقیقت معلوم ہوئی تو مجھے کتنی سزت ہوئی ہوگی؟  
”یقیناً مسٹر شریف! میں اذمانہ کر سکتی ہوں۔“  
اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ

وہ اس غریب آبادی میں اس لیے رہتا ہے کہ اس کے والدین یہاں رہتے چلتے آئے ہیں۔ ویسے وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے واقعی ایک شریف انسان تھا اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اس کی فطری شرافت اور نیکی کے جذبات اب بھی نکھر گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس شخص سے تعلقات استوار کروں تاکہ اس اجنبی دیس میں یہاں میں اپنی مرضی کے خلاف ایک محظوظ ناک مشن پر آئی ہوئی ہوں، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کر سکوں۔ اس خیال سے میں نے شریف سے کہا۔

”مسٹر شریف! میں کل صبح کی فلائٹ سے راولپنڈی جا رہا ہوں۔ میں تقریباً پانچ دن وہاں ٹھہروں گی۔ اس کے بعد واپس کراچی آؤں گی اور ہوٹل مہران میں مقیم رہوں گی۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اگر میری زندگی سے واپسی پر تم مجھے ہوٹل مہران میں ملو۔ میں تمہارے ملک میں بالکل تنہا ہوں۔ بعض وقت تو اپنی تنہائی سے میں بہت بدمعاش ہوتی ہوں۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں تم میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہو سکتے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ضرور رابطہ رکھو گے۔ لیکن ہے مجھے سبھی تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑ جائے۔“

”مس ٹرا! یہ میرے لیے بڑی عزت افزائی کی بات ہوگی۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ تنہائی کے لمحوں میں آپ کو کپنی دلوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔“  
شریف کے ساتھ اسی طرح کے دو چار رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو پورا محلہ شریف کے گھر میں ادا اس پاس جمع تھا۔ ہر شخص شریف کی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شریف نے اپنی زبان میں اپنے جیسایوں سے کچھ کہا جس کے بعد میں نے ان کی نگاہوں کے تاثر بدلتے ہوئے محسوس کیے۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ شریف کا اپنے بڑوسیوں پر کافی اثر تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان وہ واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا اور اس لحاظ سے ان لوگوں میں ممتاز تھا اور اس کی بات مانی جاتی تھی۔

واپسی میں ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ میں جس شخص کے گھر میں گئی تھی وہاں اتنی دیر تک کیوں ٹھہری اور وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ ڈرائیور کے ہاں تجسس کو میں نے پسند نہیں کیا اور اسے مختصر جواب دے کر مثال دیا۔ اس کے بعد ڈرائیور مجھے اللہ بھی کئی بستیوں میں لے گیا لیکن

جو دل اٹھائیں مجھے شریف سے مل کر حاصل ہوا تھا اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ دن ڈھلے میں واپس اپنے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہوٹل پر اتار دئے ہوئے ڈرائیور نے مجھے آگاہ کیا کہ میں رات کے وقت باہر نکلنے میں محتاط رہوں کیونکہ بعض حادثات پیش کیے ڈرائیور مجھ جیسی ساریوں کو سنان جگہ لے جا کر روٹ لیتے ہیں اور زحمت کی جائے تو قتل تک سے دریغ نہیں کرتے۔ ان دنوں پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا اور حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے لیکن غیر ملکی سیاحوں کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ انہیں حسب معمول خوش آمدید کہا جاتا تھا اور ہلائنگ سکن ہوتا ان کی رہنمائی اور مدد کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوٹل کی انتظامیہ بھی سیاحوں سے بہت تعاون کرتی تھی اور ملک کے مختلف حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتی تھی۔ یہی صورت میرے لیے بھی تھی۔ جب مجھے کاؤنٹر سے پی آئی اسے کاٹھ دیا گیا تو کلرک نے بڑی خوش اطہالی سے مجھ سے کہہ

”مس کٹر! آپ ہیں حکم دہشتیں تو آپ کی بکنگ ہم بھی کرا سکتے تھے تاہم اندہ کے لیے آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اس قسم کی خدمات بالکل مفت ہر زمان کو حاصل ہو سکتی ہیں۔“

دراصل مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ کوئی نے کس ذریعے سے اینڈی کے لیے میری بکنگ کرائی تھی اور کس کے ہاتھ میرا ٹکٹ مجھے بھجوا یا تھا۔ میں بے چارے کلرک کو کیا جواب دیتی۔ بر حال میں نہ اس کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ کے لیے ایسی خدمات ہوٹل کی انتظامیہ سے لینے کا وعدہ کر لیا۔



پروگرام کے مطابق میں ۲۴ ستمبر کو دوپہر کے وقت راولپنڈی پہنچ گئی۔ ایئر پورٹ سے پی آئی اسے کی اسٹیشن تک نکلنے کے ذریعے فلیٹ میں ہوٹل پہنچی جہاں پہلے ہی سے میرے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ کمرے میں اپنا مختصر سا سامان رکھ کر سب سے پہلے میں نے غسل خانے کا رخ کیا، جہاں سے تو تازہ ہو کر نسلی تو روم مردوں کے ذریعے نیچے طلب کیا۔

تین بجے سہ پہر میں خلافت عادت میٹنگ ہو گئی۔ مجھے دن میں سونے کی عادت نہیں ہے لیکن اس سفر میں میرے دل و دماغ اور اعصاب کچھ اتنے زیادہ متاثر تھے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ جسمانی انداز میں آرام کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے وطن میں نے کبھی کبھار کسی خاص پارٹی یا قومی جشن کے موقع پر دھسکی ضرور پی تھی لیکن شراب کی میں

عادی تھی اور نہ ہی اس کے استعمال کو اچھا سمجھتی تھی۔ لیکن مجھے کوئی خاص پرہیز بھی نہیں تھا۔ ہالینڈ میں تیار ہونے والی دھسکی دنیا بھر میں مشہور ہے اور اکثر ممالک خصوصاً امریکہ میں تو ہالینڈ کی دھسکی کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ میرے ہم وطن تو دھسکی کا اندازہ استعمال بہت مزید خیال کرتے ہیں لیکن میرے والدین بھی چونکہ صرف خاص خاص مواقع پر ہی اسے استعمال کرتے تھے اس لیے وہی طریقہ میں نے بھی اپنایا تھا۔ ہم بھی شراب نوشی کو اچھا نہیں سمجھتا تھا اور کبھی کبھار ہی دھسکی پیتا تھا اس لیے اور بھی میں شراب نوشی سے دور ہی رہی لیکن اس سفر کے دوران کئی مرتبہ بڑی شدت سے مجھے دھسکی کی خواہش ہوئی۔ پاکستان میں میرے پہنچنے سے چند ماہ پیشتر ہی شراب پر پابندی لگا دی گئی تھی اس لیے عام طور سے باروں اور ہوٹلوں میں دھسکی دستیاب نہیں تھی، البتہ میرے جیسے مستند غیر ملکیوں کے پینے کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی لیکن کراچی کے جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی تھی۔ میں چاہتی تو کسی ایسے ہوٹل میں منتقل ہو سکتی تھی، جہاں غیر ملکیوں کے لیے شراب فراہم کی جاتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ مجھے شراب کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب اینڈی آنے کے بعد مجھے دھسکی کی طلب بڑی شدت کے ساتھ ہونے لگی۔ شام کو چھ بجے میں سوکر اٹھی تو میں نے برے کو بلا کر براہی لانے کا آرڈر دیا۔ دھسکی کے مقابلے میں براہی تھکے ہوئے اعصاب کو طاقت اور تازگی بہتر طور پر پہنچاتی ہے۔ میں نے صرف دو پیگ لیے جس کے بعد واقعی میں خود کو ایک بالکل نئی شخصیت محسوس کرنے لگی۔ میری خود اعتمادی جو باوجود میری بھرپور کوششوں کے کمزور پڑتی جا رہی تھی، اب نہ صرف واپس آ گئی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی شان کے ساتھ واپس آئی تھی۔ میں ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے خود کو آمادہ محسوس کر رہی تھی۔ لاشعور میں کہیں جو ایک نامعلوم ساختہ تھا کہ آئندہ چند دنوں میں مجھے ایک بالکل ہی اجنبی شخص کے ساتھ سنگلاخ دیرازوں میں طویل سفر کرنا ہے اور پھر سیال چرس لے کر واپس بھی آنا ہے۔ اب بالکل مفقود ہو چکا تھا حالانکہ مجھے ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس سفر میں کس نوعیت کی مشکلات پیش آ سکتی ہیں لیکن میں یوں خود اعتمادی کے ساتھ اپنی جگہ سہمت ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔



شام گری ہو گئی تو ہلکے ہلکے سروں کے عالم میں میں باہر

نگلی۔ جوئی کے میٹ پر ہی مجھے جیسی نل گئی اور میں اس  
 کس کے جوڑی ماڈرن کوسٹ کے بازوؤں کی سیر کے لیے  
 چلی دی۔ جیسی تھوڑے تھوڑے جیسوں کا کافی تجربہ معلوم ہوتا تھا  
 مجھے پنڈی کے فیشن ایبل بازاروں میں لے گیا جہاں میں نے  
 تھوڑی سی شوپنگ بھی کی۔ ایک بہت بڑے جڑیل ہاٹھ سے  
 میں نے کلف جسم کی نوٹھی بات خریدی۔ وہ تو کچھ بڑی تھی  
 وہی ہوں۔ میٹرز میں نے مجھ سے کہا کہ یہ لپٹی ہونے کے نائنے  
 میں کلف جسم کے امپورٹڈ سینٹ ڈیوڈ میں جگنا جس دلی  
 نوٹھی خریدی۔ خریدی نہیں وہ عطر کتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ  
 اہل عطر و لاجی نوٹھی کے برعکس بہت دیر تک باس کو عطر  
 لکھا ہے۔ ان میں سے بعض عطر تو ایسے تھے جن میں بے  
 ہوتے باس لائنڈی میں ڈھلنے کے بعد بھی اسی طرح عطر تھے  
 تھے چنانچہ میں نے طرح طرح کے عطر بھی خریدے جو اور بھی  
 تھے لیکن اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ میں دینے کے قابل  
 تھے۔ میں نے ایک بے حد خوبصورت شیشی موشی کی نوٹھی سے  
 جوڑائی جو میں ہم کو بطور تحفہ دینا چاہتی تھی۔ میری طرح ہم  
 بھی نوٹھی بات کا ماشق تھا۔

میں رات نو بجے تک پنڈی کے بازاروں کی سیر کرتی  
 رہی۔ پھر واپس ہوئی پہنچ گئی۔ مجھے جھوک بھی لگ رہی  
 تھی اور دن میں سگن گھنٹے سونے کے باوجود نیند کا بھی طبلہ  
 تھا۔ میں نے ڈر کا آٹھ دیا اور کھانا آتے آتے شب جوانی  
 کا باس بین لیا تاکہ کھانا کھاتے ہی سو جاؤں۔

ایک الجھن یہ تھی کہ لونی کے بقول ڈرائیونگ کے  
 ساتھ جو شخص آنے والا تھا اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔  
 یہ تو مجھے یقین تھا کہ میری پنڈی میں آئیگی اطلاع لونی  
 یا اس کے متعلق آدمی کو جو بھی ہوگی اور یہ بات بھی عین  
 قرین قیاس تھی کہ انہوں نے مجھے اپنی نگاہ میں رکھا ہو۔  
 سیکڑوں طین ڈالر کا کاروبار کرنے والے اتنے بے وقوف  
 برگز نہیں ہو سکتے کہ وہ مجھ سے اور میری سرگرمیوں سے غافل  
 ہو جائیں۔ میری ذرا سی نغزش ان سب کو تباہ کر سکتی تھی۔  
 لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر وقت انتظار میں بیٹھنے کے  
 بجائے مجھے باہر نکل کر گھومنا پھرنا چاہیے۔ ظاہر ہے جب  
 وہ مجھے یہاں سے لے جاتا چاہیں گے تو ایسے ہی وقت  
 ہو کر پہنچیں گے جب میں اپنے کمرے میں موجود ہوں گی لیکن  
 اس فیصلے پر عمل سہا مکی لڑت نہ آسکی۔ میں کھانے سے  
 فارغ ہو کر غسل خانے میں ہاتھ دھو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی  
 بجی۔ کوئی بھلاؤں مجھ سے ملنے آیا تھا۔

میں نے کلاؤنگ ٹریک کو ہلانے کی کوشش کی اور میرے کمرے  
 میں بھیج دیا جلتے۔ بھلاؤں بھلاؤں بھلاؤں میں ہوں تھا  
 اس کے منہ میں پائپ دیا گیا تھا اس نے جیسی زبان لگاری  
 میں ہرے کاٹا۔ صبح آٹھ بجے پہلی دوا کھائی ہے۔

”ابھی پہلی۔ میں آج ہی تو پنڈی پہنچی ہوں۔“  
 وہ سکاڑا۔ مس لگا پنڈی میں اتنا ہی ہے جتنا آج  
 آپ نے دیکھا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بس ماہ  
 سا طر ہے۔

”میں بس ہی۔ تو گویا میری سرگرمیوں میں تم لوگوں کی  
 نظروں میں نہ آتی؟“  
 ”قد تو بات ہے۔ ہم اپنے منہ پہاڑ سے کیسے غافل  
 رہ سکتے تھے؟“

”بہت بہتر جناب، جناب کا حکم ہے۔“  
 بھلاؤں کو ایک خوش اخلاق اور تجربہ کار شخص معلوم  
 ہوتا تھا کہ لونی مس لگا پنڈی کیا، ہم لورا یا کان آپ  
 کو دکھائیں گے۔ جیسی سیر کی گئی تھی لیکن کام سے  
 فارغ ہونے کے بعد وہ اہل، ہمیں بہت سی باتوں کا خیال  
 رکھنا پڑتا ہے جب سب طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے  
 اس وقت ہم کوئی اہم قدم اٹھاتے ہیں۔ اب آپ کیسے  
 ہم نے مقدمہ مقدم پر پارٹی کو کھالیا ہے۔ اگر ہر وقت پروا  
 نہ لیں تو اسے شک ہو جائے گا اور وہ واپس ہو جائے گی۔  
 پھر دوبارہ اس سے رابطہ قائم کرنا اور وقت کا تعین کرنا ایک  
 طویل عمل ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ گئی ہیں نا؟

”مگر تمہارا آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ مجھے  
 کچھ تامل ہے؟ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ میں کام کے لیے آئی  
 ہوں اسے جلد سے جلد مکمل کر کے واپس چلی جاؤں۔“

”واہ دامزہ آگیا۔ آپ جیسی دلیر خاتون کے ساتھ کام  
 کرنے کا لطف ہی کچھ ہے۔ بس تو پھر یہ باہر سے کچھ  
 صبح آٹھ بجے آپ چلنے کے لیے بالکل تیار ہوں گی۔“  
 ”یقیناً میں آپ کو تیار ملوں گی۔ میں نے جلدی ہاتھ  
 سے جواب دیا۔“

وہ اطمینان کا اظہار کر کے واپس چلا گیا اس کے جلتے  
 ہی میں نے سلمان سمیٹا شروع کر دیا۔ میں ریشم سے سدا  
 ہوتی تھی تو میرے پاس بہت مختصر سا مان تھا، لیکن کراچی  
 میں شاہنگ کر کے میں نے اپنے سامان کا فصل بڑھایا تھا  
 کراچی کے بازاروں میں ایک سے ایک دلچسپ چیز تھی،  
 جسے نہ خریدتی تو سامی زندگی انوس کرتی۔ پھر یہ بھی تو لگتی



نہیں تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی یہاں آنا ہو گا یا نہیں، لہذا جو ہمت ملی اسے قیمت جان کر میں نے ہر وہ چیز خرید لی جو مجھے ابھی معلوم ہوئی۔ میں نے ننگ ترشی کے خوبصورت فونے لیے۔ سب گزر کے بنے ہوئے تاج محل کے ڈال خریدے۔ تاکہ اپنے دوستوں کو یاد دلا سکے۔ وہ سکوں۔ مشرقی وضع کے بیل بوٹوں سے مزین زمانہ لباس خریدے۔ کٹری مینا کاری کیے ہوئے کڑی کے سجائی ظرافت بھی خریدے۔ ایسے ایسے خوبصورت ڈیزائنوں والے زیورات خریدے۔ جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فریڈیک بے شمار چیزیں تھیں جو میں نے خرید لی تھیں۔ زندگی میں اتنی ساری دولت بیک وقت میسر نہ ہوتی تھی۔ زندگی میں اتنی تھی اور نہ ہی ایسا اختیار ملا تھا کہ جو چاہوں خریدوں، جس طرح چاہوں خرچ کر دوں۔ پھر بھلا میں کیوں کس رہو تھی۔

دوسرے کے مطابق بختاورد ٹھیک صبح آٹھ بجے لینڈ ارنڈ لے کر پہنچ گیا۔ گاڑی کا اندر بی بیعت بہت آرام دہ اور کشادہ تھا اور کچھ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ اندر بیٹھا ہوا آدمی باہر سے نظر نہیں آسکتا تھا صرف ڈرائیور اور اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا شخص ہی سرگٹھے کھا جاسکتا تھا۔ اس گاڑی کو خاص طور پر ایسے ہی مقاصد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اندر بی بیعت میں ہلکا پھلکا کھانا اور چائے وغیرہ تیار کرنے کا بھی انتظام تھا۔ گویا طویل سفر میں کہیں قیام کیے بغیر کھانے پینے کی ہر ضرورت پوری کی جاسکتی تھی۔ گاڑی میں خشک راشن اور بسکٹوں کے ڈبے بھی داخل مقدار میں موجود تھے۔ ایک جانب ٹھنڈے پانی کی ٹنکی بھی تھی۔ گاڑی میں سوار ہو کر بختاورد نے مجھے اندر بی بیعت میں منتقل کر دیا اور خود ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہمارا ڈرائیور ادھیڑ عمر کا پٹھان تھا جس کے چہرے پر ہلاکی خوشنوت تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی معلوم ہوتی تھیں جیسے وہ کوئی ریڈار ہوں، وہ مضبوط جسم اور طویل قد و قامت کا مالک تھا۔ وہ شہسوار لیتھ میں لمبوں تھا، اور کمر سے ایک چمڑے کی بیٹی میں ریوا اور بھی لٹک رہا تھا۔ سینے پر کار توں کی بیٹی تھی۔ بختاورد حسب معمول قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور مسلسل پائپ کے کٹنگار رہا تھا۔

گاڑی ایک جھینکے سے آگے بڑھی اور تیزی سے مختلف موڈ کھتی ہوئی ایک سیدھی اور طویل سڑک پر آگئی۔ اس سڑک پر آتے ہی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک تیز رفتاری سے راستے طے کرنے کے دوران ہم تینوں خاموش رہے۔

ڈرائیور جسے بختاورد نے ایک بار لالہ کہہ کر مخاطب کیا تھا پھٹی توجہ سے ڈرائیورنگ کر رہا تھا اور خود بختاورد کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے جب یہ ماحول دیکھا تو خود میں کوئی بات کرنے کے بجائے شفاف پلاسٹک کے پار بیرونی مناظر دیکھنے لگی۔ یہ مناظر اتنے خوبصورت تھے کہ مجھے بعض وقت یہ گمان ہوتا تھا کہ میں یورپ کے ہی کسی ملک میں گھوم رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سڑک پہاڑوں میں داخل ہو جاتی تھی اور جب تک جگہ خطرناک موڈ مٹتی تھی لیکن لالہ پھٹی ہمارے سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اس سڑک میں کے ایک ایک پلچ سے واقفیت ہو۔ جب ہم اس پہاڑی علاقے میں پہنچے تو پہلی بار بختاورد نے مجھے مخاطب کیا۔

”مس ٹرا، ہمارا ملک آپ کو پسند آیا؟“

”میں تمہارے ملک سے بہت متاثر ہوئی ہوں مسٹر بختاورد، بلکہ ابھی ابھی میں سوچ رہی تھی کہ خوبصورتی کے لحاظ سے آپ کا ملک یورپ کے بہت سے ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ خصوصاً یہ پہاڑی علاقہ، یہ ہلکا ہلکا ماحول یہ حد نظر تک پھول ہی پھول اور جگہ جگہ پہاڑی ندیاں اور جھرنے میں نے بیٹھے بیٹھے کتنی ہی تصویریں اتاری ہیں۔“

”اچھا مس ٹرا، یہ آپ چیکے چیکے کمانی کا دھند ابھی کر رہی ہیں؟“ بختاورد نے خوش دلی سے کہا اور پھر کہنے لگا۔ ”مگر میرا کمیشن مجھے ضرور بھجوادینے گا۔“

”ضرور ضرور، آپ کی وجہ سے ہی میں اس علاقے تک پہنچی ہوں۔ کمیشن آپ کا حق ہے۔“ اس مختصر سی گفتگو کے بعد پھر خاموشی چھا گئی بختاورد نے اپنا پائپ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور پشتوں میں لالہ سے کچھ کہا۔ جواب میں ڈرائیور نے سڑک کے ایک جانب گاڑی روک دی۔

گاڑی رکتے ہی بختاورد ”ابھی آیا“ کہہ کر ایک ستیری پہاڑی کی اوٹ میں غائب ہو گیا اور لالہ اسٹیرنگ پر سر ٹھکا کر انتظار کرنے لگا۔ میں سوچنے لگی، اس دیر لانے میں وہ کس سے ملے گیا ہے۔ کیا کوئی شخص پہلے سے اس کا منتظر تھا؟ میری ہمت نہیں ہوئی کہ لالہ سے کچھ پوچھوں لہذا میں دھڑکتے دل کے ساتھ چوکتا ہو کر بختاورد کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد بختاورد واپس آتا نظر آیا۔ اس کے قریب بیٹھتے ہی لالہ نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی اور

اس کے بیٹھے ہی آگے بڑھا دی۔ میں اب بھی خاموش تھی کہ بختاورد نے اپنے شانے کے اوپر سے بچے دیکھتے ہی کہہ دیا: کال آف نیچر!

• اور یہ بات تھی۔ میں سوچ رہی تھی اس ویرانے میں تم کس فرشتے سے ملنے گئے ہو؟ وہ ہنسنے لگا۔

ہم لوگ اٹھ کے پل پر پہلے تو ڈیر ٹھہرنا تھا۔ پل پر چینگا گھرنے والے غلٹنے سرسری طور پر گاڑی کے اندر نظر ڈالی اٹھا آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے پل عبور کر لیا تو بختاورد نے مجھے بتایا کہ اب ہم لوگ پنجاب سے نکل کر صوبہ سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے پاکستان کے چاروں صوبوں کے متعلق بتایا۔ آخر میں صوبہ سرحد کے بارے میں کہنے لگا کہ پاکستان کا یہ صوبہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور محل وقوع کے لحاظ سے سب سے اہم صوبہ ہے۔ اس صوبے کی سرحدیں ایک طرف افغانستان سے ملتی ہیں تو دوسری طرف روس اور چین سے ملتی ہیں، تیسری سمت کشمیر ہے۔ کشمیر کے بارے میں بختاورد نے بتایا کہ یورپ کا سب سے حسین ملک سوئٹزر لینڈ ہے جس کے حسن کے حیرت سے یورپ والے گاتے ہیں، لیکن کشمیر یہ خطہ ہے جو سوئٹزر لینڈ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے اور شاعروں نے اسے زمین پر جنت کا ٹکڑا کہا ہے۔ مجھے بختاورد کی بات کا یقین آ گیا، اس لیے کہ اب تک جتنا علاقہ میں دیکھی آ رہی تھی وہ واقعی اس قدر حسین تھا کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے تھے۔ اتنے خوبصورت علاقے کا سب سے والا اگر کشمیر کے حسن کی تعریف کر رہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ واقعی وہ کوئی چیز ہوگا۔

اٹھ کے پل سے گزر کر ہم بلند و بالا پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ بیشتر مقامات ایسے تھے جن کے ایک جانب آسمان سے باتیں کرتا ہوا پہاڑ تھا تو دوسری جانب پہاڑیں ٹٹ گھرے کھڑے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جگہ جگہ اچانک موڑ جانا ڈرامائی سا بھی چوک جاسے تو سوار اور سواری سمیت... تحت اثری جاپنچے لیکن شاہباش ہے لالہ کو جو پورے انہماک اور مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھے اس کی خاموشی اب بھلی لگ رہی تھی۔ میں دل سے چاہتی تھی کہ وہ اپنا دھیل صرف راستے پر رکھے اور بات چیت بالکل نہ کرے جس کے مدللن اس کی توجہ بٹ سکتی تھی۔

ڈھائی بجے کے لگ بھگ جب میں بھوک سے بے حال ہو گئی تو میں نے بختاورد سے کہا: مسٹر بختاورد! آپ لوگوں نے بیچ کا کیا پروگرام رکھا ہے۔ کیا ہم اس سفر کے دوران

بھوکے ہی رہیں گے؟

”صرف تین منٹ اور صبر کریں میں تمہارا تین بجے تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں گرام گرم بیچ ہوا منتظر ہوگا۔“

• اور، تو یہ بات ہے۔ آپ نے راستے کیلے میزبانوں کا بھی اہتمام کر رکھا ہے؟ میں نے ہنسنے لگے کہا۔ ”جی ہاں آپ ٹھیک سمجھیں اور یہ جو آپ گاڑی میں بچن اور اسٹیشن دیکھ رہی ہیں یہ صرف ہنگامی مواقع کیلئے ہے جب ہمیں سیکڑوں میل تک کسی میزبان کی توقع نہیں ہوگی۔ اس وقت ہم اپنی دعوت خود کریں گے لیکن جب تک ہمیں باہر سے رسد ملتی رہے گی ہم اپنا اسٹیشن استعمال نہیں کریں گے۔“

”اگر تم کچھ خیال نہ کرو تو یہ پوچھوں کہ کیا اس سفر میں ایسے کسی ہنگامی موقع کی توقع ہے؟“

”قطعاً نہیں۔ اس لیے کہ ہم آج رات ایسے مقام پر بسر کریں گے جو آبادی سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ پھر جن لوگوں کے ساتھ بسر کریں گے وہ ہمارے اپنے لوگ ہوں گے کل صبح جب ہم روانہ ہوں گے تو سہ پہر تک پھر ایک ایسے ہی مقام پر ہوں گے جہاں گرام گرم بیچ ملے گا اور شام تک ہم اپنی منزل پر ہوں گے۔ واپسی بھی اسی طرح ہوگی۔“

”میری بڑی الجھن دور ہو گئی مسٹر بختاورد! دن میں سوچ رہی تھی کہ نا معلوم ہمیں کتنا طویل سفر کرنا پڑے۔“

”مگر بس مگر! ایک بات کی معذرت میں پہلے سے ہی چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھ سے ان مقامات کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا جہاں ہم ٹھہریں گے اور نہ ہی ان لوگوں سے تعارف پراصرار کرنا جو ہماری میزبانی کریں گے۔ یہ احتیاطی تدابیر ہیں جو ہم ہر غیر ملکی کے سلسلے میں اختیار کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم بڑا نہیں مانو گی۔“

”یقیناً میں بڑا نہیں مانوں گی۔ مجھے لپٹے کام سے غرض ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ویری گڈ مس ٹر! تم جیسی تعاون کرنے والی خاتون کے ساتھ کام کر کے بڑی خوشی ہوتی ہے اور پھر شے سے بڑا مرحلہ سہولت کے ساتھ ملے ہو جاتا ہے۔ مدلل ہوں گا۔ بارہ میں زیادہ سوالات ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتے ہیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنا کہ اسمگلنگ کے کاروبار میں سہولت سے زیادہ ایک لفظ اور بغیر کسی ضرورت کے ایک سوال بھی ملک انجام سے دو چار کر سکتا ہے۔ سمجھیں اس نظر بڑا

۱۰ بالکل صحیح ہے۔ مگر پتا تھا اب میں بلا ضرورت کوئی سوال نہیں کروں گی۔

یعنی اتم ہی نہیں بلکہ خود ہی تم سے کوئی فضول سوال نہیں کروں گا اور تم نے غصوں کیا ہوگا کہ اب تک میں نے تم سے علاوہ مزید کسی کام کے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ ہم لوگ کتنی دیر سے خاموش سفر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ صبح سے اب تک لالہ نے بمشکل چند لفظ بولے ہوں گے۔ ہمارا بہت پرانا کارکن ہے اور ایک لحاظ سے ہم سب کا استاد۔ اس کے ہاتھوں بڑے بڑے مشکل کام ایل چکیوں میں بخیر و خوبی انجام پاتے ہیں۔ یہ بھی بالکل خاموش ہے۔ معاف کرنا ہماری گفتگو پھر بلا ضرورت ہوتی جا رہی ہے۔

ہم دونوں نے اس بات پر ایک بھر پورا تہہ لگایا اور خاموش ہو گئے۔

ہماری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی جسے شاید لالہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ بدستور اپنی توجہ سے ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا تھا اور میں خاموش ہو کر ایک ایک منٹ گن رہی تھی کہ کب ہم اپنے میزبانوں کے درمیان پہنچیں گے اور کب کھانا نصیب ہوگا۔

بالآخر یہ جان لیا اور اٹھا گھنٹہ بھی گزر گیا اور ایک پہاڑی گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ ٹھیک ساتھیں بجے لالہ نے پتھر میں سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی کے سامنے گاڑی رکھ دی۔ گاڑی کی آواز سن کر اندر سے تین چار افراد باہر آئے جو اپنے ملاقاتی لباسوں میں ملبوس تھے۔ بخانا کو دیکھ کر انہوں نے بڑا تپاک ظاہر کیا۔ اس سے گلے ملے انہوں نے بخانا سے اپنی زبان میں میرے بارے میں کچھ پوچھا۔ میرا اندازہ ہے کہ بخانا نے ان لوگوں کو میری اہلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن اس نے جو کچھ بھی بتایا اس کے نتیجے میں ان کی نظروں میں میرے لیے انتہائی احترام مہلکنے لگا۔ ہم تینوں جھونپڑی کے اندر پہنچے جہاں ایک قیمتی قالین بچھا تھا اور ہر طرف بڑے بڑے کیے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس جھونپڑی میں اتنا قیمتی قالین دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

ہمارے پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں نے دسترخوان بچھا دیا اور درمیان میں ایک بہت بڑے کھلے برتن میں کچے ہوئے چاول، ۳ پر دہنے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے لاکر کہ دیے۔ واقعی گرم مینج تھا۔ اپنی زنگلی میں نے کبھی اتنے لذیذ چائس نہ گوشت

نہیں کھایا تھا۔ فرخ پھینک کر کھانے کا بھی میرا یہ پسلا اتفاق تھا۔ خاصہ خاصہ مشرقی انداز تھا۔ مجھے اتنی شدید ہجک لگی ہوئی تھی کہ کھانے سے پہلے میں نے کسی بات پر غور ہی نہیں کیا۔ جب پیٹ میں درد کھلا گیا تب سمجھ میں آیا کہ یہ مشرقی تہذیب ہے جس میں فرخ پر آرام سے بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سیاہ قوسے کا دود چلا۔ اس قوسے میں بھی مجھے بے پناہ لطف محسوس ہوا تھا۔ کم دیش ایک گھنٹہ گزار کر ہم اپنے میزبانوں سے رخصت ہوئے اور ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

اب جو راستہ ہمارے سامنے تھا وہ گزرے ہوئے راستے کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشوار گزار تھا۔ میں بار بار ہول رہی تھی اور دل ہی دل میں خیریت سے منزل تک پہنچنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

کھانا پسند آیا تو اچانک بخانا نے سوال کیا۔

”بے حد پسند آیا مگر بخانا! سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں سرخ مرچ استعمال نہیں ہوتی تھی مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں ایسی کوئی خوش ذہن ہو جو میں نہ کھا سکوں اور پھر مجھے ان بسکٹوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے۔“

”ارے ہاں! یہ بات تو میں نے ہی کیا تھا کہ تم یہ پتی لوگ سرخ مرچ نہیں کھا سکتے۔ مدد مل رہا ہے ہاں گوشت کے سالن میں طرح طرح کے مسالے اور سرخ مرچ استعمال کی جاتی ہے، چاولوں میں نہیں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ خیرات کا کھانا بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی ہوگا۔“

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر خاموش ہو گئی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اب جو خاموشی چھانی تو مجھے نیند نے آگھیرا۔ میں جہاں بیٹھی تھی وہ جگہ کافی کشادہ تھی لہذا میں نے بغیر کسی تکلف کے آرام سے لیٹ کر سو جانے کا فیصلہ کیا۔ چند گھنٹوں کی نیند مجھے تروتازہ بھی کر سکتی تھی اور میں اس خطرناک راستے کے پُر ہول نظارے سے محفوظ بھی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ میں آرام سے لیٹ گئی۔ مجھے لیٹتے دیکھ کر بخانا نے کہا: ”بالکل ٹھیک کر رہی ہو مس تر! میں خود تم سے کہنے والا تھا کہ چاہو تو بلا سے سو جاؤ۔“

”چلیے آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں نے سونے کا پروگرام بنایا۔ خدا حافظ۔“

وہ سننے لگا۔ گاڑی کے جھٹکے مجھے جھلکے کے پکڑے معلوم ہونے لگے اور انجن کی آواز لودی میں بدل گئی۔

میری آنکھ کھلی تو سورج ٹھہر چکا تھا۔ اسٹوڈنٹوں کا منظر ڈرونا سا تھا۔ پہلوؤں کی بلند بالا چوٹیاں عجیب معلوم ہونے لگی تھیں۔ لالہ سی تو براہ ہوش مندی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جبکہ بختہ بیٹھا اور ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی ہوشیار ہو گیا اور گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے لالہ سے پشتوں میں کچھ کہا اور جواب سن کر میری طرف متوجہ ہوا۔ تمہارے سونے کے بعد مجھے بھی نیند آنے لگی تھی اور میں بھی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ سات بج چکے ہیں اب ہم تھوڑی دیر بعد اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ہمیں رات بسر کرنا ہے۔

میں خاموش رہی اور اسے گرد اس خیال سے نظر ڈیلانے لگی کہ کہیں انسانی آبادی ہو اور وہ غنیاں نظر آجائیں، لیکن وہ دور تک تاریکی تھی اور لینڈ سکرین کی آواز کے علاوہ کچھ سناتا تھا۔ میں سوچنے لگی میرے سونے کے دوران ہاٹلوم کیسے کیے خوبصورت مناظر گزر گئے ہوں گے۔ وہ اصل ہائی اسکول کے نزلے تک مجھے مصدقہ کا بھی شوق رہا تھا اور لینڈ سکرین کی چیننگ میرا پسندیدہ موضوع تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ واپسی میں تو نہ انہیں نہیں ہوگا اس لیے میں ضرور وہ مناظر دیکھوں گی جو وہ گھنٹوں کی نیند کی وجہ سے میں نے کھو لیے ہیں۔

گاڑی میں بھی مکمل خاموشی طاری تھی۔ ہر چند کہ بختہ اور بھی اپنی غنودگی سے نجات پا کر پاپ سگکا چکا تھا لیکن کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ یہی حال میرا تھا کسی کسی وقت میرے ذہن پر انجیل نے اندیشے ابھرا لیے تھے۔ ان غیر مہذب لوگوں کی نیت میں فتور آتے کتنی دیر لگتی۔ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا جبکہ وہ ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ اگر ایسا کوئی وقت آجاتا تو میں کیا کر سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان لوگوں کے سامنے کسی کڑھی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ اب تک جس خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتی آ رہی ہوں اسے جاری رکھوں گی۔

آخر یہ لوگ بھی تو سوچیں گے کہ بظاہر ایک کڑوہ سی لڑکی ایسے خطرناک مشن پر آئی ہے تو ضرور اس نے اپنی حفاظت کا کوئی مضبوط انتظام کر رکھا ہوگا۔ بس یہی گمان میری حفاظت کے لیے کافی ہے۔

لالہ نے ایک بہت ہی مشکل موڈ بڑی مہارت سے مڈا اور ایک فرلانگ تک تقریباً عمودی جڑھانی بڑھانے کے بعد اچانک ایک بستی میں گاڑی داخل کر دی۔ چاروں طرف دھیمے دھیمے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی جن نے اطمینان کی سانس لی۔ بختہ نے سیٹ پر پہلو ہلا۔ پھر

گاڑی ایک ہتھوں سے بنے ہوئے احاطے میں داخل ہو کر ٹھہر گئی۔

آکھنچ رہے تھے۔ اس بستی میں بھی بلا کا سنا تھا صرف ہنسی سی مدھنی کی وجہ سے انکا وہ ہوتا تھا کہ یہاں کچھ ہی طرح رہتے ہیں اگر گھر میں میں چراغ درجیل رہے ہوتے تو کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کوئی انسانی بستی بھی ہے۔

گاڑی کے نکل جانے کے باوجود اندر مکان سے کوئی برآمد نہیں ہوا تو لالہ نے ہاسن بجایا، جو اس منہانے میں بہکے دھماکے کی طرح لگا تھا۔ فوراً ہی چاروں طرف سے آوازیں آتی شروع ہو گئیں۔ بختہ گاڑی سے اتر چکا تھا۔ لالہ اندر اپنی لپٹی جگہ پر بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد کئی لوگ بختہ کے قریب پہنچ گئے اور اس سے معاف کرنے لگے۔

گاڑی جس احاطے میں رکھی تھی وہ اس گاؤں کی چوال تھی جسے مقامی لوگ جھڑھتے تھے۔ بختہ کے اشارے پر یہاں بھی گاڑی سے اتر آئی اور اپنا بیگ لٹکاتے ہوئے آگے بڑھ کر جھڑھے میں داخل ہو گئی۔ جھڑھے خاصا کشادہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے تک یہاں بہت سے لوگ بیٹھے رہے ہوں۔ تباہی کی بوجھ سے جھڑھے میں بسی ہوئی تھی۔ ایک جانب ایک طویل روعریض تخت بچھا ہوا تھا جس پر ایک قیمتی قالین بچھا تھا۔ جھڑھے کے درمیان میں ایک گروہا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ تخت پر ایک جانب رکھ دیا اور خود بھی ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بختہ اور دوسرے لوگوں کی آوازیں باہر سے آرہی تھیں۔ وہ لوگ پشتوں میں باتیں کر رہے تھے جو میں نہیں سمجھ سکی۔ میں بیٹھی بیٹھی جھڑھے کا جائزہ لیتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس علاقے میں لوگوں نے مشکل زندگی کو اپنی سادگی سے کتنا آسان بنا لیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس بستی میں مشکل ایک سو گھر ہوں گے اور شاید تمام لوگ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کر کے زندگی کی گاڑی کو دھکا دیتے ہوں گے ورنہ اس اجاڑ اور ویران مقام پر کسی کا بھی گزارہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ بختہ اندھا آیا اور مجھے اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور اس کے عقب میں چلتی ہوئی جھڑھے سے باہر آ گئی۔ بختہ نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔

ہمس مڑا تم اس کے ساتھ اس کے گھر میں جاؤ وہاں

خواتین میں۔ تم ان کے ہمراہ سات بسر کرو گی۔ تمہارا ڈنر بھی تمہیں دینے کا ہے۔  
 اور مشورہ ہے کہ بہت بہت شکریہ۔ تم نے یہ انتظام کر کے میری ساری فکر دھ کر دی ہے۔  
 بخدا وہ نے فخر سے بچے میں کہا۔ مس پترا ہم پٹھان لوگ ہیں اپنے سہان کی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم لوہے کے کسی شہر میں شاید اتنی محفوظ نہیں ہوگی جتنا پاکستان کے اس مصافحہ ہواڑی گاؤں میں۔ وہاں تمہیں اپنی ماں کی آغوش کی مانند آرام اور تحفظ ملے گا جاؤ اور علی الصبح سات بجے دعا مانگی کے لیے تیار رہنا۔

اتنا کہہ کر بخدا وہ مڑ کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا اور میں اس شخص کے ساتھ اس کے مکان میں آگئی جہاں تین خواتین تھیں جو غولڈا بڑے جوش و خروش سے میری آمد کی منتظر تھیں۔ میرے پہنچنے ہی انہوں نے پشتوں میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا اور مجھے اس انداز سے دیکھ رہی تھیں جیسے میں کسی اور ستارے کی مخلوق ہوں۔ نسبت سے زیادہ حیرت سے وہ میری اسکرٹ کو دیکھ رہی تھیں جو ان کے معیار کے مطابق برہمنگی کی دوسری شکل تھی۔ تاہم انہوں نے مجھے بڑے آرام کے ساتھ رات بھر کہا۔ میں بھی یوں دل جمعی کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئی۔ کھانا البتہ مجھے تمہا ہی کھانا پڑا یا تو وہیلے ہی کھا چکی تھیں یا شاید میرے ساتھ کھانا انہوں نے نیویب سمجھا تھا۔



اس علاقے میں ان دنوں اچھی خاصی گرمی پڑ رہی تھی لیکن مجموعی طور پر موسم خوشگوار تھا۔ میں جو اپنے سر دھاک میں علی الصبح اٹھ کر اسکول جانے کی عادی تھی بغیر کسی شواہی کے بخدا وہ کی ہدایت کے مطابق صبح سات بجے چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میری میزبان خواتین نے مجھے دودھ پھنسا اور کئی کی تازہ روٹی تیار کرنا شروع کر دیا۔ میں اس لذت کو بیان نہیں کر سکتی جو مجھے اس پہاڑی بستی میں اتنا سا روزہ ناشتہ کے حاصل ہوئی تھی۔ مجھے یہ ناشتہ اور اپنی میزبان خواتین ساری مزیدادیں کی۔ ان کے بارے میں میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہہ سکتی ہوں کہ پاکستان کے مرد جتنے تو واضح خلیق، بہاد اور شاندار ہیں، ان کی خواتین ان صفات میں ان سے برکز کم نہیں بلکہ ان میں ایک زائد صفت ان کی حیا اور پاکیزگی ہے۔ میری میزبان خواتین میں ایک غیر شادی شدہ

لوہان لڑکی بھی تھی۔ وہ مجھ سے اتنا شرماتی تھی کہ پردے میں کوئی وہ شیزہ کسی ٹیبلٹ سے بھی اتنا چاہتے نہ تھی۔  
 ٹھیک سات بجے ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہمارا ڈنر ایسا لاد جو بوسنی کی خولہ تھیں میں بوسنی پینڈی سے چلا تھا اب اس نے گرسے سڑی کینگ کے پیشیا کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اس کا ریاکارانہ کاندھوں والی پیٹی البتہ اسی طرح اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ بخدا وہ نے مجھے صبح بخیر کہا اور کسی طوبہ آگے بڑھنے کی اجازت مانگی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ حضور سفر شروع کر دو تاکہ یہ جلد ختم ہو اور ہم لوگ باہر لوہا ہو کر اپنی اپنی جگہوں پر واپس ہو سکیں۔

آمین بخدا وہ نے کہا اگلا ڈی دعا نہ ہوگی۔ بستی کے تقریباً تمام ہی مردوں اور بچوں نے ہمیں خدا حافظ کہا اور جب تک ہماری لینڈ اوف نظر آتی رہی وہ منگ بنگے رد مال لہرتے رہے۔

سات بھر آرام اور اطمینان سے سوینے کا فائدہ یہ ہوا کہ میں بالکل تازہ دم ہو گئی تھی۔ گزشتہ روز کے سفر کی تکان کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت اس علاقے کی خوبصورتی نرم نرم دھوپ میں نکھر کر ابھی دکھائی ہو گئی تھی اور وہ دور تک سرسبز پہاڑوں کے سلسلے، گری گری وادیاں جن میں حدنگاہ تک پھول ہی پھول کھلتے تھے۔ فضائی ایسی خوشبو رچی ہوئی تھی جس نے شام جان کو معطر کر دیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے دل میں انگلیں لڑ لڑا جاتی تھیں۔ اس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے پھر ہوتے ہوتے جب دھوپ میں تیزی آگئی تو علاقے کے مناظر بھی بدلنا شروع ہو گئے۔

اب ہم علاقہ غیر میں سفر کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کی حکمرانی نہیں ہے۔ کسی مذہب حکومت کا کوئی قانون یہاں نہیں چلتا۔ اس علاقے کے رہنے والے اپنے معاملات خود اپنے ہاتھوں کے ذریعے طے کرتے ہیں۔ قتل تک کے مقدمات مستعدہ علاقے کے بزرگ آپس میں مشورے سے نڈلتے ہیں یہاں صرف انصاف ہوتا ہے اور اسلامی احکام کے مطابق تنازعات کے نہ جملے ہوتے ہیں۔ قرآن کی قسم پر سنگین سے سنگین مندرجہ ذیل عمل ہو جاتا ہے لیکن ہمارے لوگ قرآن کی جتنی قسم بھی جہاں تک ممکن ہو نہیں کھاتے۔ کہیں کوئی شخص قرآن کی قسم کھا کر کسی بات کا یقین دلائے تو ہر شخص پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا یقین کرے۔

میں حیرت سے جتاؤ کی باتیں سن رہی تھی۔ اس علاقے کے بارے میں جتاؤ کا اتنی تفصیل سے گفتگو کرنے کا مقصد غالباً میرے دل میں یہ خوف پیدا کرنا تھا کہ اگر میرے دل میں ایک لمحے کے لیے کوئی ایسی ویسی بات یا غذا کی کا تصور بھی آجائے تو میں اپنے ارادے سے باز ہوں، اور خاموشی سے وہی کرتی رہوں جس کا جتاؤ مجھے حکم دے۔ وہ مزید بتانے لگا۔

جب ہندوستان اور پاکستان پر انگریزوں کی حکومت تھی جیسے تم ہائینڈ والوں نے اندیشہ کیا کہ غلام بنایا ہوا تھا۔ ان دنوں بھی اس علاقے کے لوگ انگریزوں کے قبضے میں نہیں آتے تھے۔ ان پہاڑوں میں بڑی خوفناک جنگیں بھی لڑی گئیں لیکن یہ مسلمان قبائلی کسی بھی طور پر انگریزوں کے قابو میں نہیں آسکے۔ یہی وجہ تھی کہ افغانستان جو ہمیشہ سے ایک بہت کمزور ملک رہا ہے، انگریز اس کی خود مختاری کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے اور باقاعدہ معاہدہ کر کے افغانستان کو ایک آزاد مملکت تسلیم کر لیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی قبائلی اپنے قدیم رسم و رواج پر کاربند رہے۔ وہ نہ افغانستان کی حکومت کے تابع ہیں اور نہ ہی حکومت پاکستان کے کسی قانون کو ملتے ہیں۔ البتہ اپنے مذہب اسلام کے نام پر وہ بڑی سے بڑی قربانی بھی دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اسلام اور قرآن کا قانون ملتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنے تنازعات کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہتر انصاف کا وعدہ ہے۔ اگر کسی کمزور پر کسی طاقتور نے کوئی ظلم کیا ہے تو وہ غریب بزرگ میں جا کر زیادہ کر سکتا ہے۔ اس کی شکایت پر جگہ اس شخص کو لہنا طلب کر لے گا خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ پھر بزرگ طرفین کا موافق من کر ایدوئے انصاف فیصلہ صادر کر دے گا۔ اس کا فیصلہ ماننا ہر شخص پر فرض ہوتا ہے۔

اس قبائلی معاشرے میں جو بظاہر وحشی نظر آتا ہے وہیں ایسے واقعات عام ملیں گے جن میں کسی قبیلے کے بزرگوں نے ایک غیر ملکی کے مقابلے میں خود اپنے کسی شخص کے خلاف فیصلہ دیا ہو لیکن یہ لوگ اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ کوئی غیر ملکی یہاں آکر مقامی لوگوں کا استحصال کرے یا اپنی چالاک سے ایسا کوئی کام کرنے کی کوشش کرے جس سے وہ خود تو دولت مند ہو جائے اور مقامی آبادی یا فرد کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

جتاؤ نے غیر ملکیوں کے حوالے سے یہ گفتگو ختم کر دی۔

یہ ہاتھ کرانے کے لیے کی تھی کہ میں کسی گورڈ کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ وہ خواہ لڑا لڑی باتیں کر کے خود اپنے بندے ہوتے اس اصول کو توڑنا تھا کہ اس ملک کے کاؤبار میں متعلقہ فریقوں کو کم سے کم گفتگو کرنا چاہیے اور غیر متعلقہ بات تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہیے۔ میں جتاؤ کی تسلی کے لیے پوری توجہ سے اس کی تقریر سنتی رہی اور سر ہلاتی رہی۔ اس طرح میں نے وہی رد عمل ظاہر کیا جس کی وہ مجھ سے توقع رکھتا تھا۔ اس بیماری گاڑی باقاعدہ سڑک چھوڑ کر جنگ پھاڑی چھوڑ دیوں پر نسبتاً کم زور سے دوڑ رہی تھی۔ اس راستے پر بھی لالہ کیساں مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے خواب راستے کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔ فائدہ یہ ہے کہ ایسے راستوں پر کار چلانا ناہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، صرف لالہ جیسے مجھے ہوتے شخص سے مل دو مانع کا شخص ہی ان راستوں پر کار چلا سکتا تھا اور اس پر پورا پورا قابو رکھ سکتا تھا۔

دوپہر کو جتاؤ نے فیصلہ کیا کہ گاڑی میں موجود راشن کی مدد سے بیچ تیار کیا جائے گا لیکن اس مقصد کے لیے گاڑی معک نہیں جائے گی۔ چنتی گاڑی میں ہی آلے کے چیس اور سڑک کے مانے چھوڑے جائیں گے جنہیں سمجھنے کی ڈبل روٹی سے کھایا جائے گا۔ بعد ازاں کافی یا چائے بنا کر پی جائے گی۔ اس قافلے میں حیرت ہونے کی وجہ سے بیچ تیار کرنے کی ذمہ داری میں نے سنبھال لی حالانکہ جتاؤ نے خود سب کام کرنے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن میں نے اس کی مدد لینے سے بھی صاف انکار کر دیا اور چنتی گاڑی میں بڑی آسانی کے ساتھ بڑھنے سے وار بیچ تیار کر دیا۔ بیچ تیار کرتے ہوئے اللہ بعد ازاں بیچ کرتے ہوئے میں یہ بات بالکل بھول گئی کہ میں کسی سٹن پر ہوں۔ مجھے بالکل پکنک میرا لطف آ رہا تھا۔ ان دونوں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور میری بڑی تعریف کی۔

ہم لوگ بیچ سے فارغ ہو کر جانے کی چکیاں لے رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز سن کر اچھل پڑے۔ کہیں قریب ہی کسی نے راکفل سے فائر کیا تھا لالہ نے بڑی ہوشیاری سے گاڑی کو ایک جھان کی آڑ میں کھرا کر دیا اور جتاؤ نے اپنا ریو اوڈ نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ لالہ نے بھی اپنا ہولسٹر کھول لیا لیکن ریو اوڈ پر نہیں نکالا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے، بیسے فائر کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن

دو تین منٹ میں جلنے کے باوجود بھی نہ تو کوئی دم سرد ہوا کہ  
 پرواز ہی بندری گاڑی کی طرف کوئی آنکھ نہ آیا۔  
 بچا سا ہانگ بیچے کو گیا اور تھوڑی سی دشواری کے  
 ساتھ اس چٹان پر چڑھ گیا جس کی آڑ میں گاڑی کھڑی تھی۔  
 اس نے ہمارے طرف نظریں منڈائیں۔ پھر وہ واپس گاڑی  
 میں آیا اور جس میٹ پر وہ بیٹھا تھا اس کے نیچے سے ایک  
 فٹ بین نکال کر دوبارہ چٹان پر چڑھ گیا۔  
 وہ فوراً واپس آیا اور ٹشو لٹناک لے کر میں لالہ سے پتو  
 میں باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ میری فکر مندی کا خیال کر کے مجھے  
 بتانے لگا کہ تقریباً دو لاکھ کے لاکھ پر واوی میں چند لوگ  
 باقی بچے نظر آتے ہیں۔ دور ہونے کی وجہ سے وہ پھیلنے  
 نہیں جاسکے۔ ممکن ہے وہ شکاری ہوں اور یہ بھی ہو سکتا  
 ہے کہ افغانستان یا پاکستان کی ہارڈ آرمی کے سپاہی ہوں  
 جن کے ذمے صرف سرحدوں کی حفاظت ہی نہیں بلکہ ملک  
 کی روک تھام بھی ہے۔  
 میں نے کسی گھبراہٹ کے اظہار کیے بغیر پوچھا: یہ کیسے  
 پتہ چلے گا کہ وہ کون ہیں؟  
 "میں انتظار کرنا ہوں گا" بختاور نے کہا۔ "لیکن یہ  
 انتظار خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"  
 میں نے کہا: اگر وہ اتنے قریب آگئے کہ جہاں دیکھ  
 لیا اور وہ ہارڈ آرمی کے لوگ ہوتے تو پھر ہمیں نکل جانے  
 کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" بختاور نے میری بات سن کر اس  
 طرح سر ہلایا جیسے وہ میری بات کو ذہن سے دہرا رہا ہو۔ پھر  
 لالہ سے مخاطب ہو کر پشتوں میں کچھ کہنے لگا۔ لالہ جواب  
 تک خاموش ہی رہا تھا اکھڑے لہجے میں بختاور کو ایک جانب  
 اشارہ کر کے کچھ بتانے لگا۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر  
 بیٹھ گئے اور گاڑی بظاہر اسی طرف روانہ ہو گئی جہاں بختاور  
 نے فٹ بین سے ریفلی ہارڈ لوگ آتے دیکھے تھے۔  
 ناہموار راستے پر کچھ دیر چلنے کے بعد لینڈ ریسٹنگ ایک  
 خطرناک موڑ کا نا اور تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر نسبتاً ایک  
 ہموار جگہ پہنچ گئی۔ یہاں پہنچ کر لالہ نے گاڑی روک دی اور  
 بختاور کے ہاتھ سے فٹ بین لے کر چاروں طرف دیکھنے لگا  
 پھر ایک سمت مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد بختاور سے کچھ  
 کہا جس پر وہ دونوں ہنسنے لگے۔  
 بعد میں یہ جگہ لالہ کی آبادی سے رودروہ کے آسمان  
 کی اشیاء لے کر کسی قبیلے کے چار افراد اپنے ٹھکانے پر لوٹ  
 ہو رہے تھے۔ اس علاقے میں یہ دستہ تھا کہ جب سفر پر

جاتے تو دو چار میل چلنے کے بعد ایک فائر فزرد کر دیتے تاکہ  
 کوئی انہیں لوٹنے کا ارادہ کرے تو انہیں ہر طرح سے مسلح  
 دیکھ کر اپنا ارادہ ترک کر لے۔  
 مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان لوگوں کو یہ دستہ پہلے سے  
 معلوم رہا ہوگا، پھر پہلے فائر پر یہ بدحواس کیوں ہو گئے  
 تھے؟ میں سوچنے لگی وال میں کچھ کالا فزرد ہے، مگر میری نگاہ  
 میں کچھ نہ آیا۔ رات پہلے سے ہی بختاور کے قبضے میں تھی۔ یہی  
 ایک ایسی چیز تھی جسے بھٹنے کے لیے وہ لوگ میرے ساتھ  
 کوئی ڈرامہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کیا بات ہو سکتی ہے  
 میں گہرے غور و فکر میں ڈوب گئی۔  
 لالہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دوبارہ اسی مقام پر لے  
 آیا جہاں سے مڑ کر ہم اوپر پہنچے تھے۔ وہ اس چٹان کے قریب  
 رکنے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک کوئی  
 خاص بات نہیں ہوئی۔ وہ دونوں بھی خاموش تھے جیسے کسی  
 گہری سوچ میں ہوں۔ میں نے خاموشی کو توڑا۔  
 "اب ہمارا کتنا سفر اور باقی ہے مڑنا اور؟"  
 "تقریباً چار گھنٹے کا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے  
 کہا: "چھ بجے تک ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں گے۔"  
 مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا اور میں کل کی طرح ایک نیند  
 لینے کے خیال سے پھر لیٹ گئی۔ میں نے سوچا کہ سفر کے یہ  
 آخری گھنٹے میں سو کر گزار دوں تو انتظار کی اذیت سے بچ  
 جاؤں گی۔ جب سو کر اٹھوں گی تو منزل سامنے ہوگی۔  
 ایک گھنٹے قبل ہونے والے واقعے سے طبیعت میں  
 جو تکرر پیدا ہو گیا تھا وہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں دوبارہ  
 نارمل ہو کر آنکھیں بند کرنے والی تھی کہ بختاور نے لالہ سے پشتوں  
 میں گفتگو شروع کر دی اور معمول کے خلاف لالہ نے مختصر جواب  
 دینے کے بجائے بختاور کے ساتھ طویل بات چیت شروع کر  
 دی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر ایسی کیا نئی بات ہو گئی جو لالہ اتنی  
 طویل گفتگو کر رہا ہے۔ میری چھیٹھی محسوس بیدار ہونے لگی۔ میں  
 نے اٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن فوراً ہی ہمتی کر دیا۔ میں اپنی  
 حرکات و سکنات سے ایسا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتی تھی،  
 جس سے وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ میری خود اعتمادی میں کمی واقع  
 ہو رہی ہے۔ میں خاموش آنکھیں بند کیے لیٹی رہی جیسے مجھے  
 ان کی کوئی پروا نہ ہو۔  
 تھوڑی دیر چل کر اچانک گاڑی پھوٹ گئی۔ میں بدستور  
 آنکھیں بند کیے بیٹھا ہر کرتی رہی جیسے سو رہی ہوں۔ یکایک  
 کئی آدمیوں کے پشتوں میں بائیں کرنے کی آوازیں آنا شروع

ہو گئیں۔ اب مجھ سے صبر نہ ہو سکا اللہ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے پلاسٹک کے کدے سے جھانک کر باہر نظر ڈالی تو مجھ ایک قریبی چٹان کے عقب سے تین بالکل پرورہ چٹان آتے نظر آئے جو گاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے، اللہ باہر کھڑے ہوتے بخاندہ سے تیز آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ بخاندہ خاموش کھڑا ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس نئی افکار کا مقابلہ کس طرح کرے۔

لالہ جو اب تک خاموش اپنی نشست پر بیٹھا تھا ان لوگوں کو قریب آتے دیکھ کر بیچے اتر گیا اللہ گھوم کر بخاندہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آئے والے تینوں افراد نے بخاندہ اور لالہ سے نہ ہاتھ ملاتے نہ اپنے دستور کے مطابق معائنہ کیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی ان دونوں سے جیسے کچھ مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی جگہ سہم گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر فائرنگ شروع ہو گئی تو میں کیا کروں گی۔ اس پاس کا تمام علاقہ میرے لیے قطعی غیر محفوظ تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں بظاہر بالکل ویرانی تھی۔ قطعی سناٹا تھا لیکن کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مہیب چٹانوں اور خوفناک غاروں میں آدمی چھپے بیٹھے ہوں جو اچانک ہی سامنے آجائیں گے۔ میں نے اپنی جگہ سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا اور گوشش کی کہ وہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ میں برابر باہر جھانک کر ہنواں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

اچانک آئے والے تین آدمیوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں اور بخاندہ اور لالہ کو کور کر کے انہیں ایک طرف چلنے کی ہدایت کی۔ بخاندہ انہیں خشکیں نظروں سے کٹے ہوئے اس طرف چلنے لگا جہر سے وہ تینوں آتے تھے۔ لالہ بخاندہ کے پیچھے چھپ چھل رہا تھا۔ کوئی بیس قدم چل کے وہ پانچوں ایک سمت ٹپٹے لہہ ایک بڑی چٹان کی وجہ سے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب میں اس خوفناک ویرانے میں تنہا رہ گئی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر نہی صورت حال پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھان کا انتظار کرنا چاہیے۔

سورج غروب ہونے میں بھی ابھی کئی گھنٹے باقی تھے ہو سکتا ہے ان لوگوں کا کوئی قبائلی مسلہ ہو جسے طے کر کے بخاندہ اور لالہ جلد ہی واپس آجائیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں ان لوگوں کے سامنے نہ آئی ورنہ وہ مجھے بھی ان دونوں کے ساتھ لے جاتے اور مجھے تو شاید مال غنیمت سمجھتے۔ چند لمحوں بعد میں نے گاڑی سے اتر کر کہیں

قریبی چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھنے کا فیصلہ کیا تاکہ گاڑی پر بھی نظر نہ سکوں اور اس پاس کی صورت حال کا بھی جائزہ لیتی رہوں۔

میں نے جلدی جلدی اپنا صندوقی سامان سمیٹا خشک راشن کے چند ڈبے بھی اپنے پیگ میں ڈال لیے اور پوسے ہوش و حواس میں رہ کر آئندہ پیش آنے والی متوقع صورت حال کے مطابق اپنی ضروریات پر غور کیا اور افتاد کے ساتھ عقبی دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ میں نے قریب ہی ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی جو تین طرف سے بند تھی اور سامنے بھی ایک چٹان کی آڑ موجود تھی جس کی اوٹ سے گاڑی پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ میں اس کھویر میں اتر گئی جو بہت زیادہ گہری نہیں تھی اور جس راستے پر ہم سفر کر رہے تھے اس کے بالکل کنارے واقع تھی۔

میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ صاف کی اور چھپ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگی کہ گاڑی چلانا تو میں جانتی ہوں لیکن راستے کا علم نہیں ہے جاؤں گی کہاں؟ اگر میں گاڑی لے کر ادھر ادھر کھسکوں گی تو بہت جلد حریف نظریں میرے تعاقب میں لگ جائیں گی۔ اگر میں پیدل چل دیتی ہوں تو ممکن ہے کہ کسی قریبی آبادی تک پہنچ جاؤں جہاں گوشہ رات کے پڑاؤ کی طرح گھروں میں عورتیں بھی ہوں وہاں سے مدد لے کر خیال خاں کے گاؤں تک پہنچ جاؤں جو بقول بخاندہ کے صرف تین چار گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ خیال خاں مجھ سے واقف ہے اور اس کا شاید کوئی وغیرہ سے رابطہ بھی ہے۔ وہ اس صورت حال سے ان لوگوں کو مطلع کر سکتا ہے اور میری حفاظت بھی کر سکتا ہے۔ اسی ادھیڑ بون میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ بخاندہ اور لالہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ گاڑی بھی اپنی جگہ کھڑی تھی، کوئی غیر متعلق شخص بھی گاڑی تک نہیں آیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں مجھے اپنے والدین اللہ جم بڑی طرح یاد آنے لگے تھے۔ مجھے ہم کے مشورے یاد آ رہے تھے اس کا خیال سو فیصد درست نکلا تھا کہ میں بے رحم جرائم پیشہ افراد کا لڑکا بن گئی ہوں۔ اس گروہ میں اطالوی بھی تھے، بھارتی بھی، افغان اور جاپانی بھی، اور اب میں ڈوچ اللہ یہ پاکستانی بھی شامل ہو گئے تھے معلوم نہیں اللہ کون کون لوگ اس گروہ میں ہوں گے۔ پھر ہر ملک میں ان کے بااثر پشت پناہ بھی ہوں



گے جن کے بل بٹے پر لوگ دنیا بھر میں اپنی مذہب  
 مگر میوں کا جال بچانے ہوتے ہیں۔  
 تقریباً پانچ بجے ہوں گے جب میں نے اپنی کین گاہ  
 سے نکل کر خود اپنے طور پر جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں  
 سورج غروب ہونے سے پہلے کسی انسانی آبادی تک  
 پہنچنا چاہتی تھی تاکہ رات محفوظ طریقے سے گزار سکوں اور  
 مدد حاصل کر کے اپنا موجودہ سفر دوبارہ جاری رکھ سکوں۔  
 یہ سوچ کر میں نے حالات کا مزاد وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ  
 کیا اور اپنا بیگ، دو دن بن جو گاڑی سے اٹھالائی تھی  
 اپنے دونوں کندھوں پر لٹکائے اور ایک سمت کا تعین  
 کر کے چل کھڑی ہوئی۔ پہاڑی علاقوں میں خصوصیت  
 ہوتی ہے کہ آبادیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں، اور اچانک  
 سامنے آجاتی ہیں۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا  
 کہ مجھے دلد سے کسی آبادی کا نشان نظر آجاتے گا۔ میں نے  
 محض اپنے وجدان کے سہارے ایک طرف چلنا شروع کر  
 دیا۔ جس طرف میں جا رہی تھی ادھر پہاڑیاں تو تھیں لیکن  
 بہت بلند نہیں تھیں۔ تھوڑی سی جدوجہد سے انہیں عبور  
 کیا جاسکتا تھا۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک پہاڑی  
 نالہ بھی بہ رہا تھا جس میں شفاف پانی شور کرتا ہوا گزر رہا  
 تھا۔ میں جب اس نالے پر پہنچی تو دن بھر کی کسل مندی  
 نے مجھے غسل کرنے پر اکسایا لیکن اس نالے کے کنارے  
 کہیں کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جہاں میں غسل کر سکتی۔ اس  
 لیے باوجود شدید خواہش کے میں نے صرف منہ ہاتھ دھو  
 کر خود کو تروتازہ کر لیا اور پھر اللہ کا نام لے کر چل پڑی  
 میں ان پہاڑیوں کی چوٹی تک پہنچ کر درہن سے  
 چاروں طرف آبادی تلاش کرتی رہی لیکن مجھے مایوسی  
 ہوئی۔ اب میں نے نسبتاً ایک زیادہ بلند پہاڑی پر  
 چڑھ کر اردگرد کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں جلد از جلد  
 کسی پڑاؤ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جوں جوں سورج مغرب کی  
 سمت جھک رہا تھا میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔  
 سخت محنت کے بعد میں ایک بلند پہاڑی کی  
 چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اپنی خوشی الفاظ  
 میں بیان نہیں کر سکتی جو مجھے اس کامیاب کوہ پیمائی سے  
 حاصل ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے  
 ایورسٹ کی چوٹی فتح کر لی ہو۔ اسی بلندی پر پہنچنے کے بعد  
 میں نے دلد بن سے جب گاڑی کی سمت دیکھا تو مجھے  
 دہاں آدمیوں کی جہل پیل نظر آئی۔ اب جو میں نے غور

کیا ابد دل جمعی کے ساتھ دیکھا تو مجھے بخاورد لالہ اور وہی  
 تین رائفل بردار نظر آئے جو گاڑی کے چاروں طرف کچھ  
 تلاش کر رہے تھے۔ وہ لوگ مزید مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔  
 میں کانپ کر رہ گئی۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ  
 جاتی تو نامعلوم میرا کیا حشر ہوتا؟ میں نے بڑی تیزی کے  
 ساتھ چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ کہیں بہت دور ایک  
 سمت مجھے ایک پہاڑی کے عقب سے دھواں اٹھنے  
 کے آثار نظر آئے۔ میں نے دلد بن ہٹا کر جب اس مقام کا  
 جائزہ لیا تو وہ جگہ مجھے کم از کم ایک میل دلد نظر آئی لیکن  
 دشوار گزار ہونے کی وجہ سے میں وہاں سورج ڈوبنے  
 سے پہلے نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے اطمینان  
 ہوا کہ میری توقع بیاہ گاہ اس سمت سے قطعی مخالف سمت  
 میں ہے جس طرف بخاورد وغیرہ کو رائفل کی نوک پر زبردستی  
 لے جایا گیا تھا۔ گویا یہ دو بستیاں ہیں جو ایک دوسری  
 کے مخالف سمت میں واقع ہیں چلتے چلتے میں نے  
 پھر گاڑی کی طرف دیکھا تو پانچ افراد گاڑی میں سوار  
 ہو کر چل پڑے تھے۔

اب گویا میری کشتیاں جل چکی تھیں اور جو کچھ کرنا  
 تھا مجھے ہی کرنا تھا۔

اوپر نیچے سنگلاخ راستوں پر چلتی ہوئی میں  
 ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر چڑھتی اترتی رہی۔  
 میں بار بار درہن سے اس پہاڑی کو دیکھ لیتی جس کے  
 عقب میں مجھے انسانی آبادی کے آثار محسوس ہوتے  
 تھے۔ میں بعض مقامات پر بہت گھوم کے راستہ طے کر  
 رہی تھی لیکن میں نے اس پہاڑی کو اپنی نظروں سے  
 اوجھل نہیں ہونے دیا۔

ابھی میں نے اپنے حساب سے آدھا راستہ ہی طے  
 کیا ہو گا کہ ایک چٹان کے عقب سے مجھے کسی کے ہاتھ  
 کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر فدا اپنی سمت  
 بدل دی اور خود کو ایک اوٹ میں چھپا لیا۔ چند لمحوں  
 بعد میں نے دیکھا کہ میں جس راستے پر جا رہی تھی، وہیں  
 ایک بڑی چٹان کے پیچھے سے دلد رائفل بردار برآمد ہوئے  
 اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں ایک جانب چھپی انہیں  
 جاتے دیکھتی رہی اور شکر کرتی رہی کہ انہوں نے مجھے  
 نہیں دیکھا اور میں بروقت ہوشیار ہو گئی۔ میں کسی  
 آبادی میں پہنچنے سے پہلے کسی کی نظر میں نہسیں  
 چاہتی تھی۔

تفتیشی افسر کا نوٹ ہے۔

مس جین ٹرن نے مجھے اپنے پیروں پر حائل  
ذخموں کے وہ نشانات دکھاتے ہیں جو  
بقول اس کے مذکورہ پہاڑی سطر کے دوران  
آتے تھے۔ اس کے تلووں پر بھی جھالوں کے  
نشانات موجود تھے۔ (انسپکٹر)

جب کسی کی جان پرین جاتے تو کتنا ہی کڑوا انسان  
کیوں نہ ہو، اس میں نہ جاننے کہاں سے اتنی قوت آجاتی  
ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مصائب کو روند ڈالتا ہے۔ قدرت  
نے میرے اندر بھی اس وقت کچھ اتنی ہی طاقت، اعتماد،  
اور عزم پیدا کر دیا تھا جس کے سہارے میں سورج غروب  
ہونے کے لڑاکی دیر بعد اپنی مطلوبہ بستی میں داخل ہو گئی۔  
یہ بھی بالکل ویسی ہی آبادی تھی جیسی میں نے گزشتہ دو  
دنوں میں راستے میں دیکھی تھیں۔ بے ترتیب بنے  
ہوتے پتھرے گھر اور درمیان میں ایک کشادہ احاطہ  
جس میں بنا ہوا ایک بڑا ہال کر جسے یہ لوگ جسٹہ  
کہتے تھے۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ  
یہاں کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ دراصل میرے  
ہمت سے لوگوں کی چہل پہل نظر آ رہی تھی لیکن ابھی تک  
مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر بٹھرت  
کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اندھیرا ہونے  
کی وجہ سے میں کوئی خاص بات محسوس نہ کر سکی۔ پھر میں  
نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور سیدھی  
حجرے پر پہنچی۔ بڑے کمرے کے اندر سے تیز تیز آوازیں  
آ رہی تھیں جیسے کوئی بحث ہو رہی ہو۔ ابھی میں متذہب  
سی احاطے میں کھڑی تھی کہ چند لوگوں نے مجھے دیکھ لیا  
اور وہ دھڑکتے ہوئے میری طرف آئے۔ انہوں نے آتے  
ہی مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے بڑے  
کمرے کی جانب لے چلے۔

اندر ایک قیمتی قالین پر دروازے کے بالکل سامنے  
خیال خاں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے بچا اور اور لالہ  
اسمے ہونے لوزانو بیٹھے تھے جبکہ فرش پر چاروں طرف  
کم از کم تیس آدمی اور بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی....  
خیال خاں بچا اور اور لالہ پشتوں میں ایک خوشی کا لہرہ لگا کر  
کھڑے ہو گئے اور مجھے پکڑ کر لے جانے والوں سے کوئی

سوال کیا جس کا انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر خیال خاں  
نے انگریزی میں مجھے خوش آمدید کہا اور میرے بیٹھنے کے  
لیے اپنی جگہ خالی کر دی۔ بچا اور نے مجھے حیرت سے دیکھ  
کر پوچھا: تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں جو آب تک  
لپٹے ہوئے جو اس میں رہی تھی اس اب تک صوفیہ خاں  
سے تقریباً اٹھلی۔ میں سوچنے لگی کہ یقیناً میں کوئی خواب  
دیکھ رہی ہوں۔ شاید میں کہیں راستے میں بے ہوش  
پڑی ہوں اور خواب میں وہی کچھ دیکھ رہی ہوں جو میں  
چاہتی تھی لیکن میری گم صم کیفیت بہت جلد ختم  
ہو گئی۔

میرے وہاں پہنچنے پر داخل یکا یک ایسا جنگ  
اختیار کر گیا تھا جیسے صرف میں ہی نہیں بلکہ وہاں موجود  
ہر شخص شدید حیرت کی ہیٹ میں آ گیا ہو۔ بہر حال تھوڑی  
دیر بعد جب سب کے جو اس کچھ درست ہوئے تو پتہ چلا  
کہ ایک غلط فہمی کی بنا پر حالات نے اتنا سنگین رخ  
اختیار کر لیا تھا۔

بچا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا  
اور مجھے بتانے لگا۔

”مس ٹرن! تم رحمت کا فرشتہ بن کر یہاں پہنچی ہو۔  
اگر اور تھوڑی دیر تم نہ آتیں تو معلوم نہیں یہاں کیا کچھ ہو  
جاتا۔ دراصل اس علاقے میں خیال خاں کی فیکٹری ہے  
جس کی حفاظت کے لیے خاں صاحب نے خصوصی انتظامات  
کر رکھے ہیں۔ تمہیں یاد ہو گا جس مقام پر ہمیں روکا گیا تھا  
اس سے چند میل پہلے لالہ اور میرے درمیان تھوڑی سی  
بحث ہوئی تھی۔ دراصل میں نے لالہ سے یہ کہا تھا کہ اب  
جبکہ ہم اپنی منزل سے قریب پہنچ چکے ہیں ہمیں چاہیے  
کہ لینڈ روور میں رکھا ہوا سرخ فلگ گاڑی کے ٹکڑے  
پر لگا دیں تاکہ آس پاس پہاڑوں میں چھپے ہوئے حفاظتی  
عملے کے لوگ دور سے ہی ہمیں پہچان جائیں اور ہمیں  
صحیح راستے تک پہنچنے میں مدد دیں لیکن لالہ نے میری  
بات سے اتفاق نہیں کیا اور کہنے لگا کہ ابھی سڑک کا  
دور ہے اور اتنا پہلے سے فلگ لگا یا گیا تو پاکستانی  
قبائلی علاقے کے لوگ جو اس فیکٹری کے سخت خلاف  
اور اس کے مالک کے جانی دشمن ہیں ہمیں پکڑ لیں گے۔  
یہی وجہ تھی کہ جب تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ منزل ابھی  
اور کتنی دور ہے تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چار گھنٹے کا  
سفر اور ہے۔ یہ بات میں نے لالہ کے خیال کے مطابق بتائی

تھی۔ لڑکائیوں سے کہ وہ بھی اپنی جگہ صبح تھا۔ وہ جس راستے پر چلا آ رہا تھا وہ اس کا سیکڑوں بار کا دیکھا جھالا تھا اور اسے لہجہ خراہہ راستے کا صحیح اندازہ تھا۔ لیکن صرف ایک مقام پر اس نے ایک بڑے سے پہاڑ کے گرد گھوم کر آگے بڑھنے کے بجائے اس کے درمیانی دشوار گزار راستے پر گاڑی ڈال دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عین اس مقام پر جا نکلے جہاں خیال خاں کے حفاظتی قلعے نے اپنی کانڈ پوسٹ بنائی ہوئی ہے اور اس محفوظ ترین مقام کے قریب سے کسی گاڑی کے گزرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس بگڑی گاڑی سے صرف پچھروں اور اونٹوں کے قافلے ہی گزرتے تھے جہاں جو عام طور سے بے ضرر ہوتے ہیں۔ جب ہم لوگ اس مقام پر پہنچے تو ہمیں روک لیا گیا۔ تم چونکہ گاڑی کے اندر چھپی بیٹھی تھیں اس لیے تم پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ کاش وہ لوگ ہمیں دیکھ لیتے تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو یہ بات معلوم تھی کہ ایک یورپین لڑکی خیال خاں کی مہمان بن کر آنے والی ہے جو ان راستوں سے گزرنے کی اس مہمان کو یعنی تمہیں ہر قسم کی سہولت ہم پہنچانا ان لوگوں کے فرائض میں شامل تھا۔ میں نے فوری طور پر ان لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی کہ ہمارے ساتھ تم سفر کر رہی ہو۔ تمام راستے میں اور لالہ خاموش ان گارڈز کے ساتھ چلتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی کانڈ پوسٹ پر پہنچ گئے جو ایک گہرے غار میں بنی ہوئی ہے۔ اس پوسٹ کا کانڈر اندر آرام دہ قالین کے بستر پر سویا ہوا تھا چنانچہ ہمیں زبردست پرے میں باہر بٹھا دیا گیا۔ ہم سے کوئی شخص بات نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی ہماری بات سننے کے لیے تیار تھا۔ میں جب بھی ان حفاظتوں سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا کہ کانڈر سے کہنا وہی تمہاری بات سنے گا اور یہ صدمہ کرے گا۔ میں خاموش ہو کر انتظار کرنے لگا اور لالہ نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ محافظ بالکل وحشی ہیں ان سے کوئی بات کرنا بظہروں سے سر پھوڑا ہے۔

چار گھنٹے بعد کہیں جا کر کانڈر صاحب برآمد ہوئے ہم دونوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہنے قریبی چشے پر غسل کرنے چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنی عدالت لگائی۔ میں نے کانڈر کو بتایا کہ میں خیال خاں کا مہمان ہوں اور اس نے اپنے کسی کام

سے مجھے طلب کیا ہے۔ میرے بیان کی روشنی میں اس نے مجھ سے بے شمار سوال کیے۔ میں خیال خاں کو کیسے جانتا ہوں؟ اس کا پیغام میرے پاس کس طرح پہنچا؟ میں کیا کام کرتا ہوں؟ جس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں اس کا مالک کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تمام عرصے میں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ میں خود بھی ڈر رہا تھا کہ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ گاڑی میں ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی بھی سفر کر رہی ہے تو نا معلوم ان کا رد عمل کیا ہو۔ لیکن میرے جوابات سے کانڈر مسکاتے نہیں ہوا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ میری گاڑی سے نشانہ ڈالا گیا ہے ڈھونڈ کر لائیں۔ اس موقع پر میں نے کانڈر سے کہا کہ وہ اصل گاڑی میں خیال خاں کی ایک مہمان اور بھی ہے اور پھر میں نے تمہارا ذکر کیا۔ تمہارا ذکر سن کر کانڈر ایک دم کھڑا ہو گیا اور مجھے گالی دے کر کہنے لگا۔ میں نے پہلے اسے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ اور پھر ان لوگوں سے مخاطب ہوا جو مجھے لے کر آتے تھے کہ آخر تمہیں وہ گاڑی میں کیوں چھوڑ کر آتے۔ کانڈر کی جواب طلبی پر ان لوگوں نے مجھے تھوٹا قرار دیا اور کہنے لگے کہ گاڑی میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ بات کی تصدیق کے لیے کانڈر اپنے آدمیوں کے ساتھ ہماری گاڑی تک آیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ تم گاڑی میں بیٹھی مل جاؤ گی تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

جب تم لوگ گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے تو میں قریب ہی ایک جگہ چھپی ہوئی تھی۔ تم لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور جب تم لوگ واپس چلے گئے تو میں نے خطرہ محسوس کیا اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں آس پاس کسی آبادی کی تلاش میں تھی کہ بہت دور مجھے اس جگہ سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور میں گرتی پڑتی یہاں پہنچ گئی۔ میں نے بخاور کی بات کاٹ کر کہا۔ بخاور نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ تم وہاں نہیں ملیں تو کانڈر شمش و پینچ میں پڑ گیا۔ دراصل کسی مشتبہ شخص کو ان جگہوں پر گھومتے ہوئے اگر پکڑ لیا جائے اور کانڈر کو یقین ہو جائے کہ وہ شخص پاکستان یا افغان حکومت کا کوئی جاسوس ہے جو فیکٹری کے عمل وقوع وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی فکر میں ہے تو اسے گولی مار کر ہزاروں فٹ گہرے کھنڈ میں پھینک لیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر اسے خیال خاں

کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے جو خود اس کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔ اکثر معصوم مسافر بھی ان راستوں سے گزرتے ہیں، جنہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی خطرناک راستے پر سفر کرتے ہوئے آ نکلے ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے تو سب ہی اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ لوگ کبھی باؤھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔ یہ تمام پہاڑی علاقہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد ہے جو کسی کی بھی ملکیت نہیں۔ یہاں رہنے والے قابل ہر قانون سے بالا آزاد فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے اپنے قوانین اور رسم و رواج ہیں اور ان میں جو قبیلہ زیادہ طاقتور ہو جس کے پاس اسلحہ کی تعداد زیادہ ہو وہی اس سرحدی علاقے کا اہل حکمراں ہوتا ہے۔ بہر حال میری یہ بات سن کر کہ میرے ساتھ ایک یورپین لڑکی بھی سفر کر رہی تھی جو گاڑی کے اندر سلی جھٹے میں چھپی ہوئی تھی اور اب ڈر کر کہیں غائب ہو گئی ہے، کمانڈرنے از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے مجھے اور سلاز کو خیال خاں کے پاس بلانہ کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ہم دونوں یہاں دن چھینے سے کئی گھنٹے پہلے پہنچ چکے ہیں۔ ہماری گاڑی ابھی تک کمانڈر کے قبضے میں ہے۔ اب یہاں یہ مسئلہ پیش تھا کہ واقعی ہمارے ساتھ تم بھی تھیں یا نہیں۔ خیال خاں نے مجھ سے کئی بار سوال کیا تھا کہ اس جا پانی کے بچے نے کہیں تھیں غائب تو نہیں کر دیلے اور مجھے سکھا پر ٹھاکر بھیج دیلے۔ اس کے علاوہ نامعلوم کیا کیا شکوک ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر آج رات تم یہاں نہ پہنچتیں تو ہم دونوں کا حشر بہت خراب ہوتا۔

جدا بہر بتاؤ۔ مجھے حالات بتاؤ۔ ہا خیال خاں خاموش بیٹھا مسکرا رہا۔ انگریزی جانتا تھا۔ کابل میں میری اس سے ملاقات سن ہو چکی تھی اور ہم دونوں کے مابین بڑی خوش آسنوبی سے سارا معاملہ انجام تک پہنچا تھا۔ لہذا اس کے دل میں میری بڑی قدر تھی۔ پھر اسے یہ کبھی خیال تھا کہ میرے مکان کو بھی مجھ پر کئی اعتماد ہے۔ اسی وجہ سے وہ اتنی بڑی رقم کو ہاتھ پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

مخبر کی دیر بعد پشٹانوں کی مخصوص روایات کے مطابق فرس پر دستہ خوان بچھا دیا گیا اور دو بھنی ہوئی سالم بھیڑیں جن میں چاول بھرے ہوئے تھے لاکر دستہ خوان پر رکھ دی گئیں۔ کمرے میں موجود تمام افراد ہاتھ دھو کر دستہ خوان کے گرد بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پلیٹیں رکھی گئیں جن میں انہوں نے چاول اور گوشت اپنے اپنے لیے نکال لیے

اور بے تکلفی سے ہاتھوں سے کھانے لگے۔ میرے لیے عجیبی کانسٹے کا کوئی اہتمام ممکن نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی کسی طرح ان لوگوں کی اقلیدگی اور اپنا پیٹ بھرا کھانے کے مدائن تقریباً خاموشی رہی۔ کبھی کبھار خیال خاں پشتوں میں اپنے کسی ساتھی سے کہہ کتا اور نکلیں سے بچے بھی دیتا جا تا۔ بخا در خاں سر جھکاتے کھانے میں مصروف تھا اور لالہ بھی ایک کونے میں اپنی پلیٹ ہاتھوں میں اونچی اٹھاتے کھانے میں مشغول تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر بلا کا اطمینان تھا۔ جو موت کے مزے میں جانے سے بچ جانے کے نتیجے میں قدرتی طور پر ظاہر ہو رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر سیاہ تو سے کا دودھ چلا پھر پشٹانوں نے تہا کو نوشی کا سلسلہ شروع کیا تو پورا کر دھوی سے بھر گیا اور مجھے اپنی سانس گھٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ خیال خاں کو میری تکلیف کا احساس ہو گیا اس نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ مجھے کسی گھر میں لے جاتے جہاں خواتین موجود ہوں۔ میں دن بھر کی تھکن اور پریشانی سے چوڑھو رہی تھی اور کھانے کے بعد واقعی میری دل خواہش تھی کہ اب میں پاؤں پھیلا کر سو جاؤں۔

مجھے ایک قریبی مکان میں پہنچا دیا گیا جہاں تین عورتیں موجود تھیں۔ یہ بھی بالکل ویسی ہی تھیں جیسی میں نے اس سے پہلے دیکھی تھیں۔ ان میں ایک عورت موٹر تھی جو غالباً گھر کی مالک تھی۔ بقیہ دو میں سے ایک شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی جبکہ تیسری بمشکل سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ بہت چھپل اور خوبصورت تھی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے میرا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ میرے لباس میرے برس، میرے بالوں اور بالوں تل لگی ہوئی پنوں کو بار بار غور سے دیکھا اور اپنی زبان میں مجھ سے کچھ کہنے لگی، جسے میں بالکل نہ سمجھ سکی۔ میں نے مسکرا مسکرا کر اشاروں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ موصوم بہرہ کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھتی رہی۔

اس لڑکی نے میرے آرام کا بڑا خیال رکھا۔ وہ خود بھی میرے برابر دوسرے چنگ پر سوتی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ سونے سے قبل وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن زبان کا مسئلہ ہم دونوں کے درمیان لیوار بن گیا تھا۔ میں جس کمرے میں ٹھک بسری کے لیے لائی تھی وہاں ایک کونے میں میں نے دو بچھا کہ سفید سیلین کی تھیلا رکھی تھیں جن میں سیال خشک بھر کر میں

بے جا ہنسی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر میں کوئی ایسا شخص رہتا ہے جس کا تعلق خیال خاں کی فیکٹری سے نہ ہو۔  
میرے منہ نے میں نے اسے کوشش کی کہ مجھے کوئی ایسی آواز سنائی دے جس سے میں فیکٹری کی سمت کا اندازہ لگا سکرں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔

میں صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئی اور ان تین عورتوں کے ساتھ دھواں کھن اور اٹھول سے ناشتہ کیا۔ انہوں نے بطور خاص میرے لیے قہوہ بھی تیار کیا۔ وہ خود صبح کے وقت قہوہ یا چائے پینے کی عادی نہیں تھیں، لیکن انہیں معلوم تھا کہ ہم یورپین لوگ ناشتے میں چائے یا کافی ضرور پیتے ہیں۔ بڑی بڑی جو کے آٹے کی روٹیاں بھی میرے سامنے رکھی گئیں لیکن میں انہیں نہ کھا سکی۔ ان عورتوں نے البتہ بڑے اطمینان سے وہ روٹیاں کھائیں اور بار بار مجھے بھی اکساتی رہیں۔ ناشتے سے فراغت پاتے ہی میں نے اشارے سے باہر...

جانے کے لیے کہا۔ معرورت میرا مطلب سمجھ گئی لیکن اس نے مجھے باہر چلنے سے روک لیا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ وہ لوگ خود مجھے بلا کر لے جائیں گے۔ میں چونکہ بالکل تیار ہو چکی تھی امداد باہر نکل کر خیال خاں سے معاملے کی بات کر کے جلد از جلد اس جگہ سے واپس ہو جانے کی متمنی تھی۔ اس لیے یہ تھوڑا سا انتظار بھی مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ میں گھر کے کچے صحن میں بیٹھتی رہی۔ پھر آگیا کہ چار بانی پر بیٹھ گئی مجھے اپنے چاروں طرف کوئی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جو میری دلچسپی کا باعث ہو سکتی اور میرا وقت گزر سکتا۔ وہ بھولی بھالی نوجوان لڑکی ٹھنکی ہانڈھے مجھے دیکھے جا رہی تھی مگر میں اس سے بھی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ زبان کا مسئلہ اڑے آتا تھا۔

خلیفہ کے دس بچے کے قریب مجھے مکان کے دروازے پر کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونکہ کھڑی ہو گئی۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں معرورت دروازے پر گئی اور پشتوں میں کچھ پوچھا پھر پلٹ کر مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے خالص مشرقی انداز میں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر ان لوگوں کو سلام کیا۔ جواب میں معرورت نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا جبکہ بقید و فیل نے اپنی زبان میں نامعلوم الفاظ کہے اور میں گھر سے باہر آ گئی۔

ابراہیم جیب کھڑی تھی جس میں بختاورد کے ساتھ دو

افراد اور بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا لیکن وہ لاالہ نہیں تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر بختاورد خاں مجھے اتر آیا اور مجھے مقبلی دروازے سے جیب کے پھیلے حصے میں بیٹھنے کو کہا اور میرے بیٹھتے ہی جیب اسٹارٹ ہو گئی۔ بختاورد نے مجھ سے پوچھا۔ "مس ٹر! رات کیسی گزری؟"

• بہت آرام سے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ خصوصاً آپ کی خواتین بہت سیدھی سادی اور غلصہ ہیں۔ میری آسائش اور آرام کے لیے ان لوگوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ میں ان کے لیے کیا

کرتی ہوں۔ میں ان کی محبت کا جواب آخر کس طرح دے سکتی ہوں۔ بختاورد نے قہوہ لگایا اور کہنے لگا۔ "ہم پھانوں کی کچھ رعایات ہیں جن کی ہم سب سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

ہر پٹھان گھرانہ اس بیابان میں کسی اجنبی کو مہمان بنا کر بہت خوش ہوتا ہے۔ مہمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ایشیا کرنا ہم لوگوں کی روایت ہے جس کا اگر معاوضہ دینے کی کوشش کی جائے تو ہم لوگ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ لہذا اس طرز آئندہ یہ خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا۔ ایک پٹھان کی میزبانی کا معاوضہ صرف یہی ہوتا ہے کہ اس کی تواضع کو قبول کر لیا جائے۔"

• بہر حال میں تم سب کی شکر گزار ہوں۔ میں نے بڑے خلوص سے کہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بختاورد سے سوال کیا: "اب کیا پروگرام ہے؟"

• اب ہم لوگ خیال خاں کے گاؤں چل رہے ہیں۔ "تو گویا یہ گاؤں خیال خاں کا نہیں تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

• نہیں۔ یہ خیال خاں کے حجاز کا علاقہ ہے جو یہاں کے قبائل کا سردار ہے۔ خیال خاں کا گاؤں یہاں سے چار میل فاصلہ ہے۔ اس کے گاؤں سے افغان سرحد صحت چند سو گز کے فاصلے پر ہے۔ دراصل اس کا گائل ایسے مقام پر واقع ہے جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد ہے اور کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ اس گاؤں میں خیال خاں کی وہ فیکٹری ہے جس کے بارے میں خود پاکستان اور افغانستان کے لوگ کچھ زیادہ نہیں جانتے لیکن یورپ اور امریکہ میں کچھ لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جاپانی جسے تم اچھی طرح جانتی ہو اس فیکٹری کی مشینیں اسمبل کر کے لایا تھا۔ اسی نے خیال خاں کو رضامند کر کے فیکٹری کی تخریب

کی اور علاقے میں افراط سے پیدا ہونے والی حشیش کو تیل کی شکل میں بدلتے اور چرس سے ہیروئن بنا کر اسے غیر جانک اسمگل کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ وہ نہ امد سے قبل خیال خاں حشیش اور چرس کی اسمگلنگ کا کام کرتا تھا۔ ان میں بھی اسے خاصا منافع ہوتا تھا لیکن اب فیکٹری لگانے کے بعد تو اس کا منافع کئی سو گنا بڑھ چکا ہے۔ اس علاقے میں رہنے والے قبائلی جو پہلے حشیش کی کاشت کر کے بمشکل دودقت کی روٹی کما سکتے تھے۔ اب ان کی حالت بھی بدل گئی ہے۔ خیال خاں اپنے لوگوں سے بہت معقول قیمت پر حشیش خریدتا ہے جس سے وہ لوگ خیال خاں سے بہت خوش ہیں اور اس کے لیے ہر قسم کا کام کر گزرنے پر تیار رہتے ہیں۔ ان بار جب تم جاؤ گی تو ہم تمہیں ہیروئن کے بھی کچھ نمونے دیں گے۔ بخاندرا سے بھر مجھے خیال خاں کے بارے میں بتانا اور مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اگر میں اسی طرح ان کی وفادار رہوں اور پوری دقت داری کے ساتھ لڑھکھندا کرتی رہوں تو بہت جلد لکھنؤ بن جاؤں گی۔ بخاندرا نے مجھے رائے دی کہ میں کراچی یا کابل میں ایک شاندار ہوٹل تعمیر کرواؤں اور ہالینڈ سے نقل وطن کر کے اس علاقے میں مستقل آباد ہو جاؤں۔ خیال خاں امد نہ خود میری ہر طرح کی کڑائی سے۔ بقول بخاندرا کچھ عرصے بعد میری افادیت ختم ہو جائے گی کیونکہ بار بار کے سفر سے متعلقہ ملکوں کے حکام میری طرف سے مشتبہ ہو جائیں گے اور کسی نہ کسی پھیرے میں میسر کی گرفتاری عمل میں آسکتی ہے۔

اپنی گرفتاری کے متوقع خطرے سے میں لڑ کر رہ گئی۔ اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ خدا یا اس بار مجھے خیریت سے وطن واپس پہنچائے آئندہ میں کسی قیمت پر بھی اس کام میں نہیں پڑوں گی۔ بولہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں ایئر سٹوڈم چھوڑ کر ڈنمارک چلی جاؤں گی۔ سو ٹریڈ لینڈ جا بسوں گی لیکن اب فشیات کی اسمگلنگ نہیں کروں گی۔ میں نے صدق دل سے توبہ کی اور سوچا کہ خدا بھی میری جیوری دیکھ رہا ہے کہ کس طرح ان چالاک لوگوں نے مجھے اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث کر دیا ہے اور اب میں درچاہتے ہوتے بھی ان کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہوں۔

دشوار گزار راستے طے کرتی ہوئی جیب خیال خاں کے گاؤں تقریباً بارہ بجے پہنچ گئی۔ یہ سستی بمشکل پچاس گھروں پر مشتمل تھی جن کے درمیان سردار کا حجر تھا بالکل ویسا ہی جیسا میں اب تک دیکھتی آئی تھی۔ حجرے میں

کئی لوگ ابھرا ہوا بیٹھے تبا کو نوشی میں مصروف تھے ہماری جیب کے وہاں پہنچتے ہی ان میں سے ایک شخص آگے آیا اور بخاندرا سے پشتوں میں بات کرنے لگا۔ بخاندرا اس کے سامنے بیٹھے اتر آئے جبکہ میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ بخاندرا حجرے کے اندر چلا گیا۔ اس کا سامنے باہر ہی کھڑا دوسرے لوگوں سے گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔ جیب میں ڈرائیور پستور اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا امد میں بیٹھی تھکتے میں خاموش بیٹھی اس فکر میں تھی کہ کسی طرح یہاں سے جلد از جلد فارغ ہو کر ہندوستان میں لوٹ جاؤں، کم از کم کراچی ہی پہنچ جاؤں جہاں مجھے انٹالوں کے درمیان رہنے کا احساس ہوگا۔ وہاں کسی سے کوئی بات چیت تو کرنے کے قابل ہوں گی۔ اس پہاڑی علاقے میں تو اب مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ بخاندرا کو حجرے کے اندر گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ جیب میں بیٹھے بیٹھے مجھے سخت آکاہٹ ہونے لگی اور میں وقتی مدوارہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ڈرائیور نے مجھے اترتے دیکھا تو خود بھی نیچے آگیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ میری نگرانی چھین ہو، اور مجھے اپنی نظروں سے یک لمحے کے لیے بھی او مجھل نہ ہونے دینا چاہتا ہو۔

کم و بیش ایک ہفتے بعد میں نے جلد سے وہ... لینڈ روڈ آئی دیکھی جس میں گزشتہ دن میں نے بخاندرا اور اس کے ساتھ سفر کیا تھا جب وہ ہماری جیب کے برابر آ کر ایک جھٹکے سے رکی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ خیال خاں کے ساتھ وہ جا پانی بھی اس میں موجود تھا جو پہلے مجھے کابل میں اور پھر کراچی میں ملا تھا۔ میں ان کے بارے میں سوچنے لگی کہ وہ کوئی چھلا وہ ہے جو جب امد جہاں جا رہا ہے پہنچ جاتا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے "ہیلو" کہا۔ قریب آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری خیریت پوچھی۔ اس نے میرے چہرے پر تڑپا اور پریشانی کی جھلک صاف محسوس کر لی اور مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے جس کو تم یہاں بہترین دوستوں کے درمیان بالکل محفوظ ہوئے"

میں نے اذیت میں سر ہلا کر یوں اظہار کیا جیسے مجھے اس کی بات پر یقین ہوا کہ ایمان کی بات ہے کہ اب تک میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک بہت اچھا رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ لوگ جاہل تھے اور مذہب دنیا کے طور طریق سے واقف نہیں تھے۔ اب تک میرے ساتھ

کوئی فیصلہ نہ حرکت نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس انہوں نے میرے آرام اور تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ جاہل کہیں لیکن ہوا انہوں نے مجھے اپنی خدمتوں کے درمیان رات گزارنے کا موقع فراہم کیا اور دن میں بھی کسی شخص نے مجھ سے بلا ضرورت بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

خیال خاں کی آمد کے ساتھ ہی بختاورد بھی جبر سے باہر نکل آیا۔ پھر جاہلیوں کے ساتھ ان دنوں نے سرگوشیوں میں بائیس گزنا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر تک مشورہ کرنے کے بعد خیال خاں میری طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت میں جیب کے قریب لائق سی ایگنی کٹری تھی۔ اس نے میری طرف آتے ہوئے اگرنی ہی میں کہا۔

”مسٹر! ایک منٹ، ہم تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔“

میں اس کی طرف بڑھ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے دس پونڈ سیال کی قیمت وصول ہو گئی ہے۔ یہ مال میں تمہیں فوری طور پر دے سکتا ہوں لیکن اگر وہ مال ہوں کہ تم کچھ زیادہ مال لے جاؤ۔ اس لیے کہ یہ یہ بھی ہے کہ آئندہ تمہارا یہاں آنا حفاظت کے خیال سے ممکن نہ ہو۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے علاوہ میں تمہیں کچھ سیال کا پونڈ بھی بطور ہونڈ دینا چاہتا ہوں۔ یہ تمہارے مکان کو بہت پسند آئے گا۔“

”مشرخاں! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں دس کے بجائے دس پونڈ بھی لے جا سکتی ہوں لیکن سوال نامہ رقم کی کوئی کمی کا ہے۔ تم جانتے ہو انائیگی کے لیے میرے پرنسپلز نے کیا طریقہ اختیار کیا ہو ہے۔ میں اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”اے مسٹر! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ زائد مال کی رقم تم ادا کرو، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ مال اس پھیرے میں لے جاؤ۔ رقم کی وصولی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں یہ میرا دوسرا سر ہے۔ میں خود وصول کروں گا۔“

”ٹھیک ہے تم جس قدر مال مجھے دو گے میں لے جاؤں گی، لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا پونڈ خیال خاں نے نشوونما سے پوچھا۔ یہ کہ مجھے جلد سے جلد فارغ کر دو۔ میں یہاں بہت

گھبراہٹ محسوس کر رہی ہوں۔“

”میں تمہیں آج ہی واپس روانہ کر دوں گا بلکہ تم یقین رکھو چند گھنٹوں بعد تم کابل میں ہو گی۔“

کابل میں، وہ کیوں پڑا۔ کراچی جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہیں کسٹم کا عملہ بہت چوکس ہے۔ تم کراچی سے اس علاقے کے لیے روانہ ہوتی ہو۔ یقین کرو کراچی میں اس بات کو بطور خاص نوٹ کر لیا ہو گا۔ جب تم کراچی جاؤ گی تو حکام تمہیں گھیریں گے اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم یہاں سے کابل جاؤ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پھر سابقہ نوٹ سے ہالینڈ پہنچ جاؤ۔“

بلت میری سمجھ میں آگئی اور پھر یہی ہوا۔ مجھے خیال خاں نے ایک خوبصورت سوٹ کیس کی خفیہ تھوں میں پچیس پونڈ سیال حشیش اور بیرون اس طرح پیک کر دی کہ بظاہر کوئی شک پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

کابل پہنچ کر میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ حالانکہ میرے پاس کافی پیسے تھے میں انٹر کاسٹیٹیشن میں بھی قیام کر سکتی تھی لیکن خیال خاں نے اس خیال کی مخالفت کی اور مجھے ایک سات کے لیے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بٹھا دیا۔ میں خیال خاں کی بہت شکر گزار ہوں کہ وہ میرے ساتھ کابل تک خود آیا اور خود ہی اس نے اپنے نام پر ہوٹل کا کمرہ بک کرایا۔ وہ کابل میں بھی بڑے سوخ کا مالک تھا اور میں نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

لگنے دن خیال خاں مجھے موٹو سوٹ کیس کے ایئر پورٹ لے گیا اور کے ایل ایم کی فلائٹ سے بخیر خوبی مجھے اپنے وطن بھیج دیا۔ کابل سے روانہ ہو کر ایئر ڈوم تک پہنچنے کے بعد ان میں بڑی متفکر رہی۔ پہلے سفر میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور میرے جرم کی نوعیت کتنی سنگین ہے۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ میں اس علاقے میں پیدا ہونے والی کسی خاص بوٹی کا عرق لے کر جا رہی ہوں جسے جان بچانے والی دوا قتل کی تیاری میں استعمال کیا جائے گا لیکن اس بار کیفیت مختلف تھی۔ اب میں اچھی طرح جان چکی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں اور اگر کوئی گئی تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ ایک بات کا مجھے اطمینان تھا کہ ایئر ڈوم لبریری

پر مائیکل سب کچھ نبھال لے گا۔ وہ اتنا بار سوخ جتا کہ مقامی حکام کی نظروں سے میرا لایا ہوا سوٹ کس بچا کر نکال سکتا تھا۔ اور اس نے کیا بھی یہی۔ چند ہی منٹوں سے اتنی مائیکل مجھے بیڑھیوں پر ہی مل گیا۔ اس نے بڑی خوش دلی اندر خوشی سے میرا استقبال کیا خاموشی سے ہدایت کی کہ میں تنہا بغیر سامان لیے باہر چل جاؤں۔ اس نے سامان کا ٹیگ مجھ سے لے لیا تاکہ میرا لایا ہوا سوٹ کس حاصل کر سکے۔ اس طرح میری پریشانی اپنے وطن کی زمین پر قدم رکھتے ہی ختم ہو گئی۔ ایئر پورٹ کی کارڈائی سے فارغ ہو کر میں اپنا پرس جھلائی ہوئی باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں مائیکل کی منتظر تھی جو ابھی تک سوٹ کیس لے کر باہر نہیں نکلا تھا۔

کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب مائیکل نہیں آیا تو میں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا، گھر سے اسے فون کر کے معلوم کر لوں گی۔

میں گھر پہنچی تو وہاں جم بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی می اور ڈیڈی خوشی سے اچھل پڑے۔ ڈیڈی نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میرے خیریت سے واپس آ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ جم ٹپوٹتی ہوئی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے چہرے پر موجود تفکرات کی چھائیں صاف دیکھی جاسکتی تھی جسے اس نے غصوں کر لیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ میں جم کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ میرے پاس بہت رقم تھی اور مزید بہت بڑی رقم مجھے ملنے والی تھی لیکن اتنے یہ ہے کہ میں خود اپنی نظروں سے گریز کی تھی۔ یہ دولت جس کی خاطر میں نے اتنے پاپڑے لیے تھے میرے لیے سوہان لوح بن چکی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں امریکی ڈالروں سے بھرا ہوا پرس آتش دان میں پھینک دوں اور اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کر لوں۔ مگر آہ، اب یہ ممکن نہیں تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

تفتیشی افسر کا نوٹ :-

مذموم نے اپنے بیان کا مذکورہ بالا حصہ دہراتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں ریکارڈ کرایا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ دل سے اس کام کو اچھا نہیں

سمجھتی تھی لیکن اپنی مادگی اور مصلحت کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھی کہ چوسس کی امکانگ کرنے والے شاطر گروہ کی آلہ کار بنی رہے۔ مجھے اس لڑکی سے بہتر مدی سب سے لیکن مجھے اپنی سر زمین پر نافذ قانون کا تحفظ بھی کرنا ہے۔ قانون کے مطابق میں ملزمہ کا بیان خود اس کے الفاظ میں قلمبند کرنے کا پابند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوتی بعض غیر متعلق تفصیلات بھی اس دستاویز میں شامل ہو گئی ہیں۔ میری صفاست ہے کہ ایڈیشن آف جیس ملزمہ کی کم عمری، نا تجربے کا اس ادا اس کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر اس کے بیان کے ان حصوں کو نظر انداز کرنے جو براہ راست مقدمے سے متعلق نہیں ہیں اور صرف ملزمہ کی جذباتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ (انپٹر)

تھوڑی دیر بعد میں لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر آئی تو جم بستر پر افسوس نظر تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے غم و فکر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ داناڈے میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ڈیڈی اپنے کمرے میں تھے اور می کچن میں مصروف تھیں۔ میں خاموشی سے جم کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”سفر کیسا گزرا جین پٹ جم نے پوچھا۔“

”مجھ کو قیامت سے گزر کر آئی ہوں۔“

”واقعی؟ کیا تم مشرق سے بالکل غلطو ظاہر ہوئی؟“

”مغضوظ ہونے کا کیا سوال ہے صرف جانتا ہوں کہ“

کی گھنگار ہوں۔ پاکستان میں البتہ مجھے چند دن فرصت کے مل گئے تھے جنہیں گزارنے کی خاطر میں نے کراچی کے گل کویں کی آڈرہ گدی کی۔ وہاں کے عزیزوں کی زندگی کی ایک جھلک میں نے قریب سے دیکھی۔ ایک شریف عیسوی ڈاکیٹر مجھے یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالرشپ پر ان بستیوں میں لے گیا جہاں کراچی کے مزدور ہمیشہ ادا کرتے تھے۔ وہاں لوگ رہتے تھے۔ وہاں مجھے ایک نوجوان ملا جو غریب تھا لیکن نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ وہ اپنے معاشرے سے ناالا تھا۔ اسے ملازمت نہیں مل رہی تھی، حالانکہ وہ



اس ملک کے حوالے کے مطابق اعلیٰ قسیم بلوچستان کی ریویٹ  
تقاضیوں کی چیز بات یہ ہے کہ خدمت نہ ملنے کی وجہ سے تھی  
کہ وہ ایک معمولی گھر کے گھر و تھا۔ اس کے خاندان میں کوئی  
بلا شخص نہیں تھا۔ ہی بالیا کوئی دوست تھا جو خاندان کو کے  
اسے اس کی صلوات کے مطابق خدمت دلا سکتا ایک لمحے  
کے لیے تو میرے دل میں آیا کہ میں اسے بالینڈ آئے کی پیش  
کردوں۔ پھر سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اگر واقعی وہ کسی نہ  
کسی طرح یہاں آ گیا تو اسے یہ چل جائے گا کہ میں وہاں کیوں  
گئی تھی۔ میرے اسکاں پر سونے کا جھوٹ بھی کھل جائے گا  
میں نہیں چاہتی تھی کہ اس نے جس کیفیت میں میری اتنی عزت  
کی اس کا بھرم کھل جائے۔

تم کابل بھی تو گئی تھیں۔ وہ کسی جگہ ہے؟  
کابل میں دو بار گئی۔ اب بھی یہی کابل ہی سے  
آ رہی ہوں لیکن میں نے کابل کو اتنی تفصیل سے نہیں دیکھا  
جتنا کراچی کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بظاہر کابل میں کوئی  
خاص دلچسپی کی بات مجھے نظر نہیں آتی۔ بہت گھارے گھارے  
ہے ان کے مقابلے میں پاکستان کے جتنے شہر بھی میں نے دیکھے  
وہ زیادہ بارونق تھے البتہ وہ پھاڑی علاقے جہاں پٹھان  
قبائل رہتے ہیں مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ  
بھی ہو سکتی ہے کہ ان علاقوں میں سفر کے دوران میں مسلسل  
خونخوردہ رہی اس لیے وہاں کے قدرتی مناظر میں غور سے دیکھ  
ہی نہ سکی۔

تم خونخوردہ کہیں رہیں؟  
یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جمہور ایک نوجوان ملکی  
وحشی قسم کے قبائلی لوگوں میں تنہا سفر کر رہی ہو تو قدرتی طور پر  
اسے ہر لمحے اپنے تحفظ کی فکر سائی رہے گی۔ یہی حال میرا تھا۔  
ہر جگہ کہ میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک بہت خالصتہ تھا۔  
جہاں کہیں بھی بات گزارنے کا موقع آتا انہوں نے اپنی عورتوں  
کے درمیان مجھے شب بستی کا موقع دیا۔ دن میں البتہ مردوں  
کے ساتھ سفر یا بات چیت میں وقت گزارنا یا ایک میں نے  
انہیں مہمان نواز خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں بہت حساس  
پایا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ میری طرف غیر رسمی نظر سے دیکھ  
سکے۔ ویسے بھی میں جتنے عرصے ان لوگوں میں رہی میں نے کسی  
عورت کے ساتھ کسی مرد کی زیادتی کا کوئی واقعہ نہیں سنا۔ وہ  
لوگ ہر وقت رائفلوں سے مسلح رہتے ہیں۔ اندازاً اسی بات  
پر آپس میں خون خرابے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے تو یہ  
لوگ مشرقی یورپ اور ہنگری کے آس پاس پہاڑوں میں

رہنے والے قبائلیوں سے بہت ملے جلے نظر آتے یہ لوگ  
بھی قبیلہ ہاگر خاندان پر وحشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چاکھوں  
پر آپس میں لڑتے رہتے رہتے ہیں۔ بس یہی کیفیت ان  
پٹھان قبائل کا ہے۔

جمہور نے مسکراتے ہوئے کہا: خونخوردہ سے عرصے میں  
تمہاری اسٹڈی قابل تعریف ہے۔  
مشکرے جمہور! مجھے اگر خونخوردہ بھی بلوچان نصیب  
ہوتا تو میں اتنی بان بولوں کی نصیحت اور ان کی معاشرتی  
زندگی کا اچھی طرح جائزہ لیتی اور پھر ایک قبیلہ خونخوردہ

اب بھی تم اپنے سفر کے تاثرات سلسلے دار کسی اخبار  
کے لیے لکھ سکتی ہو۔ بہت اچھا معاوضہ مل جائے گا۔  
مگر میں بتاؤں گی کیا کہ میں نے یہ دو سفر اور وہ  
بھی اتنے کم وقت میں آخر کیوں کیے تھے؟ مجھے کسی یونیورسٹی  
نے معاوضاتی مشن پر بھی نہیں بھیجا تھا اور کوئی اس بات پر  
کیسے یقین کرے گا کہ ایک معمولی سی ٹیچر اپنے خرچ پر دوبارہ  
پاکستان اور افغانستان کا سفر کرے گی ہے اور دونوں ہی بارہ  
صرف چند دن ہی وہاں رہے۔

بالکل ٹھیک تمہارے پاس اس بات کا کوئی جواب  
نہیں ہے۔ میں بھی اگر مقامی حکام نہیں طلب کر کے اب بھی  
یہ سوال کریں تو تم کیا کہو گی؟  
میں خود پریشان ہوں، اگر ایسا کوئی وقت آ گیا تو  
میں کیا کہوں گی؟

جمہور بھی گری سوچ میں ڈوب گیا اور میں بھی فکر مند  
ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ میرے پاس سمیٹ پر میری آمد و رفت کے  
اندراجات موجود تھے۔ ایئر پورٹ پر میری روانگی اور واپسی  
کی تاریخیں ریکارڈ پر تھیں۔ میں واقعی بہت بڑی محبت  
میں گرفتار ہو سکتی تھی میں نے اس بارے میں مائیکل سے بات  
کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا طریقہ بتا  
دے گا جس سے میں حکام کو مطمئن کر سکوں۔

مجھے گری سوچ میں مبتلا دیکھ کر جمہور نے تسلی دی۔ تم  
تو ابھی سے اتنی پریشان ہو رہی ہو جیسے دروازے پر تڑپتے  
داخلہ کا کوئی انٹرکٹر اہو۔ یہ تو ایک غرو منہ ہے جس پر  
ہمیں پہلے سے غور کر لینا چاہیے اور یہ صورت حال بھی صرف  
اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کوئی تمہارا دشمن تمہارے  
بارے میں حکومت کو کوئی اطلاع پہنچائے۔ یوں رہے یہ  
مندانہ سیکورٹی لوگ آتے جاتے ہیں کوئی یہ پوچھتا نہیں







پسندہ پوزیشن میں تھا اور باہر کی طرف چل دی۔ ابھی میں لائن سے گیٹ کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ ایک باہری کسٹم آفرس نے مجھے روک کر پوچھا۔ اس پھیلے میں کیا ہے؟ میں گھر آگئی اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ اس میں سیٹیل سٹیشن ہے جو ابھی ابھی پشاور سے آنے

لگے دن میں وہیں پہنچاؤ سے ہوئی آئی اسے کی فلائٹ آئے گی، اس سے جو مال لے کر آئی ہے وہاں پہنچاؤ ہے۔ ایئر لائن پر اس سے مال وصول کرنے کا حکم دیا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ میں نے فوراً لفٹ کے لیے پوسٹ فون پر کال کی مناسب الفاظ میں پھر اس سے مطلع کر دیا تاکہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر مال کی برآمدگی اور گرفتاری کا بندوبست کرے۔

میں پھر اس کے مطابق وہ سوتے دن صبح دس بجے کراچی ایئر پورٹ پر پہنچ گئی جہاں مجھے معلوم ہوا کہ فلائٹ آدھے گھنٹے لیٹ ہے۔ میں ڈریسنگ لائن میں انتظار کرنے لگی۔ میں ابھی اس کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ مجھے شریف نظر آ گیا۔ وہ ایئر پورٹ کے سیرونی برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ مجھے دیکھ لے لیکن وہ ہونے کی وجہ سے ایسا لیکن نہ ہوا۔ شریف برآمدے میں تنہا کھڑا تھا اور کسی کا منظر تھا۔ ہوسکتا ہے وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ بہر حال سڑھے دس بجے فلائٹ آئی اور طے شدہ منصوبے کے مطابق جتا اور ایک بیگ اٹھائے مجھے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں کھڑی ہو گئی اور سوچا کہ اس کا استقبال کیا۔ جتا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”سرخ! آپ کیوں گھر آگئیں۔ کیا گزشتہ بار ہماری بہانہ نوازی آپ کو پسند نہیں آتی؟“

یہ بات نہیں ہے شریف جتا! میں بہت تھک چکی تھی اور اتنا دشوار سفر کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اپنی امانت سنبھالو یہ کہہ کر میں نے رقم کا تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا اور اس کے ہاتھ سے مال کا تھیلا لے لیا۔ ہم دونوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے پھیلے تبدیل کیے تھے۔ دوسرے دیکھنے والوں نے شبہ بھی نہیں کیا ہوگا کہ کیا ہو گیا۔

میں نے مال کا تھیلا لے کر نیچے فرش پر رکھ دیا۔ جتا نے پھیلے تبدیل کرتے ہی تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ میں اسے روک بھی نہیں سکی۔ اب مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے لنگر دھڑائی تو برآمدے سے شریف بھی غائب تھا وہ شاید انتظار سے اس کو واپس جا چکا تھا۔ میں منتظر تھی کہ ابھی پوئیس آئے گا۔ اس مال قبضے میں لے کر جتا کو پکڑ لے گی لیکن میری بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ میں نے بے دلی سے تھیلا اٹھایا جس میں بلاشبہ

## علم الاعداد

علم دست شناسی، علم تحریر، علم تیار، علم نجوم، علم گنہار شناسی۔ جادو میں نہ چھو منتر، اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو دماغ نام کا کمپیوٹر عطا کیا ہے اس کمپیوٹر میں سوچنے، گننے اور عسوس کرنے کی صلاحیتیں بھری ہیں۔ ضرورت ہے کسی علم کی طرف توجہ دی جائے۔ صرف توجہ دینے ہی سے ہر گتھی کو دو اور دو چار کی طرح سلجھایا جاسکتا ہے۔ سیکڑوں ماہرین نے ہزاروں سال تجربات کئے اور پھر ایسے صدیقی نے سب کے تجربات کو موجودہ صدی میں ”دنیا کے چھ پراسرار علوم“ کے نام سے یک جا کر دیا ہے۔

دہلا پتلا نوجوان اپنے تین حریفوں کی حکم ایک پٹائی کر رہا تھا۔ وہ تینوں اچھی صحت کے مالک تھے۔ مگر انھیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا، بالآخر وہ تینوں میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ معلوم کرنے پر نوجوان نے بتایا کہ میں بینک سے کچھ رقم لے کر نکلا تھا یہ تینوں مرے پیچھے تھے۔ یہاں موقع دیکھ کر مجھ پر ہاتھ ڈال بیٹھے۔ شاید انہیں نہیں معلوم تھا کہ میں جوڑو اور کراٹے میں مہارت رکھتا ہوں۔ نوجوان نے سب کو مشورہ دیا کہ آپ بھی غنڈوں سے محفوظ رہنے کے لیے ”آسان کراٹے“ اور ”فن جوڈو“ نامی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ یہ کتابیں ”کتاب والا“ ۲۰۹۴ پہلا ہی جوبلدہلی سے منگالی جاسکتی ہیں۔ میں بھی ان کتابوں سے مدد حاصل کر کے اس مقام تک پہنچا ہوں۔

والی فلائٹ سے ایک شخص بھی اس کے ذریعے بم تک پہنچی ہے۔ میں نے کسٹمز افسر کو یہ بتانے کی کوشش بھی کی کہ میں نے خود پولیس چھاپے کا انتظام کیا تھا لیکن اس نے میری بات پر کان نہیں دھرنے۔ پشاور فلائٹ کی پینجر لسٹ چیک کی گئی لیکن اس میں بختاورد نام کا کوئی مسافر نہیں تھا۔

ایئر پورٹ پر کسٹم حکام نے مجھے حراست میں لے لیا اور پھر تفتیش کے لیے آپ کے سپرد کر دیا۔ یہ ہے میری کہانی۔

### تفتیشی افسر کا نوٹ۔

مذموم کی نشاندہی پر محمد شریف نامی نوجوان کی تلاش کی گئی۔ اس امر کی رہنمائی میں پولیس کی ایک پارٹی جس میں کسٹمز کا بھی ایک افسر شامل تھا محمد شریف کے مکان پر گئی، جہاں پتہ چلا کہ وہ چند دن قبل بلوچستان چلا گیا ہے۔ محلے کے دوسرے افراد سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس جین طر کے اس بیان کی تصدیق ہو گئی کہ وہ دو مرتبہ اس علاقے میں آچکی ہے اور محمد شریف کے مکان میں بیٹھ کر اس سے بات چیت بھی کر چکی ہے۔ محلے والوں نے بتایا کہ چونکہ شریف پٹھان تھا ہے اور انگریزی میں بات چیت کر سکتا ہے اس وجہ سے مزرہ اس سے گفتگو کرتی رہی لیکن وہ لوگ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان دونوں کی بات چیت کی نوعیت کیا تھی کیونکہ وہ انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے۔ شریف کے گھر والوں سے ان کے آبائی گاؤں کا پتہ لیا گیا ہے اور دائرہ میں کے ذریعے بلوچستان کسٹمز کو شریف سے رابطہ قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم ابھی تک اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر جین طر کے بیان کے اس حصے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس نے فی الواقع شریف کے ساتھ مل کر اسمگلر فل کے گروہ کو مع مال کے پکڑوانے کا منصوبہ بنایا تھا جو ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ تو صورت حال بدل جائے گی اور اس امر کی حیثیت بھی مذموم کے

جیسے ایک اہم سلطان لاکھ ہو جائے گی اور حکام کو اس نام لاکھ کی گرفتاری کے لیے لاکھ لاکھوں کروڑوں کی بجائیے پاکستان میں اس شخص کے کام میں مصروف ہیں۔ حکومت کی دیکھنی ہے کہ وہ کس طرح سے حکومت کو روکے گا۔ خائف ہو اور کسی مصیبت میں گرفتار نہ جانے کے خوف سے کہیں غائب ہو گیا ہے۔ حال جب تک حکام کو اس مسئلے میں یقین نہ ہو کہ اس شخص کی شناخت حاصل نہیں ہو سکتی ہے جین طر کی حیثیت ایک ایسی مزرہ کی ہے کہ جسے کوئی ایئر پورٹ پر سیال میں کے اسمگلر کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہو۔ مزرہ کے خلاف کسی بھی صورت میں مجازت میں ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔ کسٹمز کے اعلیٰ حکام کا خیال ہے کہ اس شخص کے غیر ملکی ہونے اور ایک تعلیم یافتہ خاتون ہونے کی وجہ سے قانون میں حد تک بھی رعایت کی اجازت دینا سزا سے دی جانا چاہیے اور تفتیشی حکام کو اس کے بیان کی صداقت چکھنے کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح ممکن ہے کہ کسٹمز حکام جا لگ بھروسوں کے خلاف گروہ کا کام سنبھال کر اس میں کامیابی حاصل کریں اور ایک ایسی خاتون خاتون کو تباہ ہونے سے بچائیں جسے ملک کے قیام کے لیے ایسے ہی جرم میں قوت پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ کسٹمز کے اعلیٰ حکام کی یہ بھی ہدایت ہے کہ جین طر کو کسٹمز کی حراست میں رکھنے کے لیے متعلقہ عدالت سے جہاں میکانڈ حاصل کرنا چاہیے اور زیادہ کی مدت کے دوران ہی اس کے بیان کے ہر پہلو کی بھی طرح جانچ پڑتال کرنا چاہیے۔ پاکستان میں ہائیڈ کے سفارت خانے کو بھی مزرہ کے بارے میں مطلع کر کے اس کے بیان کو روک کر اعلیٰ کی تصدیق بھی حاصل کرنا چاہیے۔

انسپیکٹر

